ادب لطیف

مارچ ۴۹ء

مکتبہ اردو لاہور

جلد ۲۷ شمارہ ۶

مارچ ۱۹۴۹ء

ادبِ لطیف

مدیران:-

چودھری برکت علی

میرزا ادیب

قتیل شفائی

زرِ سالانہ آٹھ روپے

فی پرچہ بارہ آنہ

ترتیب

...لطیف لاہور سے شائع کیا۔

تفکر کا رنگین تنوع ——
—— اسلوب کی منفرد لطافت
انسانی فطرت کے امٹ ہیولوں کا رقص مسلسل
• وہ رقص •
جو ہمیں متحیر کرتا ہے —— جو ہمیں مسحور کرتا ہے
اور جس کے رنگا رنگ رُوپ

ہیولے

میں پیش کئے گئے ہیں
فکر تونسوی کی نظموں کا مجموعہ ——!

هنس راج رهبر
سیاست اور ادب کا ایک نیا سنگم بناتا ہے!
اور اپنے ——
تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ

نیا افق

پیش کرتا ہے

رهبر اپنے افسانوں میں تخیلی سانچے نہیں بناتا۔ بلکہ احساس اور حقیقت سے جیتی جاگتی تصویریں بناتا ہے۔ اس کا فن اور اسلوب سماج کی تلخ ترسچائیوں کا آئینہ دار ہے۔ وہ عوامی دکھوں عوامی خوشیوں اور عوامی دھنوں میں اُتر جانے والا فن کار ہے

جب کونپلیں پھوٹتی ہیں۔
مست گھٹائیں اُمڈتی ہیں۔
رنگین فضا گنگناتی ہے —— اور
گاؤں کی الھڑ جوانیاں جھولے جھولنے لگتی ہیں۔ گیت گانے لگتی ہیں۔
گیت —— جو قتیل شفائی —— نے لکھے ہیں۔
گیت جو —— **ھریالی** میں پیش کئے گئے ہیں
ان گیتوں میں رومان بھی ہے اور حسرت بھی آنسو بھی ہیں۔
اور تبسم بھی رقص بھی ہے اور رنگ بھی۔

۱۹۴۶ء کی

بہترین نظمیں

—— ان نظموں کے انتخاب میں ——
وقتِ نظر اور دُور رسی سے کام لیا گیا ہے۔
نظمِ اردو کے جدید تر رجحانات
جدید شعرا کے نقطۂ نظر کی ترجمانی
•
۳۲ نوجوان فن کاروں کے یہ شہ پارے
اردو شاعری میں سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔
ان کے مطالعہ سے آپ اردو نظم کی رفتار کا
صحیح جائزہ لے سکتے ہیں

حرفِ اوّل

رات تاریک ہے جدھر دیکھیں اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کائنات تاریکی کے اِس بیکراں اور ناپیدا کنار سمندر سے باہر کبھی باہر نہیں نکل سکے گی۔ اور آئیندہ صدیوں تک۔ بلکہ کائنات کے خلتے تک روشنی کی ایک ہلکی سی کرن بھی کسی بعیدی افق سے نہیں پھوٹ سکے گی۔ اس سرد اور کثیف اندھیرے میں ایک مسافر جو سالہا سال سے انتہائی مستقل مزاجی اور عالی حوصلگی کے ساتھ بے شمار دشوار گذار منزلیں طے کرتا رہا ہے۔ اور جس کے قدم آج تک کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ اب ایک ایسی منزل پر پہنچ چکا ہے جو سب سے زیادہ کٹھن اور سب سے زیادہ صعوبت زا ہے مسافر کے قدم طویل مسافت طے کرنے کے بعد لہولہان ہو چکے ہیں۔ چہرے پر گرد و غبار کی کئی موٹی تہیں جم چکی ہیں ۔ اور سردی کی شدت سے جسم کا ہر عضو منجمد ہوا جا رہا ہے ——— یہ تو اُس کے جسم کا حال ہے مگر اس کا ماحول اِن جسمانی تکلیفوں سے ہزار گنا زیادہ اذیت ناک ہے جب وہ اپنے ارد گرد نظر ڈالتا ہے تو اسے انسانوں کی اعضا بریدہ اور خونچکاں لاشوں، نفرت و حقارت کے ہر لحظہ بھڑکتے ہوئے آتشیں شعلوں اور ظلم و تشدد کے پنجے میں جکڑی ہوئی، دم توڑتی ہوئی انسانیت کے سوا اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ مسافر کا جسم تھک کر چُور چُور ہو چکا ہے اس کے پاؤں میں قدم اُٹھانے کی قطعاً ہمت نہیں ہے اور یاس انگیز مناظر نے اُس کی سُلگتی ہوئی آرزوؤں پر برف کی تہ جمادی ہے مگر اس کے باوجود اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں کی گہرائیوں میں عزم و حوصلہ کا شعلہ روشن ہے اُس کی پیشانی استقامتِ طبع کی روشنی سے تاباں ہے۔ اور اس کی نگاہیں تاریکی کے بھیانک جسم دوش کو چیرتی ہوئی مشرقی آسمان کے اُس گوشے کو دیکھ رہی ہے۔ جہاں وقت کے ہاتھ صبحِ نو کا چراغ لئے آہستہ آہستہ اُبھر رہے ہیں۔ مسافر کے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں ایک مشعل روشن ہے جسے تیز سے تیز اور تند سے تند ہوا کے تھپیڑے بھی نہیں بجھا سکتے۔ ہوا کے طوفانی جھونکے جب بھی اس مشعل کی تابناک لَو پر حملہ کرتے ہیں۔ اس کی روشنی پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ کیونکہ یہ مشعل صرف ایک مادی وجود ہی نہیں بلکہ مسافر کے حیات آفریں نفسِ گرم کا ناقابلِ شکست تسلسل بھی ہے۔ جو ہر وقت تھپیڑوں کی زد میں رہنے کے باوجود زندہ سوزندہ اور تابندہ رہے گا۔ ماحول بے حد تاریک، مایوس کُن اور نفرت انگیز ہے مگر مسافر کے ذہن میں یہ عقیدہ پوری طرح جم چکا ہے۔ کہ اُس کی مشعل کی محدود روشنی ایک دن ضرور بڑھ کر، چاروں طرف پھیل کر سارے اندھیرے کو نگل جائے گی —— ایک دن ضرور سرنگندہ انسانیت لاشوں کے ڈھیرے مسکرا کر اُٹھ بیٹھے گی ایک دن ضرور ظلم اور تشدد کا پنجہ ٹوٹ جائے گا۔ اور ایک دن ضرور سچی محبت اور انسانیت دوستی کا ہمہ گیر، گہرا اور شدید احساس نفرت و حقارت کی آگ کو ختم کر دے گا۔ اُسے معلوم ہے کہ اگرچہ اندھیرے کے عفریت نے ہر طرف قبضہ جما رکھا ہے۔ مگر وہ وقت بھی ضرور آئے گا جب اُفق سے نئی صبح کی پہلی کرن پھوٹ کر ظلمت کے سینے کو چیر ڈالے گی۔ اس کا یہ تابناک یقین اُسے برابر آگے بڑھنے پر اُکسا رہا ہے۔ اور وہ —— وہ نحیف و نزار مسافر راستے کی ہزار صد ہزار صعوبتوں کا خیال کئے بغیر سینے میں چٹان کی طرح مضبوط ارادہ لئے انسانیت نوازی کی مشعل کو مضبوط ہاتھوں میں تھامے چلا جا [redacted] تا رہے گا۔ یہ مسافر سچا فنکار ہے حقیقی مصنّف اور شاعر ہے۔ جو ہر زمانے میں انسانیت کا سچا علمبردار رہا ہے

جلد ۲۶، ۲۷ زرِ سالانہ
شمارہ ۶، ۱، ۲ آٹھ روپے

ترتیب

مقالات

نظمیں، غزلیں، گیت

تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور میں چوہدری برکت علی پرنٹر، پبلشر نے چھپوا کر دفتر رسالہ ادبِ لطیف لاہور سے شائع کیا۔

افسانے اور خاکے

اختتامیہ

ادارہ

اشارات

آخر انسانیت کی لاش کو فرقہ پرستی کے گدھ کب تک نوچتے رہیں گے' اس لاش کی سڑاند سے ہمارا دم کب تک گھٹتا رہے گا۔ اور ان گدھوں کا یہ کریہہ عمل کس گھڑی تک جاری رہے گا۔ کیا ہماری آزادی کا یہی مفہوم ہے۔ کیا اسی کو آزادی کہتے ہیں۔

ہماری بورژوا لیڈرشپ اِس سلسلہ میں خاموش ہے۔ وہ اِن سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہے' ہاں البتہ وقت کے شوالے میں فتح کا سہانا گجر بج رہا ہے۔ جو اپنی خوش آئند نغمگی کے پردہ میں ہمیں بتا رہا ہے کہ ان گدھوں کا نفرت انگیز عمل عنقریب ختم ہونے والا ہے۔ یہ جلد ہی موت کی نیند سو جائیں گے۔ انسانیت اِس سرزمین پر دوبارہ جنم لے گی اور ان فضاؤں کا تعفن آن کی آن میں دلفریب تعطر میں تبدیل ہو جائے گا۔ آج کی آزادی کو آزادی سمجھنا لفظِ آزادی کی تضحیک کے مترادف ضرور ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اِس مضحکہ خیز آزادی کے دن تھوڑے ہیں اور وہ گھڑی دور نہیں جب ہمارے عوام ہر طرح کے جبر و استبداد سے نجات پا کر ایک قطعی غیر پابند عالمِ رنگ و نور میں سانس لینے لگیں گے۔

اور دیکھئے ہوئے کس قدر صحت کے حامل میں کتنی سچائی ہے اِن میں حال تاریک ہی اسکے تاریک تر ہونے کے امکانات سہی لیکن مستقبل کی درخشندگی مسلم ہے' کیا ہمارا اپنی طاقت پر سے اعتماد اُٹھ گیا ہے کیا ہم سوسال تک اجنبی سامراج سے دست و گریباں نہیں رہے کیا ہم نے بالآخر اپنی طویل جد و جہد سے غیرملکی شہنشاہیت کے دامن کو تار تار کر کے نہیں رکھ دیا۔ اور اگر یہ سچ ہے تو پھر آج قنوطیت اور یاسیت کے لئے ہمارے پاس کونسی وجہ جواز موجود ہے کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ اگر آج ہماری آزادی محض ایک مسخر کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے تو اس کا سبب ہمارے بعض اپنے احباب ہی ہیں' اور اپنوں کو راہِ راست پر لے آنا بیگانوں کی نسبت زیادہ آسان اور سہل ہوا کرتا ہے۔ اگرچہ اس کے لئے بھی پیہم عمل مسلسل تگ و دو اور استقامت حوصلہ کی ضرورت ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ ہمارے دونوں نو آبادیات کے ترقی پسند مصنفین ہمیشہ کی طرح آج بھی اِس کشمکش اور حقیقی جنگِ آزادی میں جنتا کی صحیح رہنمائی کرینگے اور۔ اس کے بیشتر سیاسی پیشواؤں کی طرح اپنے فرائض کو پورا کرنے میں کوتاہی نہیں برتیں گے۔

اگر آج ہمارے مصنفین کا کام ایک طرف آسان ہو گیا ہے تو دوسری طرف اس میں بعض دشواریاں بھی حائل ہو گئی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عوام کے ساتھ ادیبوں کے تعاون کو ذی اقتدار طبقہ شکوک و شبہات کی نظروں سے دیکھنے لگے (اور اب تو اس کے آثار بھی دکھائی دینے لگے ہیں) اور اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر انہیں غدار اور ففتھ کالمسٹ قرار دیکر ہراساں کرنا چاہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ انہیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچانے سے بھی گریز نہ کرے۔ ہمارے ادیبوں کو ایسے موقعوں کے لئے اپنے آپ کو ابھی سے تیار کر لینا ہو گا۔ تاکہ وہ امن' انصاف' انسانیت' مفادِ عامہ اور حقیقی جمہوریت کے دشمنوں کے مقابلہ پر پوری مضبوطی سے ڈٹ سکیں۔

اس پوری جد و جہد کے دوران میں ہمیں ایک بات قطعاً نہیں بھولنا ہو گی۔ کہ ہمارا مقصد معراجِ آدمیت کا حصول ہے انارکی یا بزاجیت نہیں۔ لہٰذا ہر دو ملکوں کے ادیبوں کو اپنی اپنی حکومت کو یہ یقین دلانا چاہئے کہ وہ ریاست کے وفادار شہری ہونے کی حیثیت

ہے اس کے پرمقصد، حسن اور ترقی پسند کام میں پورا پورا تعاون کریں گے!

سالنامہ حاضر ہے؛ ہمیں افسوس ہے کہ کاغذ کی نایابی کے باعث پرچے کی اشاعت میں قدرے تاخیر واقع ہوگئی۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ مضامینِ نظم ونثر کی بلند معیاری ہماری اس کوتاہی" کا ضرور ازالہ کردے گی۔ سالنامہ مرتب کرتے وقت یہ بات سب سے زیادہ ہمارے پیشِ نظر رہی ہے کہ ادبِ لطیف کی گذشتہ عظیم روایات کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ ہم اپنی اس کوشش میں ناکام نہیں رہے۔ ویسے اس سلسلہ میں آخری فیصلہ ہمارے قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ وہ اپنے تاثرات سے ادارہ کو ضرور آگاہ فرمائیں گے —— یہ تاثرات ہمارے لئے مشعلِ راہ کا کام دیں گے!

ہم سالنامہ میں ایک دو مقالے ایسے بھی شائع کر رہے ہیں جن سے ہمیں نظریاتی طور پر اختلاف ہے۔ ہم اپنے ساتھیوں کو ان پر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں؛ ادبِ لطیف کے صفحات ان کے احتسابات کو سمیٹنے کے لئے ہمیشہ تیار رہیں گے!

۲۶، ۲۷، ۲۸ مارچ کو لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے اردو کانفرنس منعقد کی گئی جس کی صدارت مولوی عبدالحق نے فرمائی اور افتتاح سرعبدالقادر نے کیا، کانفرنس کی مختلف نشستوں میں بہت سے مقالات پڑھے گئے اور کئی قراردادیں پاس کی گئیں؛ آخری نشست میں ایک پبلک مشاعرہ منعقد کیا گیا، پبلشرز یونائیٹڈ کی طرف سے کانفرنس میں شریک ہونے والے مندوبین کو ایک عصرانہ بھی دیا گیا۔

اگرچہ یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد نے کانفرنس کو یقین دلایا ہے کہ اردو پر سے بہت سی پابندیاں اٹھا دی جائیں گی تاہم ہمیں اسی پر قناعت نہیں کرلینا ہوگی؛ ہماری یونیورسٹی، ہماری حکومت، ہمارے ناشرین اور ہمارے ادیبوں کو اُردو کی ترقی اور نشوونما کے لئے عملی طور پر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

قارئین کو یہ خبر مسکر بے حد مسرت ہوگی۔ کہ فریقین کی باہمی رضامندی اور مفاہمت سے اردو کے عظیم الشان اشاعتی ادارہ **مکتبہ اُردو** کے دیرینہ تعطل کو ختم کر دیا ہے۔ اور عنقریب ثالثی فیصلہ کے مطابق کتابوں اور مسودوں کی تقسیم عمل میں لائی جائے گی۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس تقسیم کے فوراً بعد ہم اپنے اشاعتی پروگرام کو نہایت سرعت سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مصروف ہو جائیں گے۔ ہم اپنے ان تمام فن کاروں سے قلبی طور پر معذرت چاہتے ہیں جنہیں ادارہ کے طویل ڈیڈ لاک کی وجہ سے کسی طرح کا نقصان اُٹھانا پڑا؛

رپورٹ

قارئین سالنامہ کو مارچ، اپریل، اور مئی کا مشترکہ شمارہ تصور فرمائیں۔

مقالات

عبادت بریلوی
حسن عسکری
وقار عظیم
انتظار حسین
مختار صدیقی
طفیل احمد
سجاد ظہیر
ممتاز شیریں
فکر تونسوی

ہمارے ساتھی

حسن عسکری: معرفت کو مجسم کر دیجئے۔ فرنچ سکالر حسن عسکری کی شخصیت کے تار و پود مرتب ہو جائیں گے۔ وہ اپنی زندگی کے بیشتر لمحات تنہائی میں لکھنے پڑھنے اور غور کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ ہفتوں راہ دیکھنے کے باوجود آپ کی آرزوئے ملاقات پوری ہونے کے امکانات بہت کم ہیں اور اگر ایک طویل مدت کے بعد وہ آپ کو بال سنوارے شروانی پہنے اور چشمہ لگائے کسی لائبریری یا بک سٹال پر اتفاقاً مل بھی جائیں اور آپ اشتیاق بھرے انداز میں ان سے کہیں کہ اتنا عرصہ انہوں نے ملاقات کا شرف کیوں نہ بخشا تو خواہ آپ کتنے ہی دل شکستہ کیوں نہ ہوں وہ اپنی صاف گوئی کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ کہہ ہی دیں گے: "اجی صاحب اتنی فرصت کہاں!" اور اگر آپ کسی روز خوش نصیبی سے انہیں اپنے ساتھ قہوہ خانہ تک لے جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو وہ آپ کے سامنے کرسی پر خاموش بیٹھے رہیں گے۔ جیسے کچھ سوچ رہے ہوں یا کسی اہم موضوع پر طبع آزمائی کرنے میں مصروف ہوں اور اگر ایسے لمحوں میں آپ کے دل کے کسی گوشے سے یہ سوال ابھر آئے کہ محترم کچھ ارشاد کیوں نہیں فرماتے تو آپ یوں محسوس کریں گے جیسے ان کا ہر بن مو کہہ رہا ہے "اجی صاحب اتنی فرصت کہاں!" اور آپ کا دم گھٹنے لگے گا مگر کیونکہ عسکری بہت ذہین اور معاملہ فہم واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ آپ کی بے بسی کو پل بھر میں بھانپ لیں گے اور فوراً اٹھتے ہوئے کہیں گے: "اچھا صاحب اب اجازت دیجئے، مجھے اپنے ایک شاگرد کو فرنچ پڑھانے جانا ہے۔ پھر ملاقات ہو گی!"

شروع شروع میں اپنے منفرد رنگ میں افسانے لکھا کرتے تھے مگر آج کل مقالوں پر محنت صرف کرتے ہیں۔ ادب میں خارجیت کی نسبت داخلیت کے زیادہ قائل ہیں۔ قومیت کے مذہبی تصور پر فریفتہ ہیں اور اپنی قوم پرستی کے جوش میں انسانیت پرست ادیبوں کے خلاف جہاد کرنا اپنا فرضِ منصبی خیال کرتے ہیں۔

کئی سالوں تک "ساقی" کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ آج کل لاہور ریڈیو سٹیشن سے تقریریں نشر کرتے ہیں۔ ریڈیو ڈیپارٹمنٹ کے "چیک سسٹم" کے تحت شاکی ہیں۔ کیونکہ انہیں چیکوں کو آئے دن کیش کروانے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے!

ممتاز شیریں: گذشتہ سال "تکنیک کا تنوع" کی اشاعت سے تنقیدی ادب کے پرسکون تالاب میں ایک ہیجان، ایک ارتعاش، ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا۔ جیسے کسی نے اس میں بہت بڑا پتھر پھینک دیا ہو۔ متجسس نگاہیں اٹھیں تو جسارت کرنے والی ہستی کو دیکھ کر حیرت میں ڈوب گئیں۔ تئیس چوبیس سال کی ایک نوجوان لڑکی مدبرانہ انداز میں کھڑی مسکرا رہی تھی یعنی ممتاز شیریں ——— صمد شاہین کی اہلیہ محترمہ اور "نیا دور" کی ذہین مدیر! ممتاز شیریں کے مقالے پڑھنے سے ان کے مطالعہ کی پھیلتی ہوئی وسعت، تنقیدی شعور کی بڑھتی ہوئی پختگی اور اظہار کی نکھرتی ہوئی بے ساختگی اور روانی کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہی احساس قاری کے ذہن میں اس خیال کو جنم دیتا ہے کہ مستقبل قریب میں اردو ادب کو ممتاز شیریں کے روپ میں ایک قابلِ قدر نقاد ملنے والا ہے!

مقالوں کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کا بھی شغف رکھتی ہیں۔ اگرچہ ان کی کہانیوں میں عام طور پر مشاہدہ کی محدودیت اور کرداروں و ماحول کی یکسانی پائی جاتی ہے۔ تاہم صحت مندی، طہارت اور رجائیت کے عناصر نے ان میں خاصی اپیل پیدا کر رکھی ہے!

اپنے شوہر کے ہمراہ بنگلور سے انتقال کر کے کراچی میں مستقل طور پر مقیم ہو چکی ہیں۔ اور آج کل وہیں سے "نیا دور" کا فسادات نمبر نکالنے میں مصروف ہیں۔

عبادت بریلوی

تنقیدی جھلکیاں

"تنقیدی جھلکیاں" کا سلسلہ میں نے بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ شروع کیا تھا۔ اور خیال تھا کہ اب یہ کبھی بھی ختم نہ ہوگا۔ لیکن فسادات نے جہاں اور بہت سے ارمانوں، آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کر دیا۔ وہاں ایک خون یہ بھی ہوا فسادات میں میری جان تو بچ گئی لیکن ذہن پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ ہوش و حواس تک جاتے رہے۔ ان حالات میں لکھنے پڑھنے کا سوال ہی کیا تھا۔ اب کچھ ٹھیک ہو گیا ہوں۔ اور یہ سلسلہ پھر شروع کر رہا ہوں۔ میری کوشش ہوگی کہ یہ ہمیشہ جاری رہے۔ — عبادت

آخر کار وہی ہوا جس کا اندیشہ میں نے اس طوفان کی آمد سے بہت پہلے ظاہر کیا تھا۔ گذشتہ جولائی میں لکھتے ہوئے میں نے یہ بات کہی تھی کہ جنت نشان کی تقسیم کو تسلیم کر لینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خونریزی جس کا سلسلہ کئی مہینے سے جاری ہے کسی طرح ختم ہو جائے۔ میں نے اس وقت اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا کہ اب اس خونریزی کو ختم ہونا ہی چاہیئے۔ اگر اب بھی اس کا سلسلہ ختم نہ ہوا تو خون کی وہ آندھیاں اٹھیں گی، اور خون کے وہ سیلاب موجزن ہوں گے، جن کے سامنے دنیا جہان کی خونریزیاں شرما جائیں گی چنانچہ یہی ہوا۔ ہماری آنکھوں نے خون کے اٹھتے ہوئے سیلابوں کو دیکھا۔ ہمیں آبادیاں بن ہوتی ہوئی نظر آئیں۔ جاگتی جگمگاتی بستیوں کو خاک سیاہ کر دیا گیا۔ ماؤں اور بہنوں کی آبروریزی اس طرح کی گئی کہ انسانیت شرما گئی، اور راس نے ایسا شور بلند کیا کہ تہذیب نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ بہیمیت کا دیوتا کئی مہینے تک اس پاک سرزمین پر رقص کرتا رہا۔ ہزارہا خاندان خانماں برباد ہو گئے۔ لاکھوں انسانوں کو جان بچانے کے لئے صدیوں کے بنائے ہوئے گھروں کو چھوڑنا پڑا۔ ادھر سے ادھر ہزاروں قافلوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ اور وہ آگ اور خون سے دوچار ہوتے ہوئے ان اجنبی سرزمینوں میں پہنچے جہاں ان کے لئے کس مپرسی اور زبوں حالی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ تاریخ حیران تھی، اس کی آنکھوں نے کبھی یہ مناظر نہیں دیکھے تھے۔ سلطنتوں کا مٹ جانا، شاہان وقت کی تبدیلی جنگوں کی خون آشام حملے، قتل عام یہ عام مناظر اس کی نظر میں تھے، لیکن آبادیوں کے تبادلے کا کہیں دور تک بھی اس کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ اس نے خواب و خیال میں بھی ان مناظر کی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اس پر کڑھتی رہی آج بھی کڑھ رہی ہے۔ اور رہتی دنیا تک کڑھتی رہے گی۔

یہ عجیب و غریب ہنگامہ تھا، جس کی کوئی غرض و غایت نہیں تھی۔ کوئی مقصد نہیں تھا۔ چنگیز و ہلاکو نے کسی مقصد سے خاک و خون کے طوفان اٹھائے تھے۔ نادر و ابدالی نے کسی غرض سے اپنی شمشیروں کو بے نیام کیا تھا۔ وہ کم از کم مال و دولت کو جمع کرنے کے خواہاں تو تھے۔ ان کا مقصد کم از کم اپنے خزانوں کو بھرنا تو تھا۔ لیکن اس سرزمین مقدس پر جو خون بہایا گیا۔ اس کی تہ میں کسی مقصد کسی غرض اور کسی غایت کی جھلک تک نظر نہیں آتی، اس کی بنیاد صرف نفرت اور انتقام پر نظر آتی ہے۔ اس کی تہ میں سوائے ان دو چیزوں کے اور کچھ بھی نہیں نفرت اور انتقام ہی نے اس طوفان کو اٹھایا۔ اور نفرت اور انتقام ہی اس کا مقصد تھا جس نے چنگیز و ہلاکو اور نادر و ابدالی کی خونریزیوں کو شرمندہ کر دیا۔ چنگیز و ہلاکو اور نادر و ابدالی کی تلواریں کسی مخصوص جگہ پر ایک محدود وقت تک چمکتی تھیں، اور ان کے پیش نظر کسی مذہب و ملت کی تخصیص نہیں ہوتی تھی۔ ان کے غیض و غضب کی بجلیاں ہر ایک کے خرمن حیات پر گرتی تھیں۔ لیکن اس طوفان کی گھن گرج کئی مہینے تک سنائی

دیتی رہی۔ مذہب جو آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا اس کے غلط تصور نے بھولے بھالے معصوم انسانوں کا خون بہایا۔ عورتیں اور بچے تک اس کی زد سے نہ بچ سکے۔ عزت و آبرو، اخلاق و محبت اور مال و دولت کا خون بھی اس میں شامل تھا۔ یہ ان دونوں کا ایک ایسا سنگم ہے جس کی مثال دنیا پیش نہیں کر سکتی اور یہ سب کچھ کسی ایک مخصوص مقام پر نہیں ہوا۔ ہزاروں میل پھیلی ہوئی سرزمین کے ایک ایک چپے میں یہ واقعات رونما ہوئے۔ اس کے ایک ایک ذرہ نے ان مناظر کو دیکھا۔ آج وہ سرزمین ان زخموں سے جو اب ناسور بن چکے ہیں سینکڑوں داغ اپنے دل میں لئے ہوئے اپنی کس مپرسی اور زبوں حالی پر ماتم کر رہی ہے، آنسو بہا رہی ہے، خون رو رہی ہے۔ اس کا پوچھنے والا کوئی نہیں۔

اس تباہی کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ ایک ساحر نے ایک کھیل کھیلا تھا، ہم سب اس کی زد میں آ گئے۔ ایک جال بچھایا تھا، ہم سب اس میں پھنس گئے۔ تقسیم، تقسیم کی تقسیم، ریڈکلف اوارڈ، باؤنڈری فورس، ملازموں کے تبادلے، یہ سب ایک ساحر کی شعبدہ بازیاں نہیں تھیں تو اور کیا تھا۔ ہمارے رہنما ان سب کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔ انہوں نے "مزاج یار" کے سامنے "سرِ تسلیم" خم کر دیا۔ اور "مزاج یار" میں جو کچھ بھی آیا وہ کرتا رہا۔ فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکانے کے لئے حالات پیدا کئے گئے۔ وہ آگ بھڑکی اور اس طرح بھڑکی کہ اس نے سب کچھ خس و خاشاک کی طرح جلا ڈالا۔ جن لوگوں کو اس آگ کے بجھانے کے لئے بلایا گیا تھا انہوں نے اب "حق نمک" دوسری طرح ادا کیا۔ اب وہ ایک نئے روپ میں سامنے آئے۔ کل تک جو کھلم کھلا کسی کے در پر ناصیہ فرسائی کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ اب یکایک مختلف مذہبات کے سب سے بڑے علمبردار ہو گئے۔ ساحر نے ان سے کہہ دیا تھا۔ انہیں مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دھرم کی رکھشا نہیں کر رہے تھے۔ ان کا مقصد "حق نمک" ادا کرنا تھا۔ جب لاہور میں آگ بھڑک رہی تھی، جب امرتسر، جالندھر اور لدھیانے میں گولیاں برس رہی تھیں، جب دلی پر خون کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اس وقت ساحر کسی پہاڑ کی اونچی چوٹی پر قہقہے لگانے میں مصروف تھا۔ جو سیلاب اس کو بہا لے جانے والا تھا، جو آندھی خود اس کی بنیادوں کو اکھاڑ کر رکھ دینے والی تھی۔ اس نے ان کو اپنے سحر سے ٹکرا دیا تھا۔ ساحر، اس کے مہرے اور ان کی "سحر کاریاں" کا مطلب آپ سمجھ گئے ہوں گے، وضاحت کی ضرورت نہیں۔ مستقبل کا مورخ جب ان تمام چیزوں کو بے نقاب کرے گا، تو آئندہ نسلیں اس کو پڑھ کر کانپ اٹھیں گی۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو جایا کریں گے۔ اور سالہا سال ان کی آنکھوں سے خون بہتا رہے گا۔

یہ مستقبل کا صحیح مورخ ادیب ہوگا —— ادیب جس نے اس طوفان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جس کی بنیادیں اس طوفان نے ہلا کر رکھ دی ہیں جس نے اس کو انتشار و پریشانی کے سمندر میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے۔ خصوصاً اردو کا ادیب، جس کی ہستی اس طوفان سے براہ راست متاثر ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ طوفان وطن عزیز کے اس ایک بہت بڑے حصے میں برپا ہوا جو اردو کے ادیبوں کا جنم بھوم تھا۔ ان ادیبوں میں مسلمان، ہندو اور سکھ سب ہی شامل تھے۔ سب بے خانماں ہوئے۔ سب لٹے۔ سب کی جانیں خطرے سے دوچار ہوئیں۔ لیکن ان میں سے ایک کے قدم بھی متزلزل نہیں ہوئے۔ وہ ہمیشہ آزادی کے گیت گاتے رہے۔ بنی نوع انسان کی بہتری ہمیشہ سے ان کے پیش نظر رہی تھی۔ وہ ظالم کے دشمن تھے اور مظلوم کے ہمدرد۔ آج بھی انہوں نے اپنے مسلک کو نہیں چھوڑا ہے۔ آج بھی وہ اس طوفان کے متعلق صحیح نقطۂ نظر کو پیش کر رہے ہیں۔ آج بھی بغض و عناد، اور نفرت و انتقام سے وہ کوسوں دور ہیں۔ آج بھی وہ محبت کے گیت گا رہے ہیں۔ آج بھی مل جل کر رہنے کا پیغام دے رہے ہیں۔ آج بھی رجعت پسندی کو خیرباد کہہ دینا ان کے پیش نظر ہے۔ انہوں نے اجتماعی اور انفرادی طور پر اس کا اعلان کیا ہے۔ یہی ادیب اس طوفان کی صحیح تاریخ لکھیں گے۔ ان کے خیالات

کی روشنی میں اس کے سارے خدوخال کا پتہ چلے گا۔ کیونکہ یہ پہلے مسلمان، ہندو اور سکھ نہیں ہیں، بلکہ انسان ہیں۔ اور ان کی انسانیت نے انہیں اس منزل پر پہنچا دیا ہے، جہاں سے انہیں ہر مذہب وملت کے لوگ برابر نظر آ رہے ہیں۔ ان کے یہاں رنگ، نسل، مذہب اور ملت کی کوئی تفریق نہیں۔ ان کی انسانیت نے انہیں ان تمام چیزوں سے بہت بلند کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ہی لوگوں کو صحیح مورخ کہا جا سکتا ہے۔ ان سے زیادہ بہتر طریقے پر کوئی اور اس کام کو سرانجام نہیں کر سکتا۔

میں نے ادیبوں کے لئے مستقبل کے مورخ کے الفاظ اس وجہ سے استعمال کئے کہ حال کے واقعات نے ان کے اذہان پر کچھ ایسا اثر کیا ہے جس کی وجہ سے وہ مبہوت ہو گئے ہیں۔ جو کچھ بہیمیت نے کیا وہ ان کے تصور میں بھی نہیں تھا۔ جو واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں، ان کے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے، اس لئے فی الحال وقتی طور پر ان کے یہاں جمود کی کیفیت نظر آتی ہے۔ کیونکہ تاثر کی شدت نے انہیں محصور کر لیا ہے۔ اور وہ یکایک کچھ کہنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ پھر ایک بات اور بھی ہے، وہ یہ کہ وہ براہِ راست ان ہنگاموں کا شکار ہوئے ہیں۔ جو زخم ان کے جسم اور روح پر لگا ہے، وہ ابھی تازہ ہے۔ اور اس کی تکلیف اس قدر شدید ہے کہ وہ کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔ انہیں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی فکر ہے۔ حالات نے انہیں اس جگہ پہنچا دیا ہے۔ جہاں پر وہ پریشاں حال، بے یار و مددگار کھڑے ہیں۔ ان کی زندگی کا یہ دور کسی ایسے ریگستان میں سے ہو کر گزر رہا ہے، جہاں میلوں اور کوسوں تک تپتی ہوئی ریت کے سوا اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ان کو ذہنی سکون ذرا بھی میسر نہیں۔ ان کی مادی ضروریات نے ان کی راہوں میں پہاڑ کھڑے کر دئے ہیں، اور ان کے پورا ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ حکومتوں نے ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ ان کے ناشر خود اپنی الجھنوں میں گرفتار ہیں۔ نفسی نفسی کا عالم ہے۔ ظاہر ہے ان حالات میں ادیبوں کا قلم کیسے اٹھ سکتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے یہ حالات بدلیں گے، اور کوئی ادیب اپنا کام کرنے میں کسی طرح پیچھے نہیں رہے گا۔

کہنے والے کہیں گے کہ ان ہنگاموں کو کئی مہینے ہو چکے لیکن ابھی تک ان کے متعلق اردو کے ادیبوں نے کوئی خاص قابل ذکر چیز پیش نہیں کی۔ لیکن یہ بات کہنے سے قبل انہیں چند چیزیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ احساس اور تاثر کی شدت ادیب کو فوراً کچھ کہنے سے باز رکھتی ہے۔ جس قدر گہرا اور شدید تاثر ہوتا ہے، اسی قدر اس کو پیش کرنے میں ادیب تاخیر سے کام لیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ تاثر بھونچال کی طرح اس کے ذہن میں ایک ہنگامہ برپا کر دیتا ہے۔ اور تاثر کی یہ شدت اسے فوراً کوئی تخلیقی کارنامہ پیش کرنے سے باز رکھتی ہے۔ مہینوں اس تاثر کی شدت میں اس کے افکار و خیالات پکتے رہتے ہیں۔ اس عرصے میں اسے اتنا سکون بھی نصیب ہو جاتا ہے کہ وہ تخلیق کا کام کر سکے۔ چنانچہ پھر وہ تخلیق کرتا ہے۔ بہت سے نقاد اس خیال پر متفق ہیں۔ اردو کے ادیبوں کی بھی اس وقت یہی حالت ہے۔ ہنگاموں سے پیدا شدہ تاثر کی شدت میں ان کے افکار و خیالات پک رہے ہیں۔ ان میں سے بعضوں نے تخلیق کا کام شروع بھی کر دیا ہے اور چند نمونے ہمارے سامنے آئے بھی ہیں۔ جیسا کہ اوپر بھی اشارہ کیا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ادیب خود ان فسادات کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جل چکے ہیں۔ ان میں سے زیادہ کے گھر لٹ گئے انہیں اپنے محبوب مقامات کو خیرباد کہنا پڑا۔ ان کی آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے۔ حالات نے انہیں پناہ گزین بننے کے لئے مجبور کر دیا۔ وہ خود اجنبی دیس میں پہنچے جہاں بے بسی، کس مپرسی اور زبوں حالی کے سوا ان کے استقبال کے لئے اور کوئی موجود نہیں تھا۔ ظاہر ہے ان حالات میں وہ اپنے ہاتھ میں قلم کیسے لے سکتے تھے، انہیں روٹی کی فکر تھی۔

رہنے سہنے کے لئے جگہ حاصل کرنے کا خیال تھا۔ زندگی کی گاڑی کو چلانے کے لئے بہت سی چیزیں درکار تھیں چنانچہ ابھی تک وہ لکھنے سے قاصر رہے ہیں۔ شخصی اور نجی ضروریات ان کی تخلیق کی راہوں میں حائل ہو گئی ہیں۔ تیسری ایک بات یہ بھی ہے کہ بہت سے ناشر خود ان ہنگاموں کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بہتوں کا سب کچھ جل چکا ہے۔ ان میں سے اکثر تباہ حال ہیں۔ ایسی صورت میں نشر و اشاعت کی رفتار کا مدھم ہو جانا یقینی ہے اس خیال نے بھی ادیبوں کو اس بات کے لئے مجبور کیا ہے کہ وہ اپنی تخلیقی رفتار کو تیز نہ ہونے دیں۔ کیونکہ موجودہ زندگی کی بے اطمینانی اور حالات کی غیر یقینی کیفیت نے نشر و اشاعت کے دروازے بند کر دئے ہیں اس لئے میں یقین ہے بہت سی چیزیں لکھی گئی ہونگی، جو ابھی تک عام نہیں ہو سکی ہیں۔ بہت سے تخلیقی کارنامے پیش کئے جا چکے ہونگے لیکن ابھی تک منظر عام پر ان کے ستارے طلوع نہیں ہو سکے ہیں۔ اور ان سب کے علاوہ زبان اور ادب سے ایک عام بے نیازی کا جو ماحول رجعت پسند قوتوں نے پیدا کر دیا ہے، اس نے بھی غیر شعوری طور پر کچھ نہ کچھ اثر ہمارے ادیبوں پر ضرور کیا ہے۔ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ حکومت سے لے کر سماج کے معمولی سے معمولی افراد تک ان کی زبان اور ادب کو فنا کر دینے کے درپے ہیں۔ ان سب نے مل کر ان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا ہے، تو غیر شعوری طور پر اس طرف ان کی توجہ کم ہو جاتی ہے۔ ان کی طبیعت میں امنگوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ لیکن ان تمام ناساز گار حالات کے باوجود وہ اپنا کام کریں گے۔ یہ رکاوٹیں وقتی ہیں یہ ہمیشہ ہمیشہ ان کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ ان کا دھارا ان سب کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔

اردو کے ادیب موجودہ پر آشوب زمانے کی سچی اور صحیح تاریخ لکھیں گے۔ کیونکہ وہ اپنی پھیلتی اور بڑھتی ہوئی تہذیب کو موت کی تاریکیوں میں فنا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ ان کے تہذیبی سرمائے کو زخمی کیا گیا ہے اور اب اس مستقل اور مسلسل نمک پاشی کی صورتیں نکالی جا رہی ہیں جو اٹھتا ہے وہ اس پر چرکا لگانے سے باز نہیں رہتا۔ تہذیب ان کے ہاتھوں میں ایک امانت ہے۔ سیاست کے ہتھیار اس کو گھائل نہیں کر سکتے۔ قدامت و رجعت کے ہتھکنڈوں میں اس کو اسیر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ان سب کا مقابلہ کریں گے۔

اس وقت ہمارے ادیبوں کے سامنے چند بہت ہی اہم مسائل ہیں، جن کا حل انہیں پیش کرنا ہے۔ یہ مسائل ہماری زندگی کے اہم ترین مسائل ہیں۔ اور زندگی کے مسائل سے ادیب کسی حال میں بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ اس لئے ان کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ اپنی عام تخلیقات کو ان مسائل کے سلجھانے اور عوام میں ان کا صحیح شعور پیدا کرنے کے لئے وقف کر دیں۔ انہیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ اس سلسلے میں عملی حصہ لینا بھی ان کا فرض ہے۔

یہ بات مسلم ہے کہ ہماری زندگی کی موجودہ عام الجھنوں کا سرچشمہ وہ فرقہ پرستی ہے جس کا زہر ہماری زندگی کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ یہ تمام فسادات یہ سارے ہنگامے اسی کی پیداوار ہیں۔ فرقہ پرستی کا زہر نہ پھیلتا تو اس جنت نشان میں خون کی ندیاں نہ بہتیں جاگتی جگمگاتی بستیوں کو خاک سیاہ نہ کر دیا جاتا۔ ہنستی اور مسکراتی ہوئی آبادیوں میں الو نہ بولنے لگتے۔ ہزاروں کی تعداد میں ماؤں اور بہنوں کی عزتوں کا خون نہ کیا جاتا۔ لاکھوں کے سہاگ نہ لٹ جاتے۔ کروڑوں کی آبادیاں ادھر سے ادھر نہ ہوتیں، یہ سب فرقہ پرستی ہی کا کیا دھرا ہے۔ اگر یہ زہر نہ پھیلتا تو یہ سب کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس لئے سب سے اہم ضرورت اور بنیادی کام ادیبوں کے پیش نظر اس وقت یہ ہے کہ وہ زندگی کی گردن سے لعنت کے اس طوق کو نکالنے کی کوشش کریں۔ ان کی تخلیقات اس کے لئے وقف ہو جانی چاہئیں۔ ان کے پیام کو اس وقت انسانیت کا پیام ہونے کی ضرورت ہے۔ انسانیت ہی محبت کا دوسرا نام ہے۔ ادہ

محبت ہی ادیب کا نصب العین ہے۔ اور محبت ہی ایک ایسا سمندر ہے جس میں ادیب کے افکار و خیالات کے تمام چشمے اور جذبات و احساسات کے تمام دریا جا کر مل جاتے ہیں، اور اپنی ہستی کو فنا کر دیتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ فرقہ پرستی کا کاٹ صرف محبت سے ہو سکتا ہے۔ محبت ہی اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا سکتی ہے۔

فرقہ پرستی نے اس وقت ہماری زندگی کے ہر شعبے میں قدامت و رجعت کو حکمران کر دیا ہے۔ اور یہ قدامت و رجعت ہماری معاشرت، ہماری زبان، اور ہمارے ادب کے لئے ایک مستقل خطرہ بن گئی ہے۔ اس نے ان وقتی اور ہنگامی مسائل کے علاوہ بعض ایسے مستقل اور بنیادی مسائل کھڑے کر دئے ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں لسانی ادبی اور تہذیبی مسائل خاص طور پر اہم ہیں۔ ان سب کا چراغ ناسازگار حالات کی وجہ سے آندھیوں کی زد پر ہے۔

لسانی مسئلے کو سیاست کے ساتھ الجھانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اور اب بعض لوگوں کو کھلم کھلا اس سلسلے میں من مانی کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ میں نے بہت پہلے لکھا تھا کہ جبکہ ہندوستان کی تقسیم کی بنیاد نفرت پر قائم ہوئی ہے۔ اس لئے اس بات کی توقع کرنی کہ لسانی مسئلہ اس سے سلجھ جائے گا ایک بیکار سی بات ہے۔ اس کے اور زیادہ الجھنے کی توقع زیادہ ہے، چنانچہ وہی ہوا۔ تقسیم کے بعد تجدد پسندی Revivalism کی تحریک کا زور بڑھتا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں پرچین بھارت اور پراچین کال کی تہذیب کو ایک دفعہ پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ زبان کو سنسکرت کے بوجھل الفاظ سے بھرا جا رہا ہے، اور اسی زبان کو ہندوستان کی قومی اور ملکی زبان بنانے کے لئے زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں۔ وہ مشترکہ زبان جو ہندو مسلم میل جول کا نتیجہ ہے۔ اور جو ہمیں اپنے آباؤ اجداد سے ایک مقدس ترکے کی حیثیت سے ملی ہے اس کا وجود تک تسلیم نہیں کیا جاتا۔ خیال، اور عمل دونوں سے یہ بات ثابت کی جا رہی ہے کہ اردو کوئی زبان نہیں۔ زبان اگر کوئی ہے تو ہندی ہے، اور اسی کو عام ہونا چاہئے۔ چنانچہ دہلی، یوپی اور بہار، جہاں کی صحیح معنوں میں یہ زبان ہے۔ انہوں نے اس کو دیس نکالا دے دیا ہے۔ پنجاب میں اگرچہ پنجابی بولی جاتی تھی، لیکن لکھنے پڑھنے کا سارا کام اردو میں ہوتا تھا۔ لیکن اب مشرقی پنجاب کو بھی اس کا وجود تسلیم نہیں۔ اب وہاں کی زبان ہندی اور گورمکھی ہے۔ باہمی نفرت نے کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ اس دیس میں زبانوں کے بھی مذہب ہوتے ہیں۔ بہرحال فرقہ پرستی، تنگ نظری، مذہبی جنون اور تہذیبی رجعت پسندی نے اس ملک کی پھلتی اور بڑھتی ہوئی زبان کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی ہے۔ گویا ادیبوں کی زبان کو کاٹ دیا گیا ہے۔ انہیں بولنے یا کچھ کہنے کی اجازت نہیں۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو کچھ عرصے تک تو یہاں کے ادیب اس زبان کو لکھتے رہیں گے، یہاں کے عوام اس زبان کو بولتے رہیں گے لیکن ان ناسازگار حالات میں ہمیشہ ہمیشہ اس سلسلے کا جاری رہنا محال ہے۔ یہ نسل ہمیشہ باقی نہیں رہے گی۔ دوسری نسل آئے گی اور اس کو ماحول کے رنگ میں رنگ جانا پڑیگا۔ اور اس کے ساتھ ہی مشترکہ تہذیب کے اس سب سے بڑے سرمائے کے نقوش دھندلے پڑتے جائیں گے۔ لیکن اگر عوام میں اس وقت زبان کے متعلق صحیح شعور پیدا کر دیا جائے۔ اور وہ اس مسئلے کی نوعیت کو پوری طرح سمجھ لیں تو لاکھ کچھ ہو، اس کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ وہ اس کو زندہ رکھیں گے۔

میرا خیال تھا کہ ہندوستان کی سرزمین سے جب اس زبان کو دیس نکالا ملے گا، تو پاکستان میں اس کو پناہ مل جائے گی۔ کیونکہ یہ ریاست ایک تہذیبی کشمکش ہی کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔ چنانچہ وہاں ایک حد تک اس کی کوششیں جاری ہیں لیکن تجدد پسندی Revivalism کے اثرات وہاں بھی نمایاں ہیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال تو یہ ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں صاحب اردو کو اس وجہ سے عام کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک "مسلم زبان"

ہے۔ اور ان کے خیال میں ایک مسلم حکومت کی زبان مسلم ہونا چاہئے۔ حال ہی میں اردو کی موافقت پر تقریر کرتے ہوئے، انہوں نے بڑے زور شور سے اس خیال کو پیش کیا تھا۔ لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اردو مسلم زبان نہیں۔ اس ملک میں مختلف تہذیبوں کے میل جول کی نشانی ہے۔ وہ جتنی مسلم ہے، اتنی ہی ہندو بھی ہے۔ علم اللسان کے تمام ماہرین یہی کہتے چلے آئے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کی تحریک کی بنیاد اسی خیال پر قائم ہے۔ جس قدر مسلمانوں کے مذہب اور تہذیب کے اثرات اس زبان میں ملتے ہیں، اسی قدر ہندو دھرم اور تہذیب کا پتہ بھی اس میں ملتا ہے۔ اس لئے لیاقت علی خاں صاحب کے اس خیال سے اردو کی تحریک کو ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اور خصوصاً ہندوستان میں جہاں یہ زبان پلی اور بڑھی ہے۔ اور جو اس کا جنم بھوم ہے — اس قسم کی جذباتی باتوں سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ نقصانات زیادہ اٹھانے پڑتے ہیں۔ ایسا کہنا اردو کے ساتھ دوستی نہیں دشمنی ہے۔ اردو کے لئے اس وقت ہر جگہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں بھی اس کے لئے ایک وسیع میدان ہے۔ اس لئے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس قسم کی جذباتی باتیں کرنے کے بجائے کوئی ایسا ٹھوس اور مضبوط کام کیا جائے جو اردو کے حق میں مفید ثابت ہو۔ لیکن، افسوس کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ اردو پرچار کی کوئی اسکیم ابھی تک وہاں نہیں بنائی گئی۔ اردو کی تعلیم کا ابھی تک کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ یونیورسٹیوں میں ابھی تک اس کو ایک موضوع تک کی حیثیت حاصل نہیں۔ پھر اس کی اعلےٰ تعلیم کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ میرے ایم اے اور بی اے آنرز کے وہ طالب علم جو دہلی میں ناساز گار حالات کی وجہ سے وہاں پہنچے ہیں، انہوں نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ وہاں ان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ وہ سب بے یار و مددگار پھر رہے ہیں۔ اکثر نے تو صرف اس وجہ سے اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا ہے کہ وہاں کی یونیورسٹیوں میں اردو کی اعلےٰ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ کیا یہ کام کرنے کا نہیں تھا؟ کیا ایسے ہی بہت سے کاموں کو وہاں نظر انداز نہیں کیا جا رہا ہے؟

غرض صورت حال یہ ہے — دونوں نوزائیدہ ریاستوں میں زبان کے لئے کوئی تعمیری کام نہیں ہو رہا ہے۔ ایک تو سرے سے اس کو ختم ہی کرنے کے درپے ہے۔ اور دوسرے کی حیثیت اس کے حق میں "نادان دوست" کی ہے۔ اس لئے اس پناہ گزین زبان کی آبادکاری، بحالی اور خوشحالی کا مسئلہ اس وقت سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ زبان آج حسرت بھری نظروں سے ہر اس شخص کی طرف دیکھ رہی ہے، جو اس سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کے اوپر عرصہ حیات تنگ ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے ایک سہارا تلاش کر رہی ہے۔ اس وقت اس کی یہ خواہش ہے کہ وہ زندہ رہے، پھلے اور پھولے۔ اس کو اس کی اپنی صحیح اور جائز جگہ مل جائے۔ اس کام کو ادیب اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ زبان ان کے ہاتھوں میں ایک مقدس امانت ہے۔ وہ خود اس کے سہارے زندہ ہیں۔ اس لئے انہیں اس کے زندہ رکھنے اور پھلنے پھولنے کی تدابیر اختیار کرنی ہونگی۔ ایک لائحہ عمل کے ماتحت یہ کام کرنا ہوگا۔ یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اور ادیبوں کا اس ذمہ داری سے آسانی کے ساتھ سبکدوش ہونا مشکل ہے۔ کیونکہ موجودہ زندگی کی کشمکش کا یہ ایک اہم اور مستقل مسئلہ ہے۔ ادیب اس مسئلے کو حل کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ وہ سماج کے ایک ایک فرد کو اس بات کا احساس دلائیں گے کہ اردو زبان انکی اپنی زبان ہے۔ اور اس سے دلچسپی لینا، محبت کرنا، اور اس کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنا ان میں سے ہر شخص کا فرض ہے۔ وہ ایک ایک گھر اور ایک ایک خاندان میں اس سے ایک والہانہ وابستگی پیدا کر دیں گے۔ وہ اپنی اپنی حکومت کو اس بات کے لئے مجبور کرینگے کہ اگر وہ اس زبان کو پھیلانے اور بڑھانے میں مدد نہیں کرتی تو اس کی مخالفت بھی نہ کرے گی۔ وہ ایک ایک یونیورسٹی کو مجبور کرینگے کہ اس میں اس کی تعلیم کا چرچا عام ہو۔ تاکہ اس کی مقبولیت بڑھتی جائے — اس میں خود ادیبوں کا بھی فائدہ ہے، کیونکہ اردو کی مقبولیت کا ان پر براہ راست اثر انداز ہونا لازمی اور یقینی ہے۔ لیکن

اس کے لئے انہیں اس نفرت کو بھی ختم کرنا ہوگا جو سیاست اور مذہب کے ساتھ ساتھ زبان کے معاملے میں بھی عام ہوتی جا رہی ہے اور جو زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے لئے بھی ایک مستقل خطرہ ہے۔

اگر ہماری زبان نفرت کے پنجوں کا شکار ہونے سے بچ جاتی ہے، تو ہمارا ادب بھی ترقی کرتا ہے۔ ورنہ جب زبان ہی باقی نہ رہے گی تو ادب کا وجود کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ ادب کا بھی اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کہیں وہ بھی نفرت کا شکار نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا وطن دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ دو جداگانہ حکومتیں قائم ہو چکی ہیں جن کا نصب العین مختلف ہے جن کی پالیسی متضاد ہے۔ ان دونوں حکومتوں کے درمیان نفرت کی دیوار حائل ہے۔ تعلقات خوشگوار نہیں ہیں۔ خواہ مخواہ ایسے مسئلے پیدا کر لئے گئے ہیں جن سے ناچاقی پیدا ہو۔ اس لئے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں ادیب بھی اس دھارے کے ساتھ نہ بہہ جائیں۔ اسی رنگ میں نہ رنگ جائیں۔ اسی نفرت کے بنائے ہوئے راستے پر ان کا قدم نہ بڑھنے لگے۔

یہ صحیح ہے کہ سیاسی تقسیم نے اردو کے ادیبوں کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ وہ ایک ہی دیس کے باشندے ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لئے اجنبی بنا دئے گئے ہیں۔ دو مختلف حکومتوں کے شہری ہونے کی حیثیت سے ان پر مختلف اور متضاد قسم کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ دونوں حکومتیں ان سے اس بات کی متقاضی ہیں کہ وہ ان کے گن گائیں۔ ان کو سراہیں اور آسمانوں پر چڑھا دیں اور یہ ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ لیکن اس ہنگامے میں، اس انتشار میں، اس افراتفری میں ادیبوں کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ وہ ادیب ہیں۔ اس حقیقت کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہئے کہ وہ اپنی ہستی کو صرف کسی ایک جغرافی حدود میں اسیر نہیں کر سکتے ایک شہری کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں ان پر عائد ہوتی ہیں ان سب کا انہیں خیال رکھنا چاہئے۔ لیکن اگر ادیب ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض یہ بھی ہو کہ وہ اپنی حکومت کی پالیسی پر ناقدانہ نظر بھی ڈالتے رہیں۔ ان کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کی حکومت اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر کہیں اس راستے سے ہٹ تو نہیں رہی ہے جس پر چلنا اس کا فرض ہے۔ اور جس کا چھوڑنا کسی حال میں بھی اس کے شایانِ شان نہیں۔ ان کے لئے اس بات پر نظر رکھنی بھی ضروری ہے کہ ان کی حکومت اپنی ہوس کے نشے میں انسانیت کی ان بنیادی قدروں کو تو خیرباد نہیں کہے دے رہی ہے، جو اس کا زیور ہیں۔ اگر دونوں حکومتوں کے ادیب ان باتوں کو پیش نظر رکھیں تو پھر آپس کی آویزش کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ادیبوں میں اختلافات کا ہونا کوئی نئی بات نہیں۔ ایک ہی ملک و ایک ہی قوم کے ادیبوں میں ایک ہی مسئلے پر اختلاف ہو سکتا ہے۔ آج تک اختلافات رہے ہیں، اور آئندہ بھی رہیں گے۔ ان کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ ادب میں بعض بنیادی باتوں تک پر اختلافات کے سلسلے ملتے ہیں۔ بحث و مباحث کی تاریخیں بنتی چلی جاتی ہیں۔ اس لئے بعض فروعی باتوں میں اختلافات پیدا ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں۔ لیکن بعض ایسی باتیں ہوتی ہیں جن پر ہر ایک کا متفق ہو جانا ضروری ہوتا ہے۔ زندگی کی بعض ایسی قدریں ہوتی ہیں جن سے کوئی بھی اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے زندگی میں یہ قدریں انسانیت کی قدریں ہیں، محبت کی قدریں ہیں۔ ہر شخص کیلئے ان کا پسند کرنا اور ان سے متفق ہونا لازمی ہے۔ اس لئے ہمارے ادیبوں کو آپس کی آویزش ختم کرنے کے لئے زندگی کی ان قدروں کے پرچار کو اپنا نصب العین بنا لینا چاہئے۔ کیونکہ ان سے زیادہ مستحسن اور کوئی چیز ہو نہیں سکتی۔ عوام کا خیال، ان کی بہتری، ایک ایسے نظام کی خواہش جس میں ہر ایک اطمینان اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ اگر صرف انہی باتوں کو وہ اپنے اپنے ملک کے مسائل کی روشنی میں پیش کریں، تو ادیبوں کی تقسیم کا یہ مسئلہ پیچیدہ صورت اختیار نہیں کر سکے گا۔ اور بہت سے فتنے فنا کی نیند سو جائیں گے۔ اور انسانوں کی محبت کا بول بالا ہوگا۔ زندگی کی یہی ایک قدر ہے جو کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

جب اس مرکز پر روس، امریکہ، فرانس، انگلستان، جرمنی، اٹلی، پولینڈ، ہندوستان اور دنیا جہان کے ادیب متفق ہو سکتے ہیں تو پھر ہندوستان اور پاکستان کے ادیب اس کو اپنا نصب العین کیوں نہ بنائیں؟ — یہی ایک صورت ہے جس سے اختلافات سر نہیں اٹھا سکتے۔ اور یہ ان کی اپنی اپنی حکومتوں کے حق میں بھی اچھا ہوگا۔ کیونکہ ہر حکومت ترقی پسند اور ترقی پذیر ہونا چاہتی ہے۔ خواہ مخواہ ایک دوسرے سے نفرت کرنا اس کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ وہ عوام کی بھلائی چاہتی ہے۔ ہر ایک کو پھلتے پھولتے دیکھنا اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی حکومت ایسا نہیں کرتی تو اس کے خلاف آواز اٹھانا اس کے ہر شہری کا فرض ہو جاتا ہے۔ ادیب اس حقیقت کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتے وہ ایسا کریں گے۔ اور یہی ایک صورت ہے جس سے ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں میں ایک ربط، ایک میل جول، ایک ہم آہنگی کا سلسلہ قائم رہے گا، اور وہ ایک دوسرے کے قریب رہیں گے۔ انسانیت اور محبت ان کا نصب العین ہوگا۔

موجودہ سیاسی تبدیلیوں نے تہذیب اور سماج کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ زبان اور ادب کے مسائل بھی جن کا اوپر ذکر ہوا، ایک حد تک اسی کے تحت آتے ہیں۔ تہذیب اور سماج کا ارتقا، زبان اور ادب کے ارتقا کی طرح فطری ہوتا ہے۔ اس لئے تہذیب کے ارتقائی رجحانات اور وہ عناصر جو تہذیب میں ترقی پسندی اور ترقی پذیری کا رنگ بھرتے ہیں، ان سب کو زندہ رکھنے کی کوشش اور آگے بڑھانے کا خیال ہر اس ادیب کے پیش نظر ہونا چاہیئے جو رجعت سے نفرت کرتا ہے۔ ہمارے اس برعظیم میں کئی مختلف تہذیبوں کی کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ ان میں سے جن تہذیبی رجحانات کی ابتدا فطری ہے۔ ان کو ضرور پھیلنے اور بڑھنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ لیکن بعض رجعت پسند عناصر جو اب دنیا بھر میں مردہ تہذیبوں کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں، ان کی مخالفت ہر ایک کا فرض ہے۔ کیونکہ اس کے پردے میں وہ ان تہذیبی عناصر کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے درپے ہیں، جو زندگی کو مسرتوں سے بھر دینا چاہتے ہیں جن کے پیش نظر عوام کی بھلائی، دولت کی صحیح تقسیم، سرمایہ و محنت کی کشمکش کا حل، سماج کے افراد کی ذہنی بلندی، اور اسی طرح بیسیوں باتیں ہیں، جن کی اہمیت اور ضرورت سے کبھی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ادیب سماج اور تہذیب کے علمبردار ہیں۔ اس لئے موجودہ انتشاری اور نراجی حالات میں ان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے خطوں میں تہذیب اور سماج کے ان بنیادی مسائل کی طرف توجہ کریں۔ یہ ایک ایسا مرکز ہے جس پر مختلف ملکوں اور قوموں کے ادیب جمع ہو سکتے ہیں۔ اور یہ ان کے اختلافات کو ختم کرنے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

غرض یہ کہ ہمارے ادیبوں کے سامنے بدلتے ہوئے حالات نے بیشمار تہذیبی، سماجی، ادبی، لسانی اور انسانی مسائل کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ہمارے ملک کی سیاسی تبدیلیاں، سماجی انتشار، تہذیبی پراگندگی نے ان کی ذمہ داریاں بڑھا دی ہیں۔ انہیں اپنے زمانے کی تاریخ بھی لکھنی ہے۔ عوام میں ایک صحیح سیاسی شعور بھی پیدا کرنا ہے۔ تہذیب اور سماج کو صحیح راستے بھی دکھانے ہیں ادبی اور لسانی پیچیدگیوں کا حل بھی تلاش کرنا ہے۔ اور آپس کی آویزشوں کو ختم کرنے کے لئے ایک نئی دنیا بھی بنانی ہے۔ تاکہ ہماری زندگی کے خوشنما چہرے پر جو بدنما داغ لگ چکا ہے وہ مٹ جائے۔ اور ہمارا قافلہ نفرت کی بجائے محبت کی شاہراہ پر گامزن ہو۔

زندگی کے موڑ پر

کرشن کے تین طویل افسانوں کا مجموعہ جن کا محور محبت ہے۔۔ محبت جو زندگی کی اساس ہے۔۔۔۔ محبت جو کائنات کا راز ہے۔ قیمت دو روپے

مکتبہ اردو لاہور

محمد حسن عسکری

مارکسیت اور ادبی منصوبہ بندی

انسانی تاریخ اور انسانی تفکر کی تاریخ میں مارکسیت کی جو حیثیت اور اہمیت ہے وہ تو اتنی مسلّم ہے کہ بار بار اس کا ذکر کرنا بھی تضیع اوقات ہے۔ تعصب کی دشواریاں حائل نہ ہوں تو یہ بات مان لینے میں کسی کو عذر نہ ہوگا کہ مارکسیت نے انسانی زندگی کو سمجھنے کی کوشش ایک ایسے طریقے سے کی ہے جو بڑی حد تک قرین قیاس اور مربوط ہے۔ اور جس نے چند قابل قدر رجحانات کو آگے بڑھنے میں مدد دی ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ مارکسیت نے مربوط نظریے پر بہت کچھ قربان کر دیا ہے، اور نئے رجحانات کو مدد دیتے ہوئے اپنی نظریاتی سلامتی کیلئے ایسے ایسے عوامل اور حقائق سے چشم پوشی برتی ہے جن کی حیثیت محض عمرانیاتی نہیں بلکہ حیاتیاتی ہے۔ اور اس لیے انہیں نظریاتی تبدیلیوں یا سیاسی انقلابوں کے ساتھ ساتھ بدلا نہیں جا سکتا۔ ایک طرف تو مارکسیت نے دائمی اقدار کا مذاق اڑایا، اور یہ چاہا کہ مکمل اضافیت کو رواج دینا چاہا، دوسری طرف انسانی فطرت کے غیر عقلی تقاضوں سے مجبور ہو کر اور خود ایک اضافی نظریہ بن جانے سے بچنے کیلئے اسے خود بھی چند دائمی اقدار قائم کرنا پڑیں جن کا واحد وصف یہ ہے کہ وہ نسبتاً دائمی ہیں۔ چونکہ مارکسیت کے لئے انسانی زندگی کی دوسری تفسیروں کو رد کرنا لازمی تھا اس لئے مارکسیت نے ان سب کو غیر عقلی اور غیر سائنٹفک ٹھیرانے کی کوشش کی اور اپنے نظریوں میں علوم صحیحہ کی سی درستی پیدا کرنی چاہی۔ لیکن جہاں تک انسانی زندگی کی تنظیم سے تعلق رکھنے والے علوم کا تعلق ہے کوئی نظریہ مطلق و مجرد اضافیات پر نہیں چل سکتا۔ یعنی عملی دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔ ریاضیات میں علمی اعتبار سے چاہے دو اور دو چار نہ ہوتے ہوں، مگر انسانی زندگی میں روزمرہ کے کاروبار کے لئے یہ بات فرض کرنی پڑتی ہے خواہ اسے فریب ہی کیوں نہ کہا جائے، لیکن ایسے ہزاروں فریب یا سمجھوتے انسانی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ چنانچہ انسانی زندگی کے متعلق ہر نظریے کو چند دائمی اور مستقل اقدار فرض کرنا پڑتی ہیں۔ یہی مجبوری مارکسیت کو بھی پیش آئی۔ لیکن چونکہ مارکسیت نے صرف ایک شعبے، یعنی معاشیات میں تخصیص حاصل کی تھی اور زندگی کے سارے شعبوں کو اسی ایک شعبے کا تابع سمجھ لیا تھا، اس لئے مارکسیت نے اپنی دائمی اقدار بھی معاشی عوامل ہی سے مستعار لیں۔ خیر یہ غلطی تو تمام دوسرے علمی فلسفیانہ اور مذہبی نظریوں نے بھی کی تھی اور کرتے ہیں کہ زندگی کے ایک مخصوص شعبے کی اقدار کو تمام شعبوں پر حاوی کر دیں۔ مگر ان کے ساتھ کم سے کم اتنی بات ہے کہ ان اقدار کا تعلق انسان کی اندرونی زندگی سے ہوتا ہے، لہٰذا یہ نظریے، انسان کی صرف خارجی زندگی ہی نہیں، بلکہ جذباتی اور روحانی زندگی کے لئے بھی ایک نظام مرتب کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف مارکسیت کی اقدار سراسر خارجی دنیا سے متعلق ہیں، اور بڑے بڑے جذباتی مسائل کو چھوڑ کر —— یہ بھی میں رعایتاً کہہ رہا ہوں —— انسان کی جذباتی اور روحانی زندگی کا کوئی تسکین بخش نقشہ ان اقدار کی مدد سے مرتب نہیں ہو سکتا۔ مارکسیت کا یقین ہے کہ محض معاشی حالتوں کو بدلنے سے انسان بھی بدلا جا سکتا ہے، پرانے اخلاقی اور مذہبی نظام یہ سمجھتے تھے کہ انسان کو بدلنے کے لئے اس کے تصورات اور عادات کو بدلنا لازمی ہے۔ ممکن ہے کہ موخرالذکر نظریہ پوری طرح کافی نہ ہو، لیکن مارکسی نظریے پر یہ فوقیت ضرور رکھتا ہے کہ یہاں انسان کے اندر صرف پیٹ ہی نہیں، بلکہ دماغ بھی فرض کیا گیا ہے، اور نفسیاتی محرکات کو قابل توجہ سمجھا گیا ہے۔ نفسیاتی ضرورت خواہ

مبہم اور حقیر سہی، لیکن دراصل پورا معاشی مسئلہ انہیں پر منحصر ہے۔ مارکسیت سرمایہ داری کے ارتقا کی تاریخ تو بیان کر سکتی ہے لیکن یہ نہیں بتا سکتی کہ آخر سرمایہ دار اتنی دولت کیوں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کا جواب صرف نفسیات دے سکتی ہے۔ لہذا بنیادی اعتبار سے معاشی مسئلہ نفسیاتی اور اخلاقی مسئلہ بن جاتا ہے۔ خود کمیونزم کی ساری جدوجہد چند اخلاقی تصورات پر مبنی ہے، لیکن مارکسیت اپنے آپ کو اس نظر سے دیکھتے ہوئے گھبراتی ہے۔ جب اشتمالیت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ محنت کرنے والے کو اپنی محنت کے نتیجے سے مستفید ہونے کا حق ملنا چاہئے تو دراصل وہ چند بالکل مطلق و مجرد اخلاقی تصورات پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھتی ہے، ورنہ یہ اصول منطقی اور علمی دلیلوں سے قطعاً ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ عدل و انصاف کے چند دائمی اصولوں کے بغیر اشتمالیت وجود میں نہیں آ سکتی تھی، اس اعتبار سے مارکسیت ایک اخلاقیاتی اور جذباتی نظریہ ہے۔ مگر اس "جذباتیت" کے باوجود مارکسیت کو جذبات سے متعلق ہونے سے انکار ہے۔ اور محض منطقی اور علمی نظریہ ہونے کا دعویٰ! خیر اس میں بھی کوئی حرج نہیں تھا اگر مارکسیت خارجی زندگی کے معاشی اور سیاسی پہلوؤں کی منصوبہ بندی کر کے مطمئن ہو جاتی، اور انسان کی اندرونی زندگی کا نظام مرتب کرنے کا کام کسی اور نظریے کے سپرد کر دیتی۔ لیکن مارکسیت انسانی معاملات میں وحدہٗ لاشریک رہنا چاہتی ہے، اور کسی دوسرے نظریے کا دخل اسے گوارا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس میں کوئی نظام جذبات فراہم کرنے کی بھی صلاحیت نہیں ہے۔ چنانچہ معاشیات اور سیاسیات کے محدود سے دائرے کے باہر بچارا مارکسی کچھ کھویا سا جاتا ہے۔ اور زندگی کے اہم ترین جذباتی مسائل میں اپنا رویہ ٹھیک طرح قائم نہیں کر سکتا، اور اگر وہ اپنے معاشی نظریات کی روشنی میں جذبی سے کوئی حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی کیفیت خاصی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ ذرا ذرا سی بے ضرر چیزوں سے وہ اس طرح چڑکنے لگتا ہے جیسے بھڑوں کے چھتے سے، اور عام کلچری مسائل میں کچھ چڑا ہوا سا یہنے لگتا ہے کہ جہاں کوئی بات کی اور لگا بگڑنے، مگر عام آدمی کی زندگی میں معاشی عقیدے اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنا کوئی مقررہ جذباتی نظام، کیونکہ اسے ہر ہر لمحے جذباتی صورتِ حالات سے متاثر ہونا پڑتا ہے۔ اگر اس کے لئے جذباتی سانچے موجود نہ ہوں جن میں اس کے اعصاب کی تحریکات غیر شعوری طور پر ڈھلتی چلی جائیں تو اس کی پوری زندگی بے کینڈے ہو جاتی ہے۔ اور وہ بہترین اشتراکی نظام کے باوجود پُرسکون زندگی نہیں گزار سکتا۔ مارکسیوں کو اپنی راسخ الاعتقادی کی قیمت جذباتی ناآسودگی کی شکل میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ مگر عام آدمی کی زندگی اسے مجبور کرتی ہے کہ اپنے اعصابی دباؤ کو ہلکا کرنے کے لئے جو جذباتی سانچے بھی آسانی سے مل جائیں انہیں قبول کر لیا جائے۔ عام طور پر یہ سانچے مروجہ پرانے اور غیر مارکسی ہوتے ہیں۔ اور اس پر مارکسی لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ یہ "ارتداد" کیوں شروع ہوا۔ جب تک کمیونسٹ نظام خارجی دنیا میں قائم نہیں ہوتا اس وقت تک تو خیر اس خوش فہمی کی بھی گنجائش رہتی ہے کہ جب یہ نظام مستحکم ہو جائے گا تو اپنی جذباتی روایتیں اور سانچے خود پیدا کر لیگا۔ لیکن کمیونسٹ نظام کو پیدائش کے وقت ہی سے یہ عملی دشواری پیش آتی ہے کہ لوگ اپنی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی باتوں سے لیکر بڑی سے بڑی باتوں تک کے بارے میں کیا محسوس کریں۔ مارکسیت لوگوں کی یہ مشکل خود بھی تشفی بخش طریقے سے حل نہیں کرتی، اور انہیں اپنے عقیدوں کے تنگ دائرے سے باہر بھی نہیں نکلنے دینا چاہتی۔ براہِ راست تو مارکسیت جذباتی راستے متعین نہیں کرتی، البتہ مارکسی نظریوں سے چند نتیجے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ مگر اس طرح جو اصول اب تک بنائے گئے ہیں ان کی بنیادوں پر کسی عظیم ادب اور آرٹ کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ اصول زندگی کی بڑی بڑی حقیقتوں سے آنکھیں چرانے کی کوشش کرتے ہیں، اور محض سادہ دلانہ خوش عقیدگی سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ ممکن تھا کہ

مارکسیت نظری اعتبار سے نہ سہی، عملی حیثیت سے آہستہ آہستہ ایسے تصورات پیدا کر لیتی جو کمیونسٹ تہذیب کو معنوی اعتبار سے بھی دنیا کی دوسری بڑی بڑی تہذیبوں کا ہم پلّہ بنا سکتے۔ مگر اوّل تو فلسفیانہ اعتبار سے خود مارکسیت ہی میں اور خصوصاً مارکسی نظریہ سازوں میں دماغی انکسار کی بڑی کمی رہی ہے۔ اور عملی دنیا میں مارکسیت کے کامیاب ہو جانے سے تو اس غرور میں اور ترقی ہوئی ہے۔ چنانچہ نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ اپنی تمام مادی ترقیوں کے باوجود روس کی روحانی زندگی پر ایک عجیب بیچارگی ٹپکتی ہے۔ خواہ اس پر ملمع کرنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ یوں روسی حکومت کے قول کے مطابق تو جتنی ادبی کتابیں، قدیم و جدید دونوں، روس میں پڑھی جاتی ہیں اتنی دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں پڑھی جاتیں۔ مگر کلچری معاملات سے عوام کے اتنی دلچسپی لینے کے باوجود روس کسی فن میں بھی کوئی ایسی تخلیق پیش نہیں کر سکا جسے "بورژوا" تہذیب کی تخلیقات کا ہم پلّہ کہا جا سکے۔ یہ صرف الزام نہیں ہے بلکہ گورکی تک نے اس کا بارہا اعتراف کیا ہے۔ لیکن اس اعتراف کے باوجود گورکی مرض کی صحیح تشخیص نہ کر سکا اور نہ اس سے مناسب نسخہ تجویز ہوا، بلکہ وہ تو اپنی "دینداری" کا شکار ہو کر رہ گیا۔ اس وقت میرے سامنے گورکی کا ایک مضمون ہے جس میں اس نے پورا نقشہ پیش کیا ہے کہ روس کے انقلابی شاعروں کو ادبی روایات میں کیا کیا تبدیلیاں کرنی ہیں اور شاعری کو کن راستوں پر لے جانا ہے۔ اس مضمون میں نظریہ پرستی اور روزمرّہ کی زندگی کے حقائق سے بے اعتنائی جو شکلیں اختیار کرتی ہے وہ نہ صرف المناک ہیں بلکہ مضحکہ خیز بن جاتی ہیں، اور حیرت ہوتی ہے کہ گورکی جیسا آدمی . . . . روزمرہ کے مشاہدے میں آنے والی باتوں سے اپنے آپ کو ایسا غافل کیسے بنا سکا، اس مضمون کا تجزیہ اس وجہ سے بہت کارآمد ہوگا کہ اس میں ادب اور کلچر کے متعلق مارکسی نقطۂ نظر کا پورا نچوڑ آ جاتا ہے۔ اب گورکی کا ہدایت نامہ دیکھتے چلیے۔

نئے روسی ادب کا مجوزہ حلیہ پیش کرنے سے پہلے گورکی نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو یہ ادب تخلیق کرنے والے ہیں۔ گورکی کے خیال میں روسی نوجوان نسل ایک ترقی پذیر اور اپنے اوپر اعتماد رکھنے والی قوت ہے (چلیے مان لیا)، اور بغیر کسی شبہ نا کے، تاریخ کی منطق چاہتی ہے کہ یہ نسل زندگی کی نئی شکلوں کی تخلیق کرے۔ مارکسی لوگوں کو ضد ہے کہ ان کی تہذیب ہر معاملے میں بالکل "نئی" ہوگی۔ حالانکہ عملی دشواریوں کا اندازہ کر کے انہیں بعض وقت روایت سے واقفیت کی ضرورت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ اس واقفیت کی اس طرح توجیہہ کرتے ہیں کہ ساری روایت ملیا میٹ ہو جاتی ہے۔ خارجی معاملات میں تو ممکن ہے کہ آسانی سے "نئی شکلیں" تخلیق کر لی جائیں۔ مگر روحانی زندگی میں "نیا پن" ایسا منہ کا نوالا نہیں۔ یہاں اگر "نیا پن" پیدا ہو سکتا ہے تو ایسے اصولوں کے ذریعے جن کا براہِ راست تعلق انسان کی ذہنی اور نفسیاتی زندگی سے ہو، مگر فطرت کے خارجی مظاہر کی ترتیب و تنظیم سے واسطہ رکھنے والے اصولوں کی مدد سے انسان کی روحانی زندگی میں کوئی تسلی بخش اور تمام پہلوؤں پر محیط تبدیلی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ یہ محض خود فریبی ہے کہ انسانوں کو بھی مشینوں کی طرح بدلا جا سکتا ہے۔

آگے چل کر گورکی کہتا ہے کہ روسی نوجوانوں کو ادب میں بھی نئی شکلوں کی تخلیق کرنی چاہئے۔ اس لئے ضروری ہے کہ انہیں ادب کی پرانی شکلوں سے بھی آگاہی ہو۔ پرانے ادب سے ایک تو انہیں ٹکنیک سیکھنا چاہئے۔ دوسرے انہیں پرانے ادب کے ذریعے متوسط طبقے کی ترقی اور تنزل کے عمل کو سمجھنا چاہئے، اور یہ معلوم کرنا چاہئے کہ متوسط طبقہ انحطاط پذیر کیوں ہے۔ ادب اس معاملے میں بہت مفید ثابت ہوگا، کیونکہ بورژوا شاعروں نے اس سارے عمل کی تصویر کشی خوب کی ہے، اور "ناکارہ انسانوں" کا ڈرامہ بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ بعض مارکسی مصنفوں میں یہ عام رجحان پایا جاتا ہے کہ کمیونسٹ دور سے پہلے کے آدمیوں کو انسان ہی نہ سمجھا جائے

بلکہ انہیں صرف و محض جاگیردار یا بورژوا خیال کیا جائے۔ گورکی کے بیان میں یہی ذہنیت نمایاں ہے۔ متوسط طبقہ واقعی تنزل پذیر ہے، اور بورژوا شاعروں نے واقعی اس انحطاط کی تصویر کھینچی ہے۔ اور بعض معنوں میں وہ بھی اس انحطاط میں شریک رہے ہیں، لیکن متوسط طبقہ اپنے علیحدہ خصائص کے باوجود انسان ہے، کوئی دوسری جنس نہیں ہے، اور اس اعتبار سے بہت سے بنیادی باتوں میں دوسرے طبقوں جیسا ہے۔ جب تک یہ سب طبقے انسان ہیں ان میں ضرور کوئی نہ کوئی قدر مشترک رہے گی۔ معاشی خوشحالی یا بدحالی انسانوں کی بنیادی انسانیت کو نہیں بدل سکتی۔ البتہ گورکی جیسے لوگ اپنے نظریاتی یا جذباتی تعصب سے مجبور ہو کر اس قدر مشترک کو فراموش کر سکتے ہیں۔ نظریہ سازی کرتے ہوئے گورکی نے متوسط طبقے کی انسانیت کو بھلا دیا، وہ اپنی کتاب "وہ مخلوق جو پہلے انسان تھی" کا نام تجویز کرتے ہوئے اس نے محنت کش طبقے کی بنیادی انسانیت کو نظر انداز کرنا چاہا تھا۔ اگر مارکسیت یا گورکی یا کوئی اور انسانی زندگی کو حقیقی معنوں میں (یعنی نفسیاتی اعتبار سے) بدلنا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے انسانوں کی انسانیت کو نظر میں رکھنا پڑے گا جو ظاہری لباسوں کی تبدیلیوں کے باوجود مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ انسانوں کی بنیادی انسانیت کا احساس مارکسیوں کو مذہب یا آرٹ سے حاصل ہو سکتا تھا۔ مگر ان کی نظروں میں دونوں چیزیں مشتبہ ہیں۔ انیسویں صدی کا شاعر گورکی کے لئے انسان نہیں ہے بلکہ بورژوا شاعر ہے۔ یہ ایسی کور فہمی ہے کہ میرے نزدیک تو گورکی کے افسانے تک مشکوک بن جاتے ہیں۔ اور مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس ذہنیت کے آدمی کے افسانوں میں رحم، ہمدردی اور جذبات پرستی کے باوجود کوئی حقیقی انسانی معنویت مل بھی سکتی ہے یا نہیں۔ انسان کو انسان نہ سمجھنے سے بڑھ کے اور کیا انسانی جرم ہو سکتا ہے؟ مانا کہ بودلیئر جیسے شاعر متوسط طبقے کی شکست خوردگی کے ترجمان ہیں لیکن وہ اس سے بھی زیادہ انسانی روح کے نمائندے ہیں۔ بودلیئر واقعی متوسط طبقے کی موت کا اعلان کرتا ہے۔ لیکن مارکسی تہذیب کو بھی یہ دھمکی دیتا ہے کہ اگر ازلی و ابدی کا کوئی احساس میرے نظام میں نہ ہوا تو اپنی خارجی "نئی شکلوں" کے باوجود اس تہذیب کا انجام بھی کچھ بہتر نہیں ہوگا۔ جو شاعر یہ کہہ سکتا ہے کہ "میرے ریاکار قاری، میرے ہم شکل، میرے بھائی" وہ صرف متوسط طبقے کا شاعر نہیں ہے بلکہ ازلی اور ابدی انسانیت کا شاعر ہے۔ گورکی جیسے نو دولت لوگ یہ بات آسانی سے نہیں سمجھ سکتے کہ شاعر ذہنی اعتبار سے اپنی تہذیب سے بلند ہو کر زندگی پر غور کر سکتا ہے۔ متوسط طبقے کی تہذیب میں دنیا بھر کی بے ایمانیاں سہی، مگر اس تہذیب نے بہت سے ایسے لوگ بھی پیدا کئے ہیں جن کا کسی طبقے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور وہ صرف محض انسان تھے، اور صرف و محض انسانی زندگی کے متعلق ازلی و ابدی حقائق پیش کر رہے تھے۔ مگر گورکی کے لئے انیسویں صدی کی شاعری میں نہ تو کوئی جمالیاتی قدر و قیمت ہے نہ انسانی معنویت، اور محض اس وجہ سے کہ یہ شاعری ایک خاص وقت اور خاص آدمیوں کے درمیان پیدا ہوئی تھی، لہٰذا یکسر مردود ہو گئی۔

شاعری میں وہ "نئی شکلیں" کیا ہوں گی جنہیں روس کی نوجوان نسل تخلیق کرے گی؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے گورکی کہتا ہے کہ نئی شاعری "دلاورانہ شاعری" ہو گی، کیونکہ روس کی نئی زندگی کا تقاضا یہی ہے۔ ایک حد تک یہ بات ماننے کے قابل ہے۔ واقعی انیسویں صدی کی شاعری میں یاس پرستی اور شکستگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی بلکہ غم آلود جذبات کے اظہار ہی کو شاعری سمجھ لیا گیا تھا۔ واقعی "نئی شاعری" کو اس نسوانیت سے پیچھا چھڑانا چاہئے، اور اسے ایک نئے عزم اور نئی امنگ سے بھرپور ہونا چاہئے لیکن "دلاورانہ شاعری" کے فقرے کو بغیر پوری طرح سمجھے ہوئے قبول کر لینے میں بڑا خطرہ ہے۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ شاعری صرف انسان کی فتوحات اور سربلندیوں کے راگ گائے، اور انسانی زندگی کے کمزور پہلوؤں سے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لے اور

شاعری محض ڈینگ اور بڑبولا پن ہو کے رہ جائے۔ گویا شاعری کا فرض قصیدہ گوئی بن جاتا ہے۔ اور بہت ہی مثبت معنوں میں انسان کی صلاحیتوں اور قوتوں کی جتنی بھی نغمہ سرائی کی جائے کم ہے، مگر جب تک توازن پیدا کرنے کے لیے کوئی دوسرا اصول موجود نہ ہو یہ نغمہ سرائی چھچھورا پن اور منفعت آمیز ہو گی۔ یوں ہونے کو تو ہومر کی شاعری بھی دلاورانہ شاعری ہے۔ مگر کائنات میں انسان کے علاوہ جو دوسری قوتیں کام کر رہی ہیں ان سے غافل نہیں ہے بلکہ کائنات میں انسان کا مقام حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے متعین کئے بغیر ہومر کی شاعری اتنی بڑی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ زندگی کے المناک پہلوؤں کو نظر میں رکھے بغیر شاعری تو شاعری اپنی تہذیب تک اندر سے کھوکھلی ہو گی۔ اسی ضمن میں دوسرا سوال یہ ہے کہ دلاورانہ شاعری کیا صرف فتوحات پر خوشیاں منانے کا نام ہے؟ کیا روحانی جنگ کی شاعری دلاورانہ نہیں ہو سکتی؟ کیا اوڈیپس کی شاعری دلاورانہ شاعری نہیں ہے؟ کیا دلاوری محض خارجی مظاہر کو مغلوب کر لینے پر منتہی ہے، اور اخلاقی جدوجہد جس کے نتائج فوری طور پر مرئی نہیں بن سکتے، دلاوری کے دائرے سے خارج ہے؟

گورکی نے شاعری کی "نئی منزلوں" کی کچھ اور توضیح بھی کی ہے۔ اس نے پرانی شاعری کے تین بڑے موضوع فطرت، محبت اور موت، لئے ہیں۔ اور بتایا ہے کہ ان چیزوں کے بارے میں پرانا رویہ کیا تھا اور نیا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ فطرت کے متعلق پرانے شاعروں کے انداز نظر کی تعریف گورکی نے یوں کی ہے "پرانے شاعر فطرت کی مدح سرائی کیا کرتے تھے۔ کبھی وہ اپنے آپ کو فطرت کا مالک بتاتے تھے اور کبھی "فطرت کے بچے"۔ لیکن درحقیقت، ان کی قصیدہ خوانی غلاموں کی حیثیت سے ہوتی تھی۔ ان کے رویے میں خوشامد اور فطرت کی منافقت ہوتی تھی۔ ان کی نظمیں ایک جابر شہنشاہ کی شان میں قصیدے کی طرح ہوتی تھیں اور ان کا لب و لہجہ بالکل دعاؤں کا سا تھا۔ وہ طوفان، سیلاب، خشک سالی اور فطرت کے دوسرے ظالمانہ افعال کو نظر انداز کر جاتے تھے۔ انہوں نے کبھی انسان کو فطرت سے لڑنے اور اس کو مغلوب کرنے پر نہیں اکسایا اور نہ ہی اس اندھی جابرانہ قوت کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا۔ اب تو روس میں مناظر کی شکل بدلی جا سکتی ہے۔ اور دلدلیں سرسبز باغ بن سکتی ہیں۔ لیکن شاعر ریگستانوں اور دلدلوں کی طرف نظر ہی نہیں اٹھاتے۔ روس کے شاعروں کو اس نئی مہم کے متعلق لکھنا چاہئے۔ اب تو انہیں ایک نیا موضوع مل گیا ہے۔ یعنی فطرت کی ابتدائی قوتوں اور تمام "ابتدائی" چیزوں کے خلاف اجتماعی طور سے منظم عقل کی جدوجہد اور غیر طبقاتی انسان کی تعلیم و تربیت جو ایک "دوسری فطرت" کا خالق ہے اور اپنی قوت ارادی، عقل، تخیل اور جسمانی طاقت کی مدد سے بڑے بڑے کارنامے کرنے والا ہے۔

اب اس پورے بیان کا تجزیہ کیجئے تو نہ صرف طرح طرح کی کج فہمیاں اور خوش فہمیاں نظر آئیں گی بلکہ غلط بیانیاں ملیں گی ـــــ جو شاید دانستہ نہ ہوں بلکہ محض خوش اعتقادی کا نتیجہ ہوں۔ جسے یورپ کی شاعری سے ذرا بھی واقفیت ہے وہ یہ بیان سنتے ہی ہنس دے گا کہ بورژوا شاعری فطرت کے تاریک پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ ممکن ہے کہ فطرت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بورژوا شاعر مایوسی کے بوجھ سے دب گئے ہوں لیکن فطرت کی اندھی قوتوں کے خلاف احتجاج بورژوا شاعری میں موجود ہے۔ ٹینی سن کی نظموں سے مثالیں ہر شخص کو یاد ہوں گی۔ اور انیسویں صدی کی فرانسیسی شاعری سے تو جتنی مثالیں چاہے جمع کئے چلے جائیے۔ اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ بورژوا شاعروں نے انسان کو فطرت سے لڑنے کیلئے کبھی نہیں ابھارا، حالانکہ اس ضمن میں گورکی نے ساری پرانی شاعری کو ملعون قرار دیا ہے، مگر میں جان بوجھ کر شیکسپیئر کا ذکر نہیں کروں گا بلکہ اپنے آپ کو انیسویں صدی ہی تک محدود رکھوں گا۔ کیا براؤننگ کے یہاں کثرت سے یہ عقیدہ نہیں ملتا کہ انسان فطرت پر

فتح حاصل کر سکتا ہے اور اسے فتحیاب ہونا چاہئے؟ کیا فطرت کے متعلق شبتی کا رویہ محض غلاموں کا سا ہے؟ اور فطرت سے لڑائی کا جذبہ تو رومانی ادب میں کافی فراوانی سے ملتا ہے۔ خواہ اس پر انسان کی لازمی شکست کا احساس بھی شامل ہو۔ بورژوا شاعروں نے ہر جگہ اور ہر وقت فطرت کی خوشامد نہیں کی، بلکہ ان کا رویہ (خود ایک ہی شاعر کے یہاں) مختلف اور متنوع رہا ہے۔ جیسا کہ انسانوں کا رویہ ہوتا ہے۔ اگر ریگستانوں کو باغوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے تو یہ بڑی مبارک بات ہے، اور انسان کی عظمت کا ثبوت ہے۔ مگر شاعری کے متعلق بحث کرتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ جو شاعر اس کارنامے کے بارے میں لکھ رہے ہیں ان کا اندازِ نظر کیا ہے۔ ایسے کارناموں کے متعلق قطعہ تاریخ بھی لکھا جا سکتا ہے، اور ایسے نصیحت آمیز شعر بھی

نہر پر چل رہی ہے پن چکی   دھن کی پوری ہے کام کی پکّی

اس کارنامے پر آدمی کو خبر ضروری اور مبالغہ آمیز خوشی بھی ہو سکتی ہے، اور تکبر بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ سوال محض ان کارناموں پر نظم لکھ سکنے کا نہیں ہے۔ بلکہ اس روحانی کلچر کا جو ان نظموں میں نمودار ہوگا۔ اگر انسان ریگستان کو مرغزار بنا کے یہ سمجھ لے کہ بس اب میں وحدہٗ لا شریک ہو گیا، اور میں نے فطرت کو مغلوب کر لیا تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو شداد یا نمرود کا ہوا۔ انسان کے اجتماعی ادراک نے انسانی فطرت کی اس کمزوری کو پہلے ہی سمجھ لیا تھا، اور اس کی تشکیل ان قصوں کی شکل میں کر دی تھی۔ تاکہ گورکی کی نئی شاعری محض انسان کی کارکردگی اور تفاخر کے نشے میں مست رہی اور انسانی زندگی کے المناک پہلو کو بھول گئی تو لات و گزاف بن کے رہ جائے گی۔ انسان کتنی بھی ترقی کرتا چلا جائے اسے آخر میں اپنی بے بسی اور لاچاری سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ خارجی قوتیں تو الگ رہیں خود انسان کے دماغ میں ایسے غول بیابانی کا مسکن ہے جن کے مقابلے میں "اجتماعی طور سے منظم عمل" کی طاقت بھی کارگر نہیں ہوتی۔ اگر انسان نے خارجی حیثیت سے ایک نئی فطرت پیدا بھی کر لی تو اس کا اثر انسان کی روحانی زندگی میں کون سی ایسی تبدیلیاں پیدا کر دیگا کہ جن سے ایک بالکل نیا انسان وجود میں آ جائے؟ اول تو نیا انسان ہی ایسا تصور ہے جس کے بارے میں بہت کچھ بحث کی گنجائش ہے۔ لیکن خارجی عمل سے تو کوئی ایسا انسان پیدا ہو ہی نہیں سکتا جس میں کوئی اعلیٰ درجے کی اخلاقی معنویت ہو۔ جہاں فطرت سے دب کے رہ جانا بڑی بزدلی ہے، وہاں غیر مشروط طور پر فطرت کو مغلوب کر لینے کا عقیدہ بھی ایک قسم کی قنوطیت پرستی ہے۔ فطرت تو خود انسان سے مغلوب ہونا چاہتی ہے مگر اس طرح جیسے کوئی تندرست جسم کی عورت مرد سے۔ فطرت مغلوب ہوتی ہے، مگر خود اپنے تعاون سے، اور اس مجادلے کا نتیجہ کسی ایک کی غلامی نہیں ہوتا، بلکہ قوت اور حسن۔ گورکی کا یہ یقین بالکل مہمل ہے کہ کمیونسٹ تہذیب سے پہلے فطرت کو مسخر کرنے کا خیال کبھی پیدا ہی نہیں ہوا، نو دولت لوگوں نے ہمیشہ یہی سوچا ہے کہ کائنات میں بس ہم ہی ہم ہوں اور کوئی ہمارے برابر کا نہ ہو۔ اور ان تمام لوگوں کی روحانی شکست ہمارے سامنے ہے —— شداد اور فرعون سے لے کر فاؤسٹ تک۔ یہ درست ہے کہ فطرت کو قابو میں لانے کی جتنی صلاحیت کمیونسٹ تہذیب میں ہے اتنی کسی اور تہذیب میں نہیں رہی، لیکن فطرت کی مکمل تسخیر کو اپنا بنیادی عقیدہ بنانا اور انسان سے اوپر کسی اور قوت کو تسلیم نہ کرنا مستقبل کی مایوسیوں اور دل شکستگیوں کا سامان خود فراہم کرنا ہے۔

محبت کے بارے میں گورکی کے بیانات اور بھی فرحت بخش ہیں۔ چت بھی اپنی اور پٹ بھی اپنی۔ ایک طرف تو بورژوا شاعری پر قنوطیت پرستی اور یاس پسندی کا الزام عائد ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ شکایت ہوتی ہے کہ تم ایسی چیزیں کیوں نہیں بیان کرتے جن سے یقین کمزور ہو اور یاس پیدا ہو۔ مقصد محض اتنا ہے کہ بورژوا شاعری کو کسی نہ کسی طرح بُرا کہا جائے۔ چنانچہ

گورکی کا ارشاد ہے ۔ کہ پرانی شاعری "محبت" کو زندگی کی سب سے بڑی تخلیقی قوت سمجھ کر اس کی نغمہ سرائی کرتی تھی لیکن یہ بات نہیں سمجھ سکتی تھی کہ یہ قوت بھی ایک اندھی اور ابتدائی جبلّت ہے۔ یعنی نسل کشی کی جبلّت ، یہ قوت ایسے بہت سے جانور پیدا کرتی ہے جو انسان کی صحت اور معاشی نظام کے لئے بہت ضرر رساں ہیں، مثلاً جوہے، مکھیاں، مچھر (یعنی آپ کو فطرت سے شکایت ہے کہ ہر چیز ہماری سہولت کو مدنظر رکھ کے کیوں نہیں بنائی ؟ یہ وہی خود پرستانہ نظریہ ہے جو ہماری کائنات کا مرکز انسان کو سمجھتا ہے) سرمایہ دارانہ ریاست تو بیماری پھیلانے والے کیڑوں کی طرف سے بے اعتنائی برتتی ہے۔ کیونکہ اسے عوام کی تندرستی کی کیا پروا۔ لیکن مزدوروں کی ریاست ایسی بے پروا نہیں ہوسکتی، وہ فطرت کے تخلیقی عمل کے خلاف جدوجہد کرتی ہے ۔ گورکی اپنی دلیلوں کی کمزوری سے جھینپ کر یہ تنبیہ کرتے ہیں کہ میں شاعروں سے جو ہے مانے کو نہیں کہتا، بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ فطرت کے متعلق شاعری کا رویہ بدلنا چاہئے ۔ دراصل میرے لئے تو اس بیان کا مطلب سمجھنا بڑا دشوار ہے ۔ گورکی کے بیان کا منطقی نتیجہ تو یہی ہوسکتا ہے کہ شاعر محکمۂ صفائی کے لئے نظمیں لکھا کریں۔ اول تو انیسویں صدی کی بورژوا شاعری کو اس سے قطعاً انکار نہیں ہے کہ محبت بھی ایک جبلّت ہے، اور اس جبلّت کے جتنے بھی ضرر رساں اور اندیشہ ناک پہلو ـــــ ذہنی یا جسمانی ـــــ ہوسکتے ہیں بورژوا ادب میں ملتے ہیں۔ لیکن گورکی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس جبلّت نے کچھ ذہنی مناسبات بھی پیدا کر دیئے ہیں، اور جنس جہاں نفسانی خواہش ہے وہاں نفسیاتی تحریک بھی ہے ۔ انسان کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس نے جنسی جبلّت کو سنوارا اور نکھارا ہے، اور نسل کشی کے علاوہ اس سے روحانی تربیت کا بھی کام لیا ہے ۔ ویسے اگر ہر بات کا تاریک پہلو ہی دیکھنا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کمیونسٹ تحریک نے بہت سے موقع پرست لوگ پیدا کئے ہیں جن سے ہیئت اجتماعی کو بہت خطرہ ہے اس لئے یہ تحریک خراب ہے۔ جنسی جبلّت چوہے تو ضرور پیدا کرتی ہے، مگر انسان کی ذہنی، جذباتی اور روحانی زندگی میں کبھی تو کوئی ردّعمل پیدا کرتی ہے، اور شاعری کا تعلق انسان کی روحانی زندگی ہی سے ہے ۔ پھر سوال یہ ہے کہ جب اشتراکی حکومت سارے چوہے مار چکے گی اس وقت انسان کی محبت میں کوئی نئی پاکیزگی آجائے گی ؟

گورکی کا واقعی یہی خیال ہے کہ اشتراکی ریاست میں جنسی تعلقات بنیادی اعتبار سے بالکل نئی چیز ہونگے ۔ اس نے صاف صاف لفظوں میں کہا ہے کہ اشتراکی سماج میں انسانوں کے درمیان نسل کشی کی ابتدائی شکلیں باقی نہیں رہیں گی ۔ اور نہ ایسی شکلیں جو صرف دوسروں کی جسمانی قوت کے بل پر زندہ رہنے والی طفیلی مخلوق کے لئے فائدہ مند ہیں ۔ اس بیان میں کوئی معنی یا مطلب مجھے تو دکھائی دیتا نہیں، مہمل گوئی کی آخری حد یں اس سے آگے اور کیا ہونگی ! سماجی رسم و رواج کی تبدیلیاں بنیادی اور ابتدائی جنسی تعلقات پر کس طرح اثر انداز ہونگی، یہ بات ذرا مشکل ہی سے سمجھ میں آسکتی ہے ۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ بنیادی جبلّت کے اظہار کی شکلیں بدل دی جائیں، وہ کچھ سنور جائیں یا بگڑ جائیں، مگر ابتدائی تعلقات بالکل نئے کس طرح ہوسکتے ہیں جب تک کہ انسان کا پورا جسمانی اور اعصابی ڈھیچر ہی نہ بدلا جائے ۔ خیر اب گورکی کا ایک اور الزام سنیئے ۔ پرانی شاعری نے ہمیں یہ سمجھایا ہے کہ چڑیوں کے گانوں سے پتہ چلتا ہے کہ محبت ہی سے گانے پیدا ہوتے ہیں، واقعی محبت نے آرٹ کی بہت مدد کی ہے ، لیکن عطریات اور عورتوں کے استعمال کی چیزیں بنانے والی صنعتوں کی بھی بہت مدد کی ہے ، یعنی گورکی کا الزام یہ ہے کہ محبت کے جذبے نے سرمایہ داروں کو روپیہ کمانے میں آسانیاں بہم پہنچائی ہیں ۔ میری تجویز یہ ہے کہ ہمیں سورج کی بھی شکایت کرنی چاہئے کہ وہ سرمایہ داروں کے کارخانوں کے لئے روشنی کیوں بہم پہنچاتا ہے : اس کے معنی یہ

ہونے کہ ہمیں کسی چیز کی بھی تعریف نہیں کرنی چاہیئے، اس ڈر سے کہ کہیں سرمایہ دار اس سے فائدہ نہ اٹھالے ہوں یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مزدوروں کی لوٹ کھسوٹ بند ہوجائے گی تو پھر ہر چیز یہ مقدس بن جائے گا۔ اس سے پہلے نہیں۔ محبت کے بارے میں گورکی نے بس ایک بات ایسی کہی ہے جس کے کچھ معنی ہیں۔ وہ یہ کہ بورژوا سماج میں شاعروں نے عورتوں کو دیوی تو بنادیا، مگر ویسے عورت سے جانوروں کا سا سلوک ہوتا رہا۔ روس میں عورت کا درجہ مرد کے برابر ہے، اسے ذہنی آزادی حاصل ہے، اور وہ ہر کام کرسکتی ہے۔ ویسے تو اس بیان پر اعتراضات ہوسکتے ہیں، مگر چلیئے مان لیا کہ روس میں عورتوں کو واقعی ایک باعزت درجہ حاصل ہوگا، چنانچہ شاعری میں اس کا ردِ عمل یہ ہوسکتا ہے کہ نہ تو عورت کو دیوی بنایا جائے اور نہ جانور، بلکہ اپنا ہم رتبہ سمجھا جائے، مگر اس سے ابتدائی جنسی تعلقات کس طرح اثر پذیر ہونگے، اس کی تفسیر تصوف ہی کی مدد سے ہوسکتی ہے! دراصل کمیونسٹوں کی یہ خواہ مخواہ کی ہٹ ہے کہ ہماری ہر بات نئی ہوگی اس ضد میں وہ انسانی فطرت تک کو بدلنا چاہتے ہیں۔ مگر اس کا تصور تک نہیں کرسکتے کہ آخر فطرت کو کس طرح بدلا جائے۔ چنانچہ اس کشمکش میں انہیں ایسی اینڈی بینڈی باتیں کرنی پڑتی ہیں، جو لامحالہ مضحکہ خیز ہوجاتی ہیں۔

گورکی کے نزدیک بورژوا شاعری کا تیسرا بڑا موضوع موت ہے، وہ کہتا ہے کہ موت کے ناگزیر ہونے کا عقیدہ بورژوا سماج کے لئے بہت مفید اور تسلی بخش ہے، کیونکہ اس سماج میں آدمی ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے، اور بہت سے لوگ بالکل زائد اور غیر ضروری ہوتے ہیں، بورژوا ریاست مزدوروں کی صحت اور درازیٔ عمر کے بارے میں نہیں سوچتی۔ اشتراکی ریاست میں صحت کی بڑی حفاظت کی جائے گی۔ یہ سب باتیں مجھے بڑی خوشی سے تسلیم ہیں، مگر کیا اشتراکی ریاست میں موت ناگزیر نہیں رہے گی۔ ہمارے یہاں بڑے بوڑھے کسی مغرور آدمی کو دیکھتے ہیں تو بڑے تاسف اور خوف کے ساتھ کہا کرتے ہیں کہ اپنی موت بھی بھول گیا! یہی کچھ کمیونسٹ تہذیب کے ساتھ بھی ہورہا ہے، جس کائنات میں صرف انسان ہی انسان رہ جائے وہ صرف بے رنگ ہی نہیں، انحطاط پذیر کائنات ہوگی۔ شاعری میں تو واقعی یہ بات بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے کہ ایک دن انسان موت پر بھی غالب آجائے گا۔ لیکن ایک علمی قسم کے مضمون میں یہ بات کہنا، اور اس اصول کو نئی شاعری کی بنیاد بنانا بڑی خطرناک صورت حال ہے۔ انسان کے اثباتِ خودی کی بھی کوئی انتہا ہونی چاہیئے، ورنہ اس کا نتیجہ اسی بدیقینی اور ناامیدی کی شکل میں برآمد ہوتا ہے جو بالکل بنجر اور بے ثمر ہے۔ انسان اگر موت پر غالب آسکتا ہے تو اپنی روح کے ذریعے، نہ کہ جسم کے ذریعے۔ اگر آپ نے مزدوروں کی عمر پچاس ہزار سال بھی کردی تو کیا۔ آخر تو موت ہے! المیہ سے اتنا بچنا کہ تصور تک میں اس کا سایہ نہ پڑے خود بزدلی اور پست ہمتی کی نشانی ہے۔ کمیونزم پر یہ ایک زہرناک طنز ہے کہ یہ اجتماعی خیر کا فلسفہ بدترین قسم کی خودغرضی پر ختم ہوتا ہے۔ انفرادی زندگی کو قابلِ قدر سمجھنا تو لازمی ہے۔ مگر انفرادی زندگی کی بقا کو فلسفۂ زندگی کی بنیاد بنانا خود اپنی تہذیب کی شکست و ریخت کا سامان فراہم کرنا ہے۔ بات یہ ہے کہ کمیونزم نے جسم کی ضرورتوں کا تو مطالعہ کیا ہے۔ اور ان کی تشفی کا خیال رکھا ہے لیکن روحانی کلچر سے پہلے تو انکار کیا، اور جب انکار ناممکن ہوگیا تو الم غلم بھرتی شروع کردی، مذہبی اور کلچری روایتوں سے رشتہ توڑنا ایسا بے ضرر کام نہیں تھا جیسا کمیونزم نے سوچا تھا۔ جس طرح سائنسدانوں نے غلطی کی تھی کہ شروع میں تو فلسفے اور مذہب سے بے اعتنائی برتی، لیکن چونکہ مظاہرِ فطرت اور سائنس کی دریافتوں میں بذاتِ خود کوئی انسانی قدر و قیمت اور معنویت نہیں ہوتی اس لئے چیزوں کے متعلق اپنا رویہ متعین کرنے کیلئے انہیں کسی نہ کسی فلسفے کی ضرورت پڑی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفیانہ مسائل میں درک نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے بغیر کسی تنقید کے

کاوش کے مروجہ فلسفیوں میں سے کسی ایک کو قبول کر لیا۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اچھے خاصے سائنسدان غیر سائنسی معاملات میں بڑے توہم پرست ہوتے ہیں۔ یہی حال مارکسیوں کا ہوا۔ انہوں نے فوری ضرورتوں سے مجبور ہو کر ایسے اندازِ نظر قبول کر لئے جو بالکل بے جوڑ ہیں۔

گورکی نے شاعروں کو آخری ہدایت یہ کی ہے کہ انہیں سائنس کے کارناموں اور بڑے بڑے سائنسدانوں کے بارے میں لکھنا چاہیئے، کیونکہ سائنس کے ضمن میں انسان کی سرگرمیاں دوسری سرگرمیوں سے زیادہ اس بات کی مستحق ہیں کہ انسان ان پہ اپنی توجہ، اپنی حیرت اور اپنی دردمندی صرف کرے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی یہ سرگرمیاں بھی عزت کے لائق ہیں اور سائنسدانوں کے کارنامے اس قابل ہیں کہ ان پہ نظمیں لکھی جائیں۔ لیکن ان چیزوں کو نئی "دلاورانہ" شاعری کا اہم ترین موضوع قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہر اس چیز کو اہم سمجھا جا رہا ہے جس کا تعلق انسان کی خارجی زندگی سے ہے۔ یوں ہونے کو تو ہر چیز شاعری کا موضوع بن سکتی ہے لیکن بڑی شاعری کا موضوع اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک کہ اس میں وہ عناصر نہ مل جائیں جن کا تعلق انسان کی ذہنی اور جذباتی اور روحانی زندگی سے بہت گہرا اور بامعنی ہو۔ کوئی خارجی کارنامہ بذاتِ خود بڑی شاعری کا موضوع نہیں ہوتا بلکہ اس کی انسانی معنویت۔ مگر مارکسیت ابھی تک اس کج فہمی میں مبتلا ہے کہ خارجی افعال اور مظاہر بذاتِ خود اہم ہوتے ہیں۔ اسی غیر تنقیدی رویئے کا نتیجہ ہے کہ روس کی کمیونسٹ تہذیب میں ایسے عناصر پیدا ہو چکے ہیں جو قبائلی تہذیب کی خصوصیات میں سے ہیں۔ روس کی نئی تہذیب کے مادی کارنامے جتنے شاندار ہیں ان کے مقابلے میں روحانی کارناموں کی حیثیت بہت معمولی ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ زبردست کلچری کارنامے خارجی فتوحات کی مدد سے وجود میں نہیں آتے بلکہ بامعنی اور حقیقت پرستانہ اور متوازن انسانی رویئے کی بدولت۔ اگر گورکی کو نئی شاعری کے لئے ایک راہِ عمل متعین کرنی تھی تو جہاں شاعروں کو پرولتاری دور کے شاعر سمجھ کر غور کیا تھا، وہاں تھوڑی بہت دیر کے لئے انہیں انسانی سمجھ کر بھی سوچنا چاہئے تھا۔ اسی طرح بورژوا شاعروں کے خلاف تعصب نہیں برتنا چاہئے تھا، اور فرض کر لینا چاہئے تھا کہ شاید ڈھونڈنے سے ان مجہول شاعروں میں بھی کوئی مستقل اقدار نکل آئیں۔ اور کچھ نہ سہی، اتنی بات تو بورژوا اور پرولتاری دونوں قسم کے شاعروں میں مشترک ہے کہ دونوں ایک طرح پیدا ہوتے اور ایک طرح مرتے ہیں۔ اتنی بات ہی ان کی زندگی کے اقدار میں بہت سی یکساں چیزیں پیدا کر دیتی ہے۔ جو لوگ غیر طبقاتی سماج قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ان میں کم سے کم یہ صلاحیت تو ہونی چاہیئے کہ بعض پہلوؤں سے ادب کی پوری تاریخ پر انسانی اور غیر طبقاتی کارنامے کی حیثیت سے غور کر سکیں۔ نئی شاعری اگر پیدا ہو سکے تو ہم اسے سر آنکھوں پر رکھیں گے، لیکن اس نئی شاعری کو "پرانے انسان" کے متعلق ضرور کوئی قابلِ قدر بات متانت کے ساتھ کہنی ہوگی، ورنہ کسی نئی شاعری کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے —— کمیونسٹ تہذیب میں عوام کی کلچری تربیت کے لئے محکمۂ زراعت اور محکمۂ صحت وغیرہ کی طرف سے قائم کی ہوئی ناٹک منڈلیاں کافی ہیں۔

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

وقار عظیم

ادب اور پاکستانی ادیب

زندگی، ادب اور ادیب —— تینوں ایک مسلسل زنجیر کی اہم کڑیاں ہیں۔ ادب زندگی کا عکاس، اس کا ترجمان، اس کا مفسّر اور نقاد ہے۔ زندگی کے رنگ کے ساتھ ادب کا رنگ بدلتا ہے، اور زندگی کے انقلابات سے ادب میں انقلاب پیدا ہوتے ہیں۔ اور بدلتی ہوئی زندگی اور ادب کو ایک رشتے میں پرونے کا کام ادیب کرتا ہے۔ وہ مشاہدہ اور مطالعہ میں فکر و تخیل کی رنگ آمیزی کر کے زندگی کو ادب بناتا ہے۔ اسی چیز کا دوسرا نام زندگی کی عکاسی، ترجمانی، تفسیر اور تنقید ہے۔ لیکن زندگی اور ادب کا تعلق یہیں نہیں ختم ہو جاتا۔ زندگی ادب کی تشکیل میں اپنا کام کر چکتی ہے تو ادب کا کام شروع ہوتا ہے۔ وہ شخصی اور قومی زندگی پر غیر محسوس طریقے سے اپنا اثر ڈالتا ہے۔ اچھے ادب کا کام یہ ہے کہ وہ فرد کو سماجی زندگی، اور اس کے نظام سے متوازن ہونے میں مدد دے، اور جماعت کو اس کی تمدنی اور سماجی زندگی میں بہتری کی راہیں دکھائے۔ ادب فرد اور جماعت کے درمیان رابطہ اور توازن پیدا کرنے کا بہترین وسیلہ بھی ہے، اور فرد اور جماعت کو ان کی کوتاہیوں اور غلطیوں سے باز رکھنے کا تازیانہ بھی۔ زندگی میں جو کچھ اچھا ہے اس کا حامی اور مددگار اور جو کچھ برا ہے اس کا نکتہ چیں اور پردہ در۔ ادیب چونکہ ادب کا خالق اور اس کے بلند مقاصد کا امانت دار ہے، اس لئے فرد اور جماعت کی زندگی میں اس کی حیثیت بڑی نازک اور ذمہ دارانہ ہے۔ ادیب عموماً اپنے منصب کی ان ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتے۔ کسی ایسے زمانہ میں جب زندگی اور اس کے ادارے اپنے معمولی نہج پر چل رہے ہوں اس بے نیازی کے لئے کچھ جواز تلاش کئے جا سکتے ہیں، لیکن ایک ایسے دور میں جس سے ہماری زندگی اس وقت گذر رہی ہے ادیب کے منصب کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ اس وقت فرد اور جماعت دونوں کی زندگی میں شدید انتشار اور اضطراب ہے۔ اس لئے کہ انسان کو دنیا میں جو کچھ عزیز ہے وہ اس سے چھن چکا ہے۔ اس کا وطن اس وطن کی ساری مادی آسائشیں اور اس کے ساری جذباتی اور روحانی متعلقات۔ اب جو کچھ اس سے بھی زیادہ عزیز ہے وہ خطرہ میں ہے —— تہذیب، تمدن، ادب، زبان، مذہب، اخلاق۔ یہ ساری چیزیں اس کے اسلاف کی جد و جہد اور کاوش کی یادگاریں ہیں، اور اس تک ایک قابلِ فخر میراث کی صورت میں پہنچی ہیں۔ وہ صدیوں کی اس میراث کو یوں آن کی آن میں ختم ہوتے دیکھ رہا ہے۔ ماضی کی یادیں اس کے لئے خواب و خیال بننے والی ہیں، حال میں سوائے انتشار کے کچھ نہیں۔ اور مستقبل میں امید کی ایک کرن کی بھی جھلک نہیں۔ اس صورتِ حال نے اسے مایوس اور مضمحل کر دیا ہے۔ اس مایوسی میں حد درجہ کی بے حسی ہے —— مایوسی اور بے حسی کی اتنی ارزانی شاید اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی ہو۔

انتشار کی دنیا میں قدروں کا سارا نظام تہ و بالا ہو گیا ہے۔ انسانیت پر وحشت و درندگی کا غلبہ ہے محبت پر نفرت مستولی ہے۔ نیکیوں پر بدیوں کا پردہ پڑ رہا ہے۔ اور رجعت کی قوتیں ان حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ استحصال مجبوروں اور بے بسوں کی مجبوری اور بے بسی کی بنیادوں پر اپنے ایوان کی تعمیر میں مصروف ہے۔ رجعت پسندی اگر اسی طرح بغیر کسی روک ٹوک کے مصروفِ عمل رہی تو زندگی کے سارے نظام پر ان کی قدروں کا قبضہ ہو جائے گا، اور اخلاق کی قدروں

کا وہ سارا نظام جس کی تشکیل و تعمیر میں صدیاں لگی ہیں درہم برہم ہو جائے گا۔ اجتماعی زندگی کے معاشی معیار بدل جائیں گے۔ انفرادی طور پر جب لوگ جبر اور استحصال کا کھلونا بن جاتے ہیں تو بے بسی ان کے ذہنوں پر جمود طاری کر دیتی ہے۔ اور جمود ارادے کی بلندی اور عمل کی قوت کا دشمن ہے۔

حالات کی یہ تصویر بڑی حوصلہ شکن ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو سماج کا فرد ہونے کی حیثیت سے تصویر کے اس رنگ کو بدلنا ہے۔ لیکن ہم میں سے ان کی۔ جو کسی نہ کسی طرح ادیبوں اور شاعروں کے زمرہ میں آتے ہیں ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔ ہم قوم کے ادبی اور تمدنی سرمایہ کے وارث ہیں۔ ہم تک پچھلوں کی امانت اس لئے پہنچی ہے کہ ہم اس میں اپنا حصہ شامل کر کے اس امانت کو آنیوالے حقداروں تک پہنچا دیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم ان حالات میں عمل کی کونسی راہ اختیار کریں کہ صدیوں کی یہ بیش بہا امانت محفوظ رہے اور زندگی کی ان قدروں کو جو اسے امن سکون اور سلامتی کا گہوارہ بناتی ہیں پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ اور انسان اس دنیا میں رہ کر محبت اور خدمت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو اور ہر شخص وہ بن سکے جو بننے کی صلاحیت قدرت نے اس میں ودیعت کی ہے۔ دنیا میں آزادی کا بول بالا ہو، ایک کی آزادی دوسرے کی آزادی کو کچل دینے کے بجائے اسے آزادی لینے میں مدد دے۔ یہ کام ادیبوں کے لئے ہمیشہ ضروری تھا۔ لیکن ہمارے خاص حالات میں اس کی اہمیت ہمیشہ سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس لئے کہ انتشار نے ان ساری اچھی چیزوں کے لئے جن کی ہم نوائی اچھا ادب کرتا رہا ہے بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔

سماج کے بدلتے ہوئے نظام یا غیر معمولی سماجی اور معاشی حالات کے بحرانی دوروں میں ادیبوں اور شاعروں نے عموماً تین چار راہیں اختیار کی ہیں ـــ ایک راہ تو بے بسی اور بیچارگی کی ہے۔ اس راہ پر آدمی اس وقت چلتا ہے جب اس کے نزدیک پناہ کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ اس راستہ میں مایوسی کا جذبہ بے بسی اور بیچارگی کی تخلیق کرتا ہے۔ دوسری راہ یہ ہے کہ شاعر یا ادیب حقیقت کی تلخیوں سے گھبرا کر اپنے لئے شیرینی اور رنگینی کی ایک الگ دنیا بساتا ہے۔ اور گرد و پیش کی سختیوں اور تلخ کامیوں سے بے خبر اپنی خلق کی ہوئی اس دنیا میں کھو جاتا ہے۔ تیسرا راستہ یہ ہے کہ آدمی اپنی سہولت کے لئے زندگی کو تھوڑے بہت ردّ و بدل کے بعد قبول کر لے اور اپنی حالت پر شاکر ہو جائے۔ اس صورت میں ضمیر کی ملامت سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ اور تلخیاں بھی کسی حد تک گوارا بن جاتی ہیں۔ چوتھی راہ سخت بھی ہے اور آزمائشوں سے پُر بھی۔ اس راہ پر چلنے والے حال کی تخریب میں مستقبل کی تعمیر کے پہلو نکال لیتے ہیں۔ سنگلاخ زمینوں پر ٹھوس اور سنگین عمارتیں بنانے کے وسائل تلاش کرتے ہیں۔

ان ساری راہوں میں صرف آخری راہ ایسی ہے جس پر چل کر ماضی کی یادگاریں محفوظ رہ سکتی ہیں، حال کی زندگی گوارا بن سکتی ہے اور مستقبل کی طرف سے امیدیں قائم کی جا سکتی ہیں۔ اس وقت ادب کو خرد اور جماعت دونوں کی رہنمائی کا کام اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ جہاں تک فرد کا تعلق ہے اس کا سب سے بڑا عارضہ وہ مایوسی ہے جو اسے ماضی سے بے تعلق کر رہی ہے جس نے اسے اپنے حال کو شبہ کی نظر سے دیکھنے کا عادی بنا دیا ہے۔ اور اس کے سامنے مستقبل کی تاریک اور بھیانک تصویریں پیش کرتی ہے۔ ادیب کو یہ کوشش کرنی ہے کہ کسی طرح انسان کی یہ مایوسی دور ہو۔ وہ ماضی کے غم سے نڈھال رہنے کے بجائے آنیوالے اچھے زمانہ کو قریب سے قریب تر لانے میں مدد دے۔ اور اس بلند نصب العین کے حاصل کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں گی ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی جرأت اور ہمت پیدا کرے۔ یہ ساری باتیں محض ناصح، خطیب اور واعظ بن کر کہنے میں کوئی فائدہ اور اثر نہیں۔ ضرورت ہے کہ ادیب محض جذباتی بننے کے بجائے حقائق پر نظر رکھیں۔ واقعات کی منطقی تحلیل و تجزیہ کریں اور ان کے اسباب و علل پر غور کرنے کے بعد اپنے ادبی نتیجے مرتب کریں۔ پچھلے چند مہینوں کے غیر معمولی حالات نے

اخلاقی قدروں کی ساکھ میں فرق پیدا کر دیا ہے۔ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے تخریبی قدروں کو تعمیری قدروں پر غالب آتے دیکھا۔ عدل، انصاف، محبت، مروت، اخوت، انسانیت، دردمندی اور رواداری کی جگہ ظلم، جبر، نفرت، حقارت، وحشت بربریت کی فتح ہوئی۔ اور جنہیں تعمیری قدروں پر بھروسہ رکھنے کی تعلیم ملی تھی انہیں یہ محسوس ہوا کہ وہ اب تک ایک زبردست فریب میں مبتلا تھے۔ ان فریب خوردہ مجبوروں کے دل سے یہ خیال نکالنا ہے۔ انہیں یہ بتانا ہے کہ تعمیری قدروں کی شکست عارضی ہو سکتی ہے مستقل ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اور انسان کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ ان پر ایمان رکھے۔ اور ہر حال میں صرف انہیں فکر و عمل میں اپنا رہبر بنائے۔ لیکن قدروں کی بگڑی ہوئی ساکھ قائم کرنے کے علاوہ ادیب کے ذمہ اس سے بھی بڑی خدمت یہ ہے کہ وہ ان قدروں کی نئے سرے سے ترتیب کرے۔ اخلاق کی اچھی قدریں ہمیشہ اچھی ہیں۔ لیکن زمانہ کی ضرورتوں کے ساتھ ان کی اہمیت میں کمی زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ کس وقت کس قدر کو دوسری قدر کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دی جائے اور کس حالت میں کس قدر کو پہلے اور کسے پیچھے رکھا جائے، یہ سوال یوں معمولی حالات میں بھی ذہن کے سامنے رہنا ضروری ہے۔ لیکن ایک سخت بحرانی دور میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اس لئے ہمیں نظام اقدار کا نئے سرے سے جائزہ لے کر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ موجودہ حالات میں قدروں کے کیا مدارج قائم کئے جائیں۔ کون سی قدریں ایسی ہیں جو دوسری قدروں کے مقابلہ میں سوسائٹی کی تنظیم اور مستقبل کی معاشی زندگی کی تعمیر میں زیادہ ممد ثابت ہوں گی۔ افراد کے ذہنوں میں ان قدروں کے نقوش دوسری قدروں کے مقابلہ میں زیادہ ابھارے جائیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ دو ضروری کام اور بھی ہیں ـــ۔ ایک تو یہ کہ ہمارے ذہن میں مستقبل کی سوسائٹی کا کوئی نقشہ اور خاکہ ہو، ہم یہ سوچیں کہ اسکی تنظیم کس نہج پر ہوگی۔ اور اس کا معاشی نظام کس سانچے میں ڈھالا جائے گا، اس میں فرد کی صلاحیتوں کو کس حد تک ابھرنے کا موقع ملے گا اور اس کی آزادی کو کس حد تک آزادی سمجھا جائے گا۔ موجودہ حالات میں سوسائٹی کا کوئی معین اور مرتب نظام نہیں ادیب کو اس نظام کے تعین اور ترتیب میں بھی حصہ لینا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ فرد کے ذہن کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ وہ اپنے آپ کو اس نئے آنے والے نظام سے ہم آہنگ کر سکیں۔ فرد جب تک اپنے آپ کو معاشرے کے نظام کے سانچے میں نہ ڈھال سکے یا اپنی شخصیت اور معاشرے کی حیات اجتماعی کے درمیان تطابق اور توازن نہ پیدا کر سکے وہ نہ اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے نہ قوم کے لئے مفید بن سکتا ہے۔ آج کل کے حالات نے فرد اور معاشرے میں جو بُعد پیدا کر دیا ہے وہ فرد کی ذہنی زندگی پر بھی برے اثر ڈال رہا ہے اور اس سے حیات اجتماعی کی جڑیں بھی کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ ادیب کا ایک بڑا کام فرد اور جماعت کے درمیان اس ہم آہنگی کی کوشش ہے۔

مختصر یہ کہ موجودہ صورت حال میں ادیب کے منصب کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے راستہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں سب سے پہلے تو ہمیں ان رجعت پسند قوتوں کا مقابلہ کرنا ہے جنہوں نے حالات کے رُخ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر استحصال کی سرگرمیوں میں سے پہلے سے کہیں زیادہ شدت پیدا کر دی ہے۔ ان قوتوں نے ہمیشہ ذاتی اغراض اور نفع کی خاطر انسانی فلاح و بہبود کی تحریکوں اور قدروں کے راستے میں روڑے اٹکائے ہیں۔ موجودہ حالات میں انہیں اور بھی زیادہ آزادی سے ہاتھ پیر پھیلانے کا موقع ملا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ادیب اس تخریب کے سامان کو مٹانے کے لئے اپنی زیادہ سے زیادہ قوت سے کام لیں۔ اور اپنے اپنے مسلک کے اختلافی مسائل کو بھول کر پوری یک جہتی سے نیکی کو بدی پر فتحیاب ہونے میں مدد دیں۔

پاکستان کے ادیبوں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو پاکستانی علاقوں کے رہنے والے ہیں، اور بہت سے ایسے ہیں جو اپنا سب کچھ قربان کرکے پاکستان آئے ہیں پچھلے دنوں کے واقعات، موجودہ صورتِ حال اور پاکستان کے مستقبل کے متعلق دونوں کے مطمحِ نظر میں تھوڑا بہت فرق ہے۔ مطمحِ نظر کا یہ اختلاف فطری ہے۔ لیکن اس کے باوجود دونوں کو کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنا ہے، سر جوڑ کر بیٹھنا ہے۔ اور اپنی ذاتی پسند اور ناپسندیدگی کے نازک احساسات کو بالائے طاق رکھ کر ایک بلند نصب العین حاصل کرنے اور اس نصب العین کی آخری منزل تک پہنچنے میں اپنی پوری قوت صرف کرنی ہے۔

اس بلند نصب العین کے حصول کے لئے ادیبوں کو ان سارے اصنافِ ادب سے کام لینا ہوگا جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ اثر پیدا کر سکتے ہیں۔ ان اصناف کے ذریعہ ہمیں لوگوں کی ذہنیت بدلنی ہے، ان کی مایوسی میں امید کا رنگ بھرنا ہے۔ بے بسی اور بیچارگی کے احساس کے خلاف جنگ کرنی ہے۔ پُر عظمت اور پُر شکوہ ماضی کی روشنی میں امید افزا مستقبل کی تعمیر کرنی ہے۔ یہ سب کچھ ایسے ادب کی تخلیق سے ہو سکتا ہے جو موضوع اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے ولولہ انگیز اور کیف آفرین ہو، ماضی کی عظمتوں کا آئینہ دار ہو، مستقبل کے حوصلوں کی ترجمانی اور ہر اس قوت سے جنگ کرنے کو اپنا مسلک جانتے جو ولولہ کیف، حوصلہ اور امید کی راہوں میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ انسانیت کی قدروں کو نیچے دبا کر استحصال کی اقدار کو ابھارتا ہے لوگوں کو بدامنی اور قانون شکنی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس کام کے لئے ہمیں اپنے اندازِ فکر کے علاوہ اندازِ بیان میں بھی انقلابی تبدیلیاں پیدا کرنی ہوں گی —— اظہار کے صرف ایسے وسیلے اختیار کرنے پڑیں گے جو نشاط، کیف اور ولولہ کی آوازوں کو زیادہ بامعنی اور پُر حقیقت بنا سکیں۔

ادب اور ادیب کے رشتہ کے متعلق اتنی باتیں کہنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ میں ان حدود میں داخل ہو گیا ہوں جہاں ادب کو پراپیگنڈے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ "پروپیگنڈا" کا لفظ چونکہ سیاسی لغت کا لفظ ہے۔ اس لئے اس کا استعمال ادبی ماحول میں گراں سا گزرتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے اس جگہ یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ اور اس سوال کے جواب میں کہ کیا ادب کو پروپیگنڈے کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے صرف دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ ہر ادب کسی نہ کسی پہلو سے پروپیگنڈا ہے۔ ہر ادیب کسی نہ کسی تمدنی، معاشی یا اخلاقی قدر کی حمایت کرتا ہے، اسے دلوں میں جاگزیں کرنا چاہتا ہے اور اس طرح وہ پروپیگنڈا کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس وقت ہم زندگی کے جس دور سے گذر رہے ہیں وہ جہاں ایک طرف معاشی، تمدنی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بے حد خطرناک اور ہلاکت آفریں ہے وہاں وہ خود ادب کے مستقبل کے لئے بھی سمِ قاتل ہے اس طرح کے حالات میں اچھا یا بُرا کسی طرح کا ادب بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر ادیب ایسے حالات کو بدلنے کے لئے ادب کو پروپیگنڈے کا ذریعہ بناتے ہیں تو وہ کوئی سیاسی پروپیگنڈا نہیں کرتے بلکہ اپنی حیات و بقا کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ادیبوں کو زندہ رہنے کا حق ہے، انہیں ادب کی تخلیق کا حق ہے، وہ زندگی کے کسی ایسے نظام کو بدلنے کے لئے جس میں نہ ان کی زندگی محفوظ ہے نہ ادب کی، اگر آواز اٹھاتے ہیں تو ان پر پروپیگنڈے کا الزام نہیں آتا، وہ زمانہ سے زندہ رہنے کا حق مانگ رہے ہیں، ایسے حالات کے طلبگار ہیں جو اچھا ادب پیدا کرنے کے لئے سازگار ہوں۔

ایک بیحد اہم سوال کے یہ سیدھے سادے اور بظاہر غیر منطقی اور جذباتی جواب ممکن ہے انہیں مطمئن نہ کر سکیں جو سبیلِ حوادث کی زد سے باہر ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود ہم بھی ان جوابوں سے کئی شرطوں کے ساتھ مطمئن ہو سکتے ہیں۔ جب تک ادیب وہ شرطیں پوری نہ کریں جن کے پورا کئے بغیر ادب اور پروپیگنڈے کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔

اعتراض کے وزن اور شبہ کی تلخی میں کمی نہیں آسکتی۔ اگر پاکستانی ادیبوں نے محض بقا اور حیات کی جدوجہد کو عذر بنا کر ادب کو ہر طرح کے رطب و یابس کا مجموعہ بنانا شروع کر دیا تو اس سے ادب کو بھی نقصان پہنچے گا، اور اس مقصد کو بھی جس کے لئے اس ادب کی تخلیق کی جا رہی ہے۔ جس ادب میں فن کی نزاکت، تازگی اور شگفتگی نہیں ہوگی وہ کسی کے دل پر اثر نہیں کرے گا۔ اور جو چیز دل کو اپنا نشانہ نہ بنا سکے وہ مستقبل کی معمار نہیں بن سکتی۔ اس لئے اس نازک موقع پر ایک خاص مقصد کے لئے ادب کی تخلیق کرتے وقت ادیبوں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ فن کی ہر ذمہ داری سے بالاتر ہیں۔ جو فن زندگی کے حسن کا مصور، اس کی بلند قدروں کا حامی اور انسانی مسرت و شادمانی کا ضامن بننا چاہتا ہے اس کی سب سے پہلی قدر حسن ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ادب کا منصب ہر نئے زمانہ میں وقت کی ضرورت اور تقاضے کے مطابق بدلتا رہتا ہے، لیکن اس کا راستہ نہیں بدلتا، اس کے جمالی عنصر میں کمی یا ترمیم و تنسیخ کا سوال ہرگز پیدا نہیں ہوتا، جب تک کہ یہ ترمیم یا تنسیخ حسن کو اور زیادہ حسین بنانے کے لئے نہ ہو۔ ادب پروپیگنڈا ہے، اس کا ایک مقصد ہے، لیکن ایسا پروپیگنڈا جو حسن و جمال کی بنیادوں پر قائم ہے اور ایسا مقصد جو خارجی عناصر کو داخلی نزاکتوں سے مزین کرتا ہے۔ ادب زندگی کے خارجی عناصر اور فطرت کے داخلی کیف و سرور کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے جو ادب حسن کی راہ سے بھاگ کر زندگی کے کسی بلند نصب العین کی حمایت کرنا چاہتا ہے وہ ادب نہیں —— ہم ادیبوں کو اپنی اس پابندی کو ذہن میں رکھنا ہے۔ ادب کا یہ پہلا قدم ہے۔ اس کے بعد اور بھی کئی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں جب ادب ظہور میں آتا ہے۔ ادیب نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا ہے اسے ویسا کا ویسا ہی ادب میں پیش کر دینا ادیب کے فن اور اس کے منصب کے منافی ہے۔ دیکھی ہوئی چیزوں میں سے ایسے مناسب اجزا کا انتخاب کرنا جو فن کار کے نزدیک اس کی فنی تخلیق کو زیادہ سے زیادہ موثر بنا سکیں فن کی ایک ضروری شرط ہے۔ زندگی کو دیکھ کر اس کا تجزیہ کئے بغیر اسے قبول کر لینا اور فن کا موضوع بنانا فن کے مبادیات کے بھی خلاف ہے —— ایک چیز اور ہے۔ وہ یہ کہ شاعر اور ادیب کسی بات کو اگر خود دل سے قبول نہیں کرتا تو اس بات کی بنیاد پر پیدا کئے ہوئے ادب سے وہ دوسروں کو بھی ہرگز متاثر نہیں کر سکتا۔ اس لئے اگر پاکستانی ادیب فرد اور معاشرے کے مستقبل کو فنا کے طوفان سے بچانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے انہیں ایمان کی حد تک اس بات پر یقین پیدا کرنا ہوگا کہ قوم کے مہلک مرض کا جو نسخہ انہوں نے تجویز کیا ہے وہ واقعی مفید بھی ہے۔ اس یقین کے بغیر ادب سے وہ خدمت نہیں لی جا سکتی جس کی ہمیں آزمائش کے اس وقت میں ضرورت ہے۔ ہمیں اپنا نصب العین حاصل کرنے کے لئے جو ادب پیدا کرنا ہے اسے پروپیگنڈا ہونے کے باوجود ادب کی ساری حسین و جمیل قدروں کا حامل ہونا چاہیئے —— اور اس کے لئے ادیب کو ہر طرح کی ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی سخت جھیلنی ہوگی۔

اس اہم کام میں اتنی سختیاں اور دشواریاں ہیں لیکن بہت سی آسانیاں بھی ہیں —— اور ان میں سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ اس وقت سوسائٹی کا ہر فرد بے بسی اور بیچارگی میں کسی تنکے کا سہارا ڈھونڈھ رہا ہے۔ ایک ایسے زمانہ میں جب اس کے لئے ماضی، حال اور مستقبل میں سے کسی کے تصور میں بھی امید کی کرن کی جھلک نظر نہیں آتی۔ ادیب کی دکھائی ہوئی راہ اس کے لئے سب سے سیدھی اور سب سے یقینی راہ ہوگی جب وہ ہر چیز سے مایوس ہو چکا ہے امید کا ہلکا سا دیا بھی اس کے لئے شمع ہدایت بن سکے گا۔ اور جب اس کا دل غموں کے بے پایاں بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہے نشاط و طرب کا ایک نغمہ بھی اس کے لئے بیداری کا پیامبر ہوگا۔

جب لکھنے اور پڑھنے والوں کے احساسات میں اس درجہ اشتراک ہو تو ادیب کا کام بے حد آسان ہو جاتا ہے۔

ادیب ناظر کا ہمراز وہم نوا بن کر اس کے ذہن کو ایسے نہج پر ڈال سکتا ہے جو اس کے نزدیک مستقبل کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ ممد ہو سکے۔ شاعر اور ادیب جب اپنی کوئی بات سامع اور ناظر کے ذہن تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اور اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کی بات زیادہ سے زیادہ اثر انداز بھی ہو تو وہ مختلف فنّی وسائل سے ذہن کو آنے والی بات کے لئے تیار کرتا ہے —— یہ نفسیات اور فن کا ایک باریک نکتہ ہے۔ ادیب کو موجودہ حالات میں یہ نکتہ خود بخود ہاتھ آگیا ہے۔ اسے ذہن کو کسی چیز کے لئے تیار نہیں کرنا ہے۔ ذہن پہلے سے تیار ہیں۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ اس تیاری اور آمادگی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اگر ہم نے یہ چیز ذہن میں رکھی تو ہماری باتیں تیر ونشتر کی طرح سیدھی دل میں اتریں گی اور ہم مستقبل کی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لے سکیں گے۔

بات بہت بڑھ گئی۔ لیکن بات ہی ایسی تھی کہ اسے بڑھ جانا چاہئے تھا۔ لیکن ابھی کہنے کی ایک بات اور رہ گئی —— ہم ادیبوں میں سے اکثر کی حالت یہ ہے کہ کچھ لکھنے کے لئے جس امنگ اور ولولہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ مفقود ہے۔ سیاسی اور معاشی حالات نے طبیعتوں میں ایسی پژمردگی پیدا کر دی ہے کہ وہ ادبی تخلیق کی طرف مائل ہی نہیں ہوتیں۔ ایک بیزاری ہے جو ہر چیز کو چھوڑ کر کسی گوشۂ عافیت کی تلاش کے لئے بے چین کرتی ہے۔ شاید ہم میں سے بہت سے یہ بھی سوچ رہے ہوں کہ جو طوفان آیا ہے اس سے نظر بچا کر بیٹھ رہیں اور طوفان کو گذر جانے دیں۔ چھپ کر بیٹھ رہنے والوں کو شاید یہ خبر نہیں کہ یہ طوفان انہیں سب سے پہلے سمیٹے گا جو اس کے مقابلہ سے گھبراتے ہیں —— ہر فرد کو اس طوفان کا مقابلہ کرنا ہے جس میں اس وقت ہماری کشتی پھنسی ہوئی ہے۔ ادیبوں کی ذمہ داری باقی ہر فرد سے کہیں زیادہ ہے —— اپنی بقا کے لئے دوسروں کی بقا کے لئے، اپنے تمدن اور تہذیب کے لئے، اپنے ادب اور زبان کے لئے، اخلاق اور انسانیت کے لئے —— پاکستانی ادیب اس ذمہ داری کو پورا کریں گے

هنس راج رهبر

سیاست اور ادب کا ایک نیا سنگم بناتا ہے اور اپنے تازہ ترین افسانوں کا

مجموعہ

نیا اُفق

پیش کرتا ہے

رہبر اپنے افسانوں میں تخیلی سانچے نہیں بناتا بلکہ احساس اور حقیقت سے جیتی جاگتی تصویریں بناتا ہے۔ اس کا فن اور اسلوب سماج کی تلخ ترسچائیوں کا آئینہ دار ہے، وہ عوامی دکھوں عوامی خواہشوں اور عوامی ذہنوں میں اتر جانے والا فن کار ہے۔

مکتبہ اردو لاہور

انتظار حسین

پرانی اردو شاعری میں عوامی کلچر

تخلیق تو خلا میں بھی ہو جائے لیکن دقت یہ ہے کہ ادب کی بنیاد زبان پر ہے اور زبان بنیادی طور پر ایک عوامی ادارہ ہے۔ زبان گلی کوچوں میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بڑے ہو کر وہ درباروں اور محلوں میں پہنچ جائے۔ لیکن وہاں پہنچ کر بھی اسے یہ التزام تو کرنا ہی پڑتا ہے کہ گلی کوچوں سے اس کا رابطہ ختم نہ ہو جائے۔ چنانچہ ادبی زبان بھی اپنی شادابی اور تازگی بولیوں سے ہی اخذ کرتی ہے۔ اور جب وہ اس عمل سے ہاتھ اٹھا لیتی ہے تو کوئی بولی ابھر کر اس پر غالب آجاتی ہے اور اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ یہ کہہ کر میں غالباً شپنگلر کی تائید تو نہیں کر رہا ہوں جو ادب کے ظہور کو زبان کے انحطاط کی علامت سمجھتا ہے۔ اس کی نظر میں ادب کے ارتقا کی تاریخ زبان کے انحطاط کی تاریخ ہے، اس لئے کہ ادب تو ظہور ہی اس وقت کرتا ہے جب زبان نڈھال ہونے لگتی ہے۔ شپنگلر کی بات کو ہم زیادہ وزن نہ دیں تو مناسب ہے۔ اس لئے کہ اس کے اعصاب پہ تو ہیگل سوار تھا۔ اور اس کے انداز پر ایک لسانیاتی نظریہ کی تعمیر کی جستجو میں اس نے بہت سی حقیقتوں کو فراموش کر دیا تھا۔ زبان کو تو اپنی ذات کا شعور ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ ادب کی منزل پر آتی ہے۔ اردو زبان کے ادب کی منزل میں پہنچنے کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ اس کا عوام سے ناطہ ٹوٹ گیا۔ کوئی چیز زندگی سے کٹ کر زیادہ مدت تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ ادب کی یہ طویل عمر خود اس کے عوام سے گہرے ناطہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ وہی عوامی روح جو زبان میں جاری ہوتی ہے، ذرا بن سنور کر ادب میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ زندگی اپنی خام کھردری شکل میں تو زبان میں نظر آتی ہے۔ لیکن ادب اسے منزہ کر کے اپنے یہاں پیش کرتا ہے۔ گویا ادب عوامی زندگی سے کوئی بے تعلق چیز نہیں ہے۔ کوئی ادب محض ادبی روایات کے بل پر زندہ نہیں رہتا۔ اس لئے کہ ان ادبی روایات کو زندہ رہنے کے لئے خود عوامی زندگی کی سمت رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اگر ادبی روایات ہی سب کچھ ہوا کرتیں تو یونانی، لاطینی اور سنسکرت کے چشمے آج یوں نہ خشک پڑے ہوتے۔

تاہم یہ لفظ "عوام" عصر حاضر کی پیداوار ہے۔ اور اس لئے اگر اسم پرست حضرات پرانے ادب پر آنکھیں میچ کر غیر عوامی کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں تو کچھ ایسا بیجا بھی نہیں ہے۔ قدیم اردو شاعری کے سلسلہ میں تو یہ بات عامیانہ شکل اختیار کر گئی ہے۔ یہ واقعی ستم ظریفی ہوگی اگر مستقبل کا نقاد آج کے ادب کو غیر عوامی قرار دیدے۔ ادب فیشن سے تو بہرصورت مختلف چیز ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ لنگوٹی لگانے والا اور چھری کانٹے سے کھانے والا مغربی کلچر کو بھی سمجھتا ہو۔ "عوام" کے لفظ کو فیشن کے طور پہ قبول کر لینے سے تو غالباً عوامی ادب کی تخلیق نہیں ہوتی۔ اس کے لئے تو عوامی کلچر کو جذباتی طور پر قبول کرنا ہوتا ہے۔ اسے اپنے میں جذب کرنا ہوتا ہے۔ پرانا اردو شاعر عوامی کلچر کو اپنے میں اس لئے جذب کر سکا تھا کہ اسے اس فضا سے واقعی تقرب حاصل تھا۔ یہ فضا اس کے ذہن اس کے تخیل میں رس بس گئی تھی۔ جو لوگ قدیم اردو شاعری کو جاگیردارانہ طبقہ کی چیز بتاتے ہیں، انہوں نے غالباً اس کی تاریخ کا سوچ سمجھ کر مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ قلعہ معلیٰ اور لکھنؤ دربار کے ناموں کی مدد سے ایک نظریہ تعمیر کر لیا ہے۔ حالانکہ اردو شاعری کی تعمیر میں درباروں کا اتنا حصہ نہیں ہے جتنا دربار سے باہر کے عوامی عناصر کا ہے سو درباروں میں

تو شاعری بڑی حد تک تفریحِ طبع کا سامان بنی رہی۔ اسے سنجیدگی اور خلوص سے تو درباروں سے باہر برتا گیا۔ لال قلعہ میں ذوق قلعہ والوں کے تفریحی میلانات کو آسودگی بخشنے میں مصروف تھا۔ اور اسی دلی میں قلعہ سے باہر ایک محلہ میں غالب اس سیماب صفت گریز پا چیز کو گرفت کرنے کی کوشش کر رہا تھا جسے روحِ عصر کہتے ہیں۔ میر دربار میں رہ کر اپنے شعروں میں اتنی کشش بھی پیدا نہ کر سکا کہ آصف الدولہ کا ذہن مچھلیوں سے ہٹا لیتا۔ اور دربار سے باہر اس نے وہ جادو جگایا جس کی گرفت آج بھی ہم اپنے روح و قلب پر محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہماری شاعری کا بڑا دھارا تو دربار سے باہر بہتا ہے۔ اور وہاں اس میں وہ عناصر گھل مل گئے ہیں جنہوں نے اسے ابدی تازگی بخش دی ہے۔ اس میں عوامی اپیل پیدا کر دی ہے۔ دلی سے لے کر پٹنہ تک پورے خطہ میں کیفیت یہ ہے کہ تانگہ والے تانگہ ہانکتے ہوئے غالب کے شعر گنگناتے ہیں۔ طوائفوں کے کمروں میں داغ کی غزلیں گائی جاتی ہیں۔ پنواڑیوں کی دوکانوں پر اردو شعروں کے طغرے لٹکے نظر آتے ہیں۔ قصائی کنجڑے مشاعرے کرتے ہیں۔ اور قلعی گر اور ریوڑی بنانے والے شعر کی استادی کے دعوے کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں لکھنؤ کے بھٹیار خانوں میں بھنگ گھٹتی رہتی تھی اور فسانۂ آزاد پڑھا جاتا رہتا تھا۔ میں یہ باتیں پوری سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ عوامی اپیل کا اندازہ تو اسی طرح لگایا جا سکتا ہے۔ نوبل پرائز حاصل کر لینا ایک بات ہے۔ اور کنجڑوں جولاہوں کے دلوں پر قابو پا لینا قطعی دوسری بات ہے۔ ادبی سرگرمیوں کے معاملہ میں فرانس بہت بدنام ہے۔ لیکن عوام کی اس قسم کی ادبی سرگرمیوں کی مثال وہاں بھی نہیں ملتی۔ یہ بات تو اردو سے ہی مخصوص ہے کہ یہاں قصائی کنجڑے بھی مشاعرے کرتے ہیں۔ اور حلوائی، قلعی گر اور سائیکل کی مرمت کرنے والے استادی کے دعوے کرتے ہیں۔ اور شاعری بھی کونسی غزل کی شاعری جس سے زیادہ منزہ اور مشکل صنفِ شعر سمجھ میں نہیں آتی۔ اس چیز کو ہم محض قدامت پرستی کہہ کر ٹال نہیں سکتے۔ اسے آخر عوامی زندگی پر بھرپور گرفت ماننے ہی بن پڑتی ہے۔ جب ایک مرتبہ کسی ادب کی جڑیں عوام کی نچلی تہوں میں پہنچ جاتی ہیں تو پھر وہ اندر ہی اندر پھیلتی چلی جاتی ہیں اور قوت حاصل کرتی چلی جاتی ہیں۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ قوت پہنچانے اور قوت حاصل کرنے کا ایک چکر سا بندھ جاتا ہے۔ ادب سماج کو توانائی بخشتا ہے، سماج ادب کو توانائی بخشتا ہے۔ اردو شاعری کی جڑیں عوامی شعور بلکہ لاشعور میں بہت گہرائی میں پیوست ہو گئی ہیں۔ عوامی شعور کو اس نے سنوارا تھا، اور اس کو عوامی شعور نے سنوارا تھا۔ ادب اور سماج ایک دوسرے کو اتنے گہرے طور پر متاثر اس وقت کرتے ہیں جب شاعر اپنے آپ کو اہم سماجی قوتوں سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بڑی شاعری کی تخلیق ممکن بھی اسی وقت ہوتی ہے جب شاعر خود کو سماجی زندگی کے اہم ترین پہلوؤں سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس چیز کو گرفت کر لیتا ہے جو روحِ عصر کہلاتی ہے۔ بڑی شاعری نظریہ سازی کا نام نہیں ہے۔ نہ وہ کسی تصور کی اشاعت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور نہ قدیم ادبی روایت میں ڈوب جانے سے ظہور میں آتی ہے۔ وہ تو ہم عصر زندگی کو سمجھنے اور گرفت کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ شاعر کو عوامی زندگی میں خود کو غرق کر دینا پڑتا ہے۔ اور محض غرق ہونے سے تو کام چلتا نہیں ہے، غرق ہو کر ابھرنا بھی پڑتا ہے۔ بڑا شاعر ہمعصر زندگی میں پہنچ کر اس مرکزی قوت کو چھو لیتا ہے جس سے اس میں سرسرانے والی مختلف اور متنوع روئیں پھوٹتی ہیں۔ وہ اس مرکزی قوت کو سمجھتا ہے، گرفت کرتا ہے، منظرِ عام پر لاتا ہے۔ اور اس طرح خود میں ہمارے روحانی مسائل سے آگاہی شاعر کی معرفت ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کی روح کو دیکھتا ہے بلکہ اسے دوسرے زمانوں کی روح سے مربوط کر کے دیکھتا ہے اور یہاں سے تاریخی شعور کی بات شروع ہو جاتی ہے۔ ہمعصر زندگی کا تجزیہ اور تنقید تو اسی وقت ممکن ہے جب شاعر کی نظر گذری ہوئی زندگی پر بھی ہو پوری انسانی تاریخ پر نظر جب تک

حاوی نہ ہو زندگی کے کسی تصور کی تعبیر کیونکر ممکن ہے۔ ایک شاعر کے طنز نگار یا شال پرست یا رومانیت پسند ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے عہد کی زندگی کو دوسرے دوروں کی زندگی سے مربوط کر کے دیکھا ہے۔

ہم عصر زندگی سے ہم آہنگی کی مثالیں ہمیں پرانی اردو شاعری میں ملتی ہیں۔ یہ بات یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کہ قدیم اردو شاعر کا خطاب خود اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ اس بات پر بہت کچھ لعنت ملامت بھی کی گئی ہے۔ اور اسے انانیت پسند انفرادیت پرست وغیرہ وغیرہ ثابت کیا گیا ہے۔ اور اس کے مقابلہ پر نئے شاعر کو اس بنا پر سراہا گیا ہے کہ اس کا خطاب ہوتے سماج سے ہوتا ہے۔ حالانکہ نئے شاعر کا سماج سے یہ خطاب خود اسی بات کا ثبوت ہے کہ وہ سماجی زندگی میں خود کو گم نہیں کر سکا ہے۔ اس کے اور سماج کے مابین ایک دراڑ ہے۔ وہ سٹیج پر کھڑے ہو کر سماج کو پکارتا ہے۔ لیکن خود سماج کے ضمیر میں پہنچ کر سماج کی پکار نہیں بنتا۔ یہ دراڑ قدیم شاعری میں نہیں ہے۔ شاعر کا "انا" اجتماعی "انا" ہے۔ میر جب "میں" کہہ کر بات کرتا ہے تو یہ "میں" میر فرد سے کہیں زیادہ میر ترجمانِ عوام کی ذات کا حامل ہوتا ہے۔ ہربرٹ ریڈ نے اپنی کتاب Phases of English Poetry میں اپنی بات یوں شروع کی ہے کہ شاعری انتہائی وسیع اپیل کے درجہ سے انتہائی تنگ اپیل کے درجہ میں آ گئی ہے۔ انتہائی وسیع اپیل وہ تھی جب اپیل کا دائرہ خود سماج کے دائرہ پر منطبق ہو جاتا تھا۔ انتہائی تنگ اپیل یہ ہے کہ شاعر اب خود اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے۔ ہربرٹ ریڈ کا مطلب گویا یہ ہوا کہ اپنے آپ سے ہر خطاب انتہائی تنگ اپیل کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ بات کم از کم قدیم اردو شاعری کے بارے میں تو درست ہے نہیں۔ ہاں نئی شاعری کے متعلق اتنا ضرور صحیح ہے کہ اپیل کا دائرہ سماج کے دائرہ پر ٹھیک طور پر منطبق نہیں ہوتا۔ نئے شاعر دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو سماج کے وجود کو ہی نہیں گردانتا۔ اور ایسی آواز میں بولتا ہے جسے خود اس کا نفس سنتا اور سمجھتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو سماج کے وجود کو خود سے الگ تصور کرتا ہے۔ اور اپنی آواز مخصوص پیامی سانچوں میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ ایک سماج کے وجود سے منکر ہے، دوسرا خود کے اور سماج کے درمیان خلیج کا قائل ہے۔ اردو کے پرانے شاعر کی آواز خود سماج کے سینہ سے نکلی ہوئی آواز ہوتی ہے۔ اور اس لئے سماج کے وجود سے انکار یا اقرار کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔

پرانی شاعری کے اس حد تک عوامی ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں شاعر اور عوام کے درمیان دیواریں نہیں تھیں۔ عوامی کلچر سے اس کا براہِ راست ناطہ تھا۔ وہ عوامی زندگی کی دھڑکنیں، کراہیں اور مسکراہٹیں صاف سن سکتے تھے اور اس لئے ان کے شعروں میں وہ تاثیر ہے جو آج بھی اسی طرح زندہ و تازہ ہے۔ میر کچے مکان میں زندگی گذار دیتا ہے اور یہ کچا مکان بذاتِ خود ایک کلچری ادارہ بن جاتا ہے۔ یہ عوامی زندگی کی تہوں سے ابھرنے والی لہروں کو جذب بھی کرتا ہے اور اس سے زندگی کی وہ رو میں بھی پھوٹتی ہیں جو عوامی زندگی کی تہوں کو شاداب کرتی چلی جاتی ہیں۔ میر کی شاعری ٹھیٹھ عوامی کلچر کی ترجمان ہے۔ اس میں ہمیں "زمینیت" ملتی ہے۔ اس "زمینیت" کو بعض لوگوں نے اس کی شاعری کا عیب سمجھا ہے۔ اور اسے کم حوصلہ اور پست نظر بتایا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اس کی عظمت کا راز ہی اس میں پوشیدہ ہے۔ میر کو زمین سے واقعی بڑی محبت تھی، اور جسے زمین سے محبت ہوتی ہے آسمان اس کے آگے خود بخود جھک جاتا ہے۔ میر کو اپنے قدموں تلے دھڑکتی ہوئی شمالی زمین کا شدید احساس تھا اور اس لئے وہ آسمان کی رفعتوں سے بھی ہمکنار ہو سکا تھا۔ اس کے قدم زمین پر تھے لیکن اس کی انگلیاں ستاروں سے کھیل رہی تھیں۔ اور جو زمین سے اتنا قریب ہو اسے فرازی تو کہا ہی نہیں جا سکتا۔ میر کے ذرا یہ شعر دیکھئے ؎

سرسری ہم جہان سے گذرے — ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

جوں غنچہ میرؔ اتنے نہ بیٹھے رہا کرو — گل پھول دیکھنے کو بھی ٹک اٹھ چلا کرو

جسے "ہر جا جہانِ دیگر" کا احساس ہے اور جو "گل پھول" دیکھنے کی ضرورت اس شدت سے محسوس کرتا ہے اسے فراری کہنا بہت جرأت کی بات ہے۔ اسی احساس کی وجہ سے تو وہ ایسے شعر کہہ سکا تھا ؎

میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے — دونوں ہاتھوں سے تھامیئے دستار

اب خرابا ہوا جہان آباد — ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

اور پھر یہ شعر ؎

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی — کہ مقدور تک تو دوا کر چلے
وہ کیا چیز تھی آہ جس کے لئے — ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

یہ شعر وہی شاعر کہہ سکتا تھا جس نے زندگی کے کرب کو پوری شدت سے محسوس کیا ہو اور اسے سمیٹ کر اپنے سینہ میں پیوست کر لیا ہو۔ عوامی زندگی کا درد و کرب میرؔ کے شعور میں گھل مل کر ایک بہتر اور زیادہ شدید شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اور یہی بات اسے فانیؔ جیسے قنوطی شاعروں سے علیحدہ کرتی ہے۔ فانیؔ کے شعروں کو پڑھ کر طبیعت کچھ کند سی ہو جاتی ہے۔ میرؔ کا غم شاداب اور توانا غم ہے۔ اس کے شعر پڑھ کر روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ مثنویوں میں تو اس نے باقاعدہ اور واضح طور پر عوامی زندگی کی تصویریں پیش کی ہیں ان پر تنقید کی ہے۔ میرؔ نے سفر کا ذکر کرتے ہوئے وہ وہاں کے چماروں کے چھپر، گنواروں کے گھر، دہقانوں کے مکان اور بنیوں اور کنجڑوں کی دوکان غرض پوری سماجی زندگی کا جائزہ لے ڈالتا ہے۔ لیکن میں اس قسم کے شعروں پر زیادہ اصرار نہیں کروں گا۔ اس قسم کا جائزہ اور تنقید معمولی شاعر بھی کر سکتا تھا۔ میرؔ کو جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ عوامی زندگی کا غم و الم، اس کی حسرتیں اور آرزوئیں اس کے مزاج میں گھل مل جاتی ہیں۔ اور جب وہ شعر کہتا ہے تو گویا یہی غم و الم اور حسرتیں اور آرزوئیں اور تمنائیں ایک زیادہ شدید شکل میں، ایک برتر رنگ میں ظہور کرتی ہیں۔ اب اسی شعر کو لے لیجئے ؎

وصل اس کا خدا نصیب کرے — میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

یہ ایک عام آدمی کی سیدھی سادی معصوم حسرت ہے جو میرؔ کے شعری شعور میں تحلیل ہو کر کیا سے کیا بن گئی ہے۔ میرؔ اور سوداؔ دونوں نے ہم عصر زندگی کے کرب کو شدت سے محسوس کیا تھا۔ یہ طبائع کا فرق ہے کہ ایک کی رونے رونے ہچکی بندھ گئی اور دوسرا اسے ہنسی میں اڑا دینا چاہتا ہے۔ لیکن ایسی بات کہیں ہنسی میں اڑا کرتی ہے۔ سوداؔ کہنے کو تو ہنسوڑ ہے لیکن اس کے قہقہوں کی تہ میں ایک زہریلی طنز یہ لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ اپنے قصیدہ "شہر آشوب" میں تو اس نے گویا اپنے عہد کی ساری زندگی کا بڑی بیدردی سے جائزہ لے ڈالا ہے۔ نہ تو میرؔ قنوطیت پرست ہے۔ اور نہ سوداؔ رجائیت پرست ہے۔ غالباً دونوں ہی اپنے عہد کے آدرش پرست ہیں جن کے پیش نظر زندگی کا ایک بلند اور برتر معیار

ہے جسے ذہن میں رکھ کر وہ ہم عصر زندگی پر نظر ڈالتے ہیں۔

تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ قدیم شاعر عوامی کلچر سے براہِ راست تاثر حاصل کرتا ہے اور براہ راست اسے متاثر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے ادبی ادارے بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے عوامی ہیں۔ جب ہم قدیم عہد شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ادارے جن کے ذریعہ سے ان زمانوں میں شعر اپنی نشر واشاعت کرتا تھا، دربار، خانقاہ، امام باڑہ اور مشاعرہ نظر آتے ہیں۔ دربار کہنے کو تو سماج کے اوپری طبقہ سے متعلق چیز ہے۔ لیکن وہ سماج کے دوسرے طبقوں سے غالباً ایسا غیر متعلق تو نہ ہوتا تھا۔ اثرات کے پھیلنے کے دونوں ہی طریقے اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں۔ اثرات زندگی کی نچلی تہوں سے ابل کر اوپر کی تہ پر بھی ابھر آتے ہیں۔ اور اوپر کی تہ سے رس رس کر نیچے کی تہوں میں بھی سرایت کر سکتے ہیں۔ دربار اس زمانہ میں ایسا ادارہ تھا جہاں سے ادبی مذاق رس رس کر نچلے طبقوں میں پھیلتا جاتا تھا۔ آج حکومت کو عوام متاثر کرتے ہیں۔ لیکن اس زمانہ میں حکومت عوام کو متاثر کرتی تھی۔ پھر یہ کہ درباری شاعر محض درباری شاعر بھی نہیں ہوتا تھا۔ ذوق یوں تو شاہ ظفر کا استاد تھا لیکن یہ کون نہیں جانتا کہ اس کا زیادہ وقت قلعۂ معلی میں نہیں بلکہ "کھری چارپائی" پہ گذرتا تھا۔ دربار سے ہٹ کر ہمیں دوسرا اہم ادبی ادارہ خانقاہ ملتی ہے۔ اس زمانہ میں مذہب آج کی طرح قطعی مردہ قوت نہ تھا۔ تصوف ایک روحانی تجربہ کی حیثیت سے دھندلا تو ضرور پڑ گیا تھا۔ لیکن زندگی کی رمق اس میں باقی تھی۔ اور اس لئے صوفیا ہی نہیں بلکہ عوام بھی اس سے دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ خانقاہیں اس زمانہ میں خاص و عام کا مرجع بنی ہوئی تھیں۔ اور اس لئے صوفی شعراء عوام سے براہ راست تعلق رکھتے تھے۔ میر درد غالباً اردو کا سب سے بڑا خانقاہی شاعر ہے اور اس کی زندگی اور شاعری دونوں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس کا عوامی کلچر سے بے واسطہ اور زندہ تعلق تھا۔ پھر امام باڑے تھے۔ مجالس عزا میں شاعر براہ راست ہی عوام کے سامنے اپنا کلام پیش کرتا تھا۔ اور مرثیہ محض عقیدتمندی کا معاملہ تو تھا نہیں۔ شاعر کا مقصود سامعین کو رلانا بھی تو ہوتا تھا، اور اس مقصد کی تحصیل کی خاطر اس کے لئے عوام کی نفسیات، ان کے جذبات اور محسوسات، انکے طور طریقے، انکے رسم و رواج غرض انکے پورے کلچر کو سمجھنا ضروری ہوتا تھا۔ چنانچہ انیس کربلا میں پہنچ کر بھی لکھنؤ کے کلچر کو نہیں بھول سکتا، اور زینب و کلثوم کے پیکروں میں ہندی عورت کو بند کر دیتا ہے۔ انیس کی شاعری کی شادابی گومتی کے پانی کی مرہون منت ہے۔ اگرچہ انیس نے اس کا نام فرات کا پانی رکھا ہے۔ رہے مشاعرے تو ان کی اہمیت سے ہم بخوبی واقف ہیں ہی۔ ان ادبی اجتماعات میں عوام حصہ لیتے تھے، اور زمانہ کے نئے میلانات اور تحریکات سے آشنا ہوتے تھے۔ اس زمانہ کے مشاعروں میں آج والی ریاکاری اور رکھ رکھاؤ تو برتا جاتا تھا۔ قدیم شاعر بھی ایسا گیا گذرا تو تھا نہیں۔ میر و مومن کا ٹھسا ضرب المثل ہے۔ لیکن اچھا شعر تو ہر ایک سے خراج تحسین لے لیتا تھا۔ سودا جیسا استاد بھی ایک لڑکے کے شعر پر پھڑک اٹھتا ہے اور کہہ دیتا ہے "میاں لڑکے تم جیتے نظر نہیں آتے"۔ اگر تو خیر شاعروں کے اچھے شعروں پر یوں داد دی جا سکتی تھی۔ تو استادوں کے کلام کی قابلِ اعتراض خصوصیات بھی تنقید کی زد سے نہ بچتی تھیں۔ غالب کے ابہام اور پیچیدگی پر آغا جان عیش نے جو بھرے مشاعرہ میں طنز کی تھی وہ کسے یاد نہیں۔ اور سودا جیسے شاعر کے شعر میں سرقہ کا رنگ دیکھ کر ایک صاحب نے عام مشاعرہ میں یہ شعر پڑھ دیا تھا ؎

شعرِ سودا حدیث قدسی ہے چاہئے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

اور سودا نے اس جھینپ کو حسن خوش اسلوبی سے مٹایا وہ بھی قابلِ داد ہے۔ عام مشاعروں میں اس قسم کی سب لاگ

تنقید و تحسین حاضرین کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ عوام میں ایک اچھا تنقیدی مذاق شعروں کو سمجھنے اور قدر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ لیجئے میں ایک ادارہ کو تو نظر انداز ہی کئے جا رہا ہوں میرا مطلب طوائف کے کمرہ سے ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ اردو زبان اور ادب کے بنانے سنوارنے اور اشاعت کرنے میں طوائف کے کمرہ کا بھی ایک اہم حصہ ہے جسے غالباً ہم نے اپنے اخلاقی تعصب کی بنا پر سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ پرانے زمانے کی طوائف واقعی ایک بلند ادبی مذاق رکھتی تھی۔ اس میں شعر کو سمجھنے اور قدر کرنے کا مادہ تھا۔ یہ اس کی محفلوں میں اس کا نازک شعری مذاق اس سے منتقل ہو کر دوسروں میں سرایت کرتا تھا۔ اس زمانہ میں لوگ اپنے مسخ اور تشنہ جنسی میلانات کی تسکین کی خاطر اس کی محفل میں نہیں جاتے تھے۔ ان کا مقصد زیادہ تر جمالیاتی مذاق کی آسودگی اور تربیت ہوتا تھا۔ اور طوائف اس وقت ایسی کچھ بدنام بھی نہیں تھی بلکہ شرفا اور امرا تو اپنے بچوں کو اور ان کی محفلوں میں بھیجتے تھے۔ اور غرض یہ ہوتی تھی کہ ان کے جمالیاتی مذاق کی صحیح تربیت ہو سکے۔ ہمارا معاشرہ زوال پذیر ہوتا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے ادبی ادارے بھی روبہ انحطاط ہوتے چلے گئے۔ دوسرے اداروں کی طرح طوائف کے کمرہ کی بھی صورت بگڑ گئی اور ایسی بگڑی کہ وہ ہمارے سماج کے جسم پر اب پھوڑا بن گیا۔

اس زمانہ میں ان اداروں کے ذریعہ سے ادبی مذاق عوام میں پھیلتا تھا اور عوامی مزاج ادبی مذاق کو متاثر کرتا تھا سنوارتا تھا۔ چنانچہ عوام میں ادبی مذاق اس حد تک سرایت کر گیا تھا کہ دلی اور لکھنؤ میں تیلی تنبولی تک شاعری کرتے تھے۔ اور بٹ کھٹ ٹکے بھٹکیں اڑاتے اڑاتے شعروں میں اصلاح کر دیتے تھے اور بڈھوں کو چھیڑتے چھیڑتے گرہ لگا دیا کرتے تھے۔ پھر یہ چیز صرف دلی اور لکھنؤ کے کوچوں تک محدود نہ تھی بلکہ دلی سے لے کر پٹنہ تک تقریباً یہی کیفیت تھی چنانچہ ان علاقوں میں آج بھی چھوٹے چھوٹے قصبوں تک میں ہندو، مسلمان مقامی شاعر بہت سے مل جائیں گے۔ دلی اور لکھنؤ کے ہنگاموں میں اکبر آباد کے اس بدنام شاعر کو تو بھولا ہی جا رہا تھا جو شہر اور شہر میں جنم کی مخفی ادبی روایات کو ٹھکرا کر دیہات کی طرف چلا گیا۔ نظیر کی ادب کی بنیاد ادب پر نہیں زندگی پر ہے۔ وہ کسی روایت کی پابندی کیا کرتا۔ وہ تو خود ایک نئی روایت کی بنیاد ڈال رہا تھا۔ نظیر نے دیہات کے دکھ درد ان کی سیدھی سادی حسرتوں اور تمناؤں، ان کی معصوم مسرتوں اور غموں کے گیت گائے ہیں۔ وہ تو خود "الا بالنرہ برہنہ حاسہ Naked Sensation" لیکر پیدا ہوا تھا جو چیزوں کو جیسی وہ ہیں دیکھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کی دیہاتی روح نے اپنا سچا پاکیزہ اور بھرپور اظہار جیسا اس کی شاعری میں پایا ہے ویسا دوسری جگہ مشکل سے نظر آئے گا۔

ہر زبان کی بھی نوابی ایک صلاحیت ہوتی ہے۔ میر سنسکرت میں پیدا نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہندی میں پیدا ہو سکتا تھا سنسکرت کا مزاج شاہانہ ہے۔ اور ہندی میں نہ شاہیت ہے نہ عوامیت۔ میر تو ٹھیٹھ اردو شاعر ہے۔ یہ شعر ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

تو اردو میں ہی کہا جا سکتا تھا اور میر ہی اسے کہہ سکتا تھا۔ وہ جو اردو زبان اپنی ایک عوامی فضا رکھتی ہے وہ میر کے شعروں میں رچی ہوئی نظر آتی ہے ؎

اگرچہ اب تو خفا ہو ہم سے ہوئے گئے پر مگر ہمارے جو یاد ہم کو کرو گے پیارے تو ہاتھ اپنے ملا کرو گے

اب یہاں اس لفظ "پیارے" میں ایک پورا ماحول سانس لے رہا ہے جو ٹھیٹھ عوامی ہے۔ اس ایک لفظ کے نکال لینے سے شعر کا دم سا کھنچتا چلا جاتا ہے۔ یہ بات مخصوص طور پر قابل غور ہے کہ اردو میں جتنا بڑا ادب تخلیق ہوا ہے وہ زیادہ تر

عوامیت کا حامل ہے۔ اس بات سے اس زبان کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن احتشام حسین صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اردو کبھی عوام کی زبان نہ بن سکی۔[1] وہ تو یہ کہیئے کہ پندرہ اگست کے گرد گھومنے والے زمانہ نے ہماری قوت تحیر کو تقریباً زائل کر دیا ہے، ورنہ یہ بات کچھ کم تعجب خیز نہ تھی۔ تعجب اس وجہ سے اور زیادہ ہوتا ہے کہ احتشام صاحب اس خطہ سے متعلق ہیں جہاں کی فضا میں اردو رچی ہوئی ہے۔ یوپی کے پلہ دار، تیلی تنبولی جو زبان بولتے ہیں اس کے متعلق اب تک تو ہم یہ سنتے آئے تھے کہ وہ اردو ہے۔ اب تقسیم ہند کے بعد پتہ یہ چلا ہے کہ اردو کبھی عوام کی زبان نہ بن سکی۔ حالانکہ اردو ادیب تک بھی ہمیشہ عوام کے محاورہ پر مصر رہا ہے۔ انیس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب ان کے کسی لفظ کے استعمال پر اعتراض کیا جاتا تھا تو وہ بہت رعونت سے کہہ دیا کرتا تھا کہ ہمارے گھر میں یہ لفظ یونہی بولا جاتا ہے۔ داغ کو جب کسی لفظ کے استعمال کی پر شبہ ہوتا تھا تو وہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جا کر کھڑا ہو جایا کرتا تھا اور راہگیروں اور دوکانداروں کی بول چال سے اس کے صحیح استعمال کا تعین کرتا تھا۔ پھر اردو شاعروں کا محاورہ اور روزمرہ پر اتنا اصرار۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اردو شاعر ہمیشہ کتابی زبان سے زیادہ بول چال کی زبان پر مصر رہا۔ فراق نے یہ بات بہت خوبی سے سمجھائی ہے کہ اردو کے قابل قدر اور موثر شعر وہ ہیں جن میں سیدھی سادی عام بول چال کی زبان استعمال ہوئی ہے۔ اور ایسے اشعار اردو میں بکثرت ہیں۔ اردو اس کلچر کی زبان ہے جس نے عوام ——— ہندو مسلم عوام کی گود میں پرورش پائی۔ قدیم اردو شاعری اسی عوامی کلچر کا ترانہ ہے،

---

[1] میں یہ بات ایک خط کے حوالہ سے کہہ رہا ہوں جو احتشام صاحب نے محمد حسن عسکری کو لکھا تھا۔

اپنے آپ سے چُھپ کر
——— وہ چوری چوری زندگی سے لذت اخذ کرتے ہیں
——— اور ———
ممتاز مفتی کی ذہنی انگلیاں اُن کرداروں کی شہ رگ پر جا پڑتی ہیں۔ اور وہ اُن رنگین نفسی کیفیتوں کی بصیرت افروز جھلکیاں

چُپ

میں پیش کرتا ہے
وہ کیفیتیں جب منہ پر چپ لگ جاتی ہے اور دل چوری چوری دھڑکتا ہے
ممتاز مفتی کے تازہ افسانوں کا مجموعہ
مکتبہ اردو لاہور

مختار صدیقی

گیت

گیت، ہندوستان کی اس ازلی روحانیت کا مظہر ہیں جس میں بھارت کے تمدن نے آنکھ کھولی۔ مگر قدیم آریاؤں کا مذہب اور تمدن کئی صدیوں تک ویدوں کے تابع رہا۔ اسی کے زیر اثر ہندوستان کے وسیع اور موقر فن اور علم وجود میں آئے۔ جن میں سے عبادات، ویدانتی فلسفہ، راج نیتی اور موسیقی نے خاص طور پہ ترقی کی۔ لیکن ابھی تک ہندوستانی ذہن سنجیدہ علمیت کے متوالے تھے۔ ان پر ایک خاص قسم کا وقار اور داب آداب غالب تھا۔ فنون لطیفہ، مثلاً موسیقی شاعری اور مصوری بھی بڑی حد تک اس سے متاثر تھے اور اس طرح اپنے کلاسیکی دور میں ہی احاطہ بند تھے۔

پھر بھگوان وشنو نے ایک البیلا اوتار لیا جس نے دنیا کو بیک وقت اپنے کھنڈے پن اور سنجیدگی ملنشریت اور الوہیت سے دیوانہ کر دیا۔ "گوکل گام کے اس چھوکرے" میں جلالی اور جمالی صفات تھیں۔ وہ دنیا سے ناانصافی اور ظلم کو مٹانے آیا تھا، کپٹ کرودھ کا ناش کرنے اور ہندوستان کی بڑھتی ہوئی مادہ پرستی کا قلع قمع کرنے آیا تھا۔ اس نے ظالم اور مطلق العنان حکمرانوں کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ سچائی اور انصاف کا دور دورہ کر کے اپنے زمانے کو ست یگ بنایا، اور اپنی بنسی کی منوہر تانوں سے جھوٹ، کپٹ کرودھ، ریاکاری کی بجائے سنگیت کی پاکیزگی اور معصومیت کو رواج دیا لیکن ابھی مادیت کے فلسفے میں جان باقی تھی۔ اندھیرے کی طاقتیں سچائی اور انصاف سے آخری ٹکر لینے کو ابھی اپنے شہہ پر تول رہی تھیں۔ آخر ان طاقتوں نے اپنے خونی پنجے بڑھائے اور کورو کشیتر میں سچائی اور انصاف سے پنجہ آزمائی کی۔ اس موقعے پر گردھر گوپال نے اپنا مشن پورا کرنے کے لئے اپدیشک کا روپ دھارا اور سچائی کے سب سے بڑے بلی ارجن کو وہ اُپدیش دیا جسے ہم آپ بھگوت گیتا کہتے ہیں۔ مادیت پر یہ آخری وار تھا جو بھرپور پڑا۔ اندھیرے کی طاقتیں فنا ہو گئیں۔ ظلم اور بدی کے بادل چھٹ گئے اور ہر طرف رحم و انصاف کا اجالا نکھر آیا۔ اسی سادگی اور معصومیت، اسی گداز اور اسی محبت کا دور دورہ ہو گیا جو کرشن کنہیا کی بنسری کی منوہر تانوں میں ہلکورے لیتی تھی!!

آپ کہیں گے، سنسکرت کی قدیم شاعری اور پراچین بھارت کی اس کتھا میں گیتوں کا وجود گوکل گام کے چھوکرے سے کس طرح متعلق ہے۔ یہ سچ ہے کہ مہاراج کرشن کے بعد صدیوں تک "گیت" کا وجود اگر ہو بھی تو ہم سے مخفی ہے۔ ویسے لفظ "گیت" اور اس کے سنسکرت مصدر "گئی" (गै) (معنی گانا) کی قدامت ویدک زمانے سے کم نہیں۔ سنسکرت ادب میں اس کا وجود شام وید سے (جو سنگیت کا اولین صحیفہ ہے) کالیداس کے اکثر ڈراموں میں دیکھا جاتا ہے۔ خود کالیداس کے ڈراموں میں ایسی منظومات ہیں جو گائی جانے کے لئے تھیں، مگر ان میں ایک تو قافیہ بندی کی قید نہیں، دوسرے ٹیپ استھائی یا ٹیک کا سراغ نہیں ملتا۔ اور بڑی بات یہ کہ ان کی کایا یا ہیئت باقی متن سے مختلف ہے۔ یعنی باقی متن بھی سنسکرت شاعری کے مشہور روپ شلوک کی صورت میں ہے۔ اور گانے جانے والے یہ ٹکڑے بھی اسی کایا جال میں بند ہیں۔ ہندوستان کی اپنی شاعری میں گیتوں کا سب سے پہلا اور واضح سراغ کوی جے دیو کی رچنا "گیت گووند" سے ملتا ہے۔ اور اسی بنی اور

سب سے انوکھی رچنا سے بھگوان وشنو کے اُس اوتار کا گہرا تعلق ہے جس کی عجیب و غریب شخصیت نے ست یُگ سے لے کر کلجگ تک ہر تخیل پرست کو اپنا غلام بنا رکھا ہے!!

جے دیو کی "گیت گووند" کی آتما پریم آتما اور روح رواں یہی مبنی تھی، اس میں اُسی کی شخصیت کے مختلف پہلو اور اُس کا رادھا پریم ہر جگہ عقیدت اور گہری محبت کے انداز میں ڈوبا نظر آئے گا۔ چنانچہ بنگال کے شاعر چنڈیداس اور متھلا کے جاگرک ودیاپتی نے، کرشن رادھا پریم کے چرتر ہی لکھے۔ اور ان میں ایک نے تو اپنی رامی دھوبن اور دوسرے نے متھلا کی رانی میں رادھے کے انوپ سپنے دیکھے۔

مگر گیتوں کا اصل زمانہ چودھویں صدی بکرمی سے شروع ہوتا ہے یہ وہ زمانہ ہے جب بھگتی کی تحریک ہندستان کے طول و عرض میں پھیلی، اور پرکاش پریم، وحدت الوجود اور عجیب قسم کے متصوفانہ خیالات نے ہندستانیوں کے دل پر ایسا رنگ جمایا کہ ہر کسی کے لئے رام، رحیم، کرشن اور کریم ایک ہو گئے۔ ایک خدا کی وحدت، اس کے ازلی اور ابدی قدیم، اور ذات و صفات نے پہلی بار خاکی انسانوں کی اس قدر عظیم گنتی سے اقرار باللسان کے علاوہ اور تصدیق بالقلب بھی حاصل کی۔ اسی تحریک نے ایسی شخصیتیں پیدا کیں جنہیں مختلف مذہبوں، عقیدوں اور فرقوں کے لوگوں نے اپنا کہا، اور اپنا ہی سمجھا۔ بھگتی کی تحریک کے زور پکڑتے وقت سنسکرت کی پروقار زبان عوام سے بچھڑ چکی تھی۔ عوام ایک آسان، چلتی ہوئی زبان بولتے اور سمجھتے تھے بھگتی کی تحریک نے اپنے پرچار کے لئے اسی آسان زبان (پراکرت) کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ یہی وہ آسان زبان ہے جس میں بھگتی کی تحریک کی عظیم الشان شخصیتوں مثلاً بھگت کبیر، نانک، دادو اور رائے داس وغیرہ نے گیتوں کے انمول جھیلے کو جنم دیا۔ اور اسی میں انہوں نے گیتوں کے ذریعے، بھگتی مت کا پرچار کیا۔ یہی وہ گیت ہیں جنہیں ہم آپ بھجن کہتے ہیں۔ اور اس طرح انہیں دوسرے گیتوں سے تمیز کرنا چاہتے ہیں۔

ان سنت کویوں کے بعد سورداس، گوسوامی تلسی داس، اور مہارانی میراں بائی کا زمانہ آتا ہے۔ تلسی داس جی کا موضوع رام چرتر تھا۔ اس لئے ان کی رامائن میں چوپائیاں اور دوہے ہیں خالص گیت نہیں۔ لیکن گوکل گام کے چھوکرے کی انوکھی لیلا نے دو ایسے دلوں کو، جو محبت سے گرمایا جن کا مرکز عشق تو ایک تھا، مگر درد کی لگاوٹ ہجر و وصال کی نوعیت، اور صدمے بالکل جداگانہ تھے۔ انہی دونوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر ہندی گیتوں کا روپ نکھرا، اور انہوں نے ہندی گیتوں کو ایک خاص اور واضح شکل دی۔ موضوع وہی شخصیت تھی جس کے پہلو ہزاروں تھے اور ہر پہلو کا رنگ اور تھا۔ انہوں نے اپنی اپنی افتاد اور اپنے اپنے وجدان کے مطابق اس شخصیت کے دو بالکل مختلف پہلو اپنے پریم چرتروں کے لئے چنے۔ چنانچہ سورداس جی گوکل گام کے چھوکرے یعنی بال گوپال ہی کے متوالے اور پرستار بنے۔ یہی بال رچنا ان کی شاعری کی ابتدا و انتہا بن کر رہ گئی۔ اور اسی میں ان کی بھگتی اور لگن حلقہ بند ہو گئی۔ ان کے نزدیک بھگوان کرشن کی جمالی یا جلالی صفات، ان کا فلسفہ، ان کا اپدیش یا روحانیت کا کوئی پہلو نا قابل قبول نہیں۔ جتنی بال کرشن کی معصوم شرارتیں، بالائی اور مکھن کی چوریاں، گوپیوں کے ساتھ نوک جھونک، چتا، اشنان، گھونگھٹ چرانا، اور مستی کی آزاد مست تانیں تھیں۔

ادھر مہارانی میراں بائی کے ذہن اور تخیل نے ست یپنے نے، شیام سندر کے دولہا ہونے کا تصور اس طرح دل میں بٹھایا کہ ریاست کی گدی راج بھون کے عیش و تنعم لوگوں کے شک شبہے، ساس نندوں کی نیش زنی بھی اُس عجیب و غریب محبت کو کم نہ کر سکی۔ میراں بائی کا پیار، ایک عورت اور ایک راجپوتنی کا پیار تھا۔ صحرا کے جھونکوں کی طرح

آزاد اور بے اماں اس میں تپتی ریت کی سی وسعت اور شعلہ آشامی تھی۔ اس پیار میں جسم کے ساتھ وہی صوت منداور بیباک انہماک تھا، جو صحرا کی آتشیں بیٹیوں کا ہی خاصہ ہے۔

چنانچہ بھگوان وشنو کے اوتار نے بھگتی کی تحریک کا روپ لیکر ہندستان کے عرض و طول کو ایک دفعہ پھر دیوانہ کردیا۔ ایک طرف سورداس کی کوتیا تھی، اس میں جذبہ بھی تھا اور علیت بھی۔ برج بھاشا کی تمامتر مٹھاس، لوچ اور لچک تھی۔ اور سنگیت کا فنی تلامذہ بھی —— یہ کوتیا، راگ راگنیوں کی بنیادوں پہ استوار کی گئی تھی۔ اور اس طرح دل کے عقیدہ تند جذبوں نے کسی البیلی دُھن یا کسی چنچل راگنی کا روپ لیکر اظہار پایا۔ ادھر مہارانی میراں بائی کے گیت تھے۔ جن میں 'اپنے پربھو' گری دھر ناگر کے ساتھ سچی لگن اور گہری تڑپ کی لگاوٹیں تھیں۔ گیت کی فنی خوبیاں جتنی ان گیتوں میں اجاگر ہوئیں وہ شاید اس کے بعد کہیں نہیں ہوسکیں۔ ان میں زیادہ گیت میراں بائی کی زندگی کے کسی نہ کسی واقعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی تڑپ میں کسی نہ کسی بیکلی، اور کسک کی پوری کہانی اپنی تمامتر جان خراشیوں کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔

بھگتی تحریک کے گیت لکھنے والے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی گنتی میں تھے۔ ہندی گیتوں کا سنہری زمانہ یہی ہے۔ لیکن اس تحریک کا فطری ردِ عمل ایسی شاعری تھی، جو کرشن رادھا پریم چرتر، یا کرشن کی محبت کی بلندیوں سے اتر کر اپنی نفس پرستی کا آلۂ کار رہی۔ ہندی نقاد اس زمانے کو "ریت کال" کہتے ہیں۔

پھر ہندستان میں اپنی حکومت کا تختہ الٹا۔ اور ۱۸۵۷ء کے خونیں ڈرامے نے ہندستانیوں کی قسمت پر مُہر لگادی زمانہ کی ایک کروٹ نے تخت پر بیٹھنے والوں کو خاک نشیں کردیا۔ زمانے کے اس انقلاب سے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں بڑی واضح تبدیلی آئی وہاں ہندستان کی شاعری اور ادب بھی بدلنے شروع ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو ادب و شعر کی تبدیلیاں آپ سے مخفی نہیں —— لیکن اردو ادب و شعر کی تبدیلی، اتنی واضح اور اتنی اہم نہیں جتنی ہندی کی۔ کیونکہ اس تاریخی سال کے بعد ہندی شعر و ادب گویا مر مر کر زندہ ہوا۔ برج بھاشا جس میں حضرت امیر خسرو سے لیکر مہارانی میراں بائی جیسی مختلف الطبع ذہانتوں نے، ہزارہا طلسم باندھے تھے کسی عجیب ارتقائی عمل سے اردو زبان بن نکلی تھی۔ اور اس میں میرؔ اور غالبؔ جیسے شاعر، ناسخؔ اور انشاؔ جیسے زبان آفرین پیدا ہو چکے تھے، چنانچہ ہندی کی دوسری زندگی، برج بھاشا کے قالب کو چھوڑ کر کھڑی بولی کے قالب میں شروع ہوئی۔ اس قالب میں روح پھونکنے والے بھارتیندو ہریش چندر ہیں، جنہوں نے روایتی اسلوب سے بغاوت کی۔ زبان میں تبدیلیاں کرتے کرتے ہندی کو کھڑی بولی کی چوکھٹ پر لاکھڑا کیا۔ بحروں اور اندازمیں نئے نئے تجربے کئے۔ ڈرامے لکھے۔ داستانیں رقم کیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ گیت بھی لکھے —— اور اس نے بیسویں صدی میں جے شنکر پرشاد، میتھلی شرن گپت، مکھن لال چترویدی، مہادیوی ورما، نرالا، رام کمار ورما، جیسے شاعر پیدا کئے، جنہوں نے نظمیں، گیت، ڈرامے، نثر سبھی کچھ لکھا۔ اور اسی زبان کی خدمت کرتے کرتے (جس کا زبان مانا جانا ماہرین کے نزدیک، ابھی محلِ نظر ہے) جے شنکر پرشاد، اور مہادیوی ورما نے گیتوں کی تکنیک کو عروج پر پہنچادیا۔

(۲)

اردو گیتوں کی عمر بہت چھوٹی ہے۔ گیت اس دور کی پیداوار ہیں جب نظم، صنفِ سخن کے طور پر بڑی توانائی حاصل کرچکی تھی۔ اور نظم کے پیشروؤں کی کوششوں کی بدولت (اس زمانے کے) نئے لکھنے والوں میں یہ ہمت پیدا ہوچکی تھی، کہ مضمون، ہیئت، اور بحروں میں کچھ تجربوں کی جرأت کرسکیں۔ گیت کی اس کم عمری کے باوجود، ٹھیک طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا

کہ اردو میں اس صنف کا ابوالآبا کون ہے۔ یہ تعین بھی دشوار ہے کہ کن عوامل اور اثرات نے اس صنفِ سخن کو جنم دیا ہمیں صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ ذہانتیں کون تھیں جنہوں نے اسے باقاعدہ حیثیت دی۔ اسے توانائی بخشی، اور اسے اچھی طرح سے رائج کیا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا نام دلی کے اس نرالے شاعر کا ہے جس نے دکن کی بہاریں اور برساتیں، گہری گھاٹیوں میں بہنے والے سرشور دریا، اور سنگِ موسیٰ سے تراشی ہوئی عورتوں کے سنگین حسن سے اپنے شاعرانہ وجدان کو عبارت کیا تھا یہ ہیں عظمت اللہ خاں۔ جنہوں نے بہت کم لکھا اور جنہیں لکھنے کی زیادہ مہلت بھی نہیں ملی۔ اردو میں ان کی لکھی ہوئی چیزیں سب سے اچھوتی اور سب سے الگ ہیں۔ ان کے الفاظ ہلکے اور شیریں ہیں۔ بحریں خوابناک ترنم سے مالامال ہیں اور انداز میں وہی بے ساختگی اور وہی البیلاپن ہے جو ہندی شاعری کی روایتی "عاشق" عورت کا ہے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ انہوں نے ہندی شاعری سے متاثر ہونے کی وجہ سے "نظم نما گیت" یا "گیت نما نظمیں" لکھیں۔ آج کل کا قاری یہ دیکھتا ہے کہ ان کی بعض منظومات، اونچے پایہ کے گیتوں میں شمار ہو سکتی ہیں۔ اس کی سب سے خوبصورت مثال "پہلا آمنا سامنا" اور "دل لوٹ کے آتا ہے دل لوٹ بھی جاتا ہے" ہیں۔

مرحوم عظمت اللہ خاں کے بعد دوسرا نام حضرت حفیظ جالندھری کا ہے۔ موجودہ اردو شاعری میں حفیظ کی حیثیت تاریخِ ادب کے اعتبار سے انفرادی شان کی مالک ہے۔ ابتدائی زندگی کے حادثے، اور تعلیم حاصل نہ کر سکنے کے سنگھائے گراں ایسے ہیں جن سے شاعری کا ابھتا ہوا سوتا بھی بند ہو جاتا۔ اس پر بھی اگر آپ نے "نالہ کو پابند نے" کر لیا تو اسے توفیقِ الٰہی سمجھنا چاہئے۔ اور اسی کو حفیظ کے صحیح شاعر ہونے پر قاطع حجت مان لینا چاہئے۔ اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ حفیظ نے جس استاد سے فیضان حاصل کیا ان کا دماغی اور شعری ماحول کم سے کم دو سو سال پہلے کا تھا۔ حفیظ کے استاد مولینا گرامی مرحوم نے بجائے اردو کے فارسی میں شاعری کی۔ اور فارسی ایسی زبان تھی جس کے بارے میں غالب تو ایک طرف دورِ متوسطین کے مشہور استاد مصحفی اپنے "تذکرہ" "ریاض الفصحا" میں شکوہ سنج رہے کہ اس کا رواج گھٹتا جا رہا ہے!!

ہاں تو حفیظ جالندھری نے اس قدامت پسند گہوارے میں تربیت حاصل کی۔ لیکن طبعی اپج اور ذہن کی قدرتی تازگی کو آفریں ہے کہ ان سے غزلوں کے علاوہ نئی نئی تکنیک کی نظمیں اور گیت بھی کہلوائے ۔۔۔ انہیں ترنم اور موسیقی کا ایک خاص احساس ودیعت ہوا تھا جس کی بدولت انہوں نے، نظموں میں بحروں، اور تکنیک کے نئے نئے تجربے کئے۔ اور چونکہ ان تجربوں کی اساس، ترنم تھی۔ اس لئے ان کا نام بھی "ترنم" ہی رکھا گیا۔ ان تجربوں کی کامیابی نے ان کی طبعی تشنگی کو اور جلا دی۔ اور حفیظ نے گیت لکھے۔ یہ وہ گیت ہیں جو موجودہ اردو شاعری میں عموماً اور اردو گیتوں میں خصوصاً ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مرحوم عظمت اللہ خاں کی (بقول خود) "چنتر چناتیں" شاید روایتی غزل یا جدید نظم کے کہروں میں ہمیشہ کے لئے کھو جاتیں۔ مگر حفیظ کی البیلی شعریت نے اس طرف توجہ کی:۔

موسیقی کا وہ سچا اور عمدہ احساس، جو "نغمہ زار" کی ترنم والی نظموں میں پہلے پہل اجاگر ہوا تھا "سوز و ساز" کے گیتوں میں پوری طرح آسودہ ہوا۔ ان گیتوں کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی میٹھی دھن یا سریلی تان نے ان کے دل میں چٹکی لی اور آواز نے اس کا ساتھ دیا تو شعریت جاگ اٹھی۔ اور زبان تک آتے آتے وہ میٹھی دھن گیت بن گئی۔ یہی ہے

گیت کا الہامی درجہ، جہاں وہ تیجی شعریت کی روحِ رواں بن جاتا ہے! اور یہ درجہ گیتوں کو حفیظ کے سوز و ساز میں ملا ہے!! اس بات کے زندہ ثبوت حفیظ کے وہ گیت ہیں جو گراموفون ریکارڈوں کی بدولت سب کے سامنے آچکے ہیں۔
مثال کے طور پر "جاگ سوزِ عشق جاگ" اور "بسنت" جو ملکہ پکھراج کی آواز میں ڈھل کر ہم آپ تک آواز کی صورت میں پہنچے ہیں۔ یہ دونوں گیت اپنی دھنوں اور تالوں کے روپ میں آئے ہیں جن کی بدولت انہوں نے شاعر کے ذہن میں جنم لیا تھا۔

حفیظ کے گیتوں میں آپ خاص غزل کی مستعملہ فارسی ترکیبوں سے لے کر برج بھاشا اور کھڑی بولی کے میٹھے لفظوں سے دوچار ہونگے۔ بعض جگہ بندوں کی ترکیب، اور مصرعوں کے تیور یہ شک دلائیں گے کہ گیت کچھ بوجھل ہوگیا ہے اور شاید حفیظ کی "ترنم" والی نظموں سے قریب تر آگیا ہے۔ لیکن ان باتوں کے ہوتے ہوئے بھی اس سے انکار نہیں کہ اردو شاعری میں حفیظ ہی نے گیتوں کو ایک مستقل صنف کا درجہ دیا۔ اور فطری نغمگی، قادر الکلامی اور موسیقی سے واقفیت کی بنا پر انہیں دوامی حیثیت کے قابل بنا دیا۔

حفیظ کے بعد اردو میں گیتوں کا رواج ہوگیا۔ ان کے ہم عصروں میں قریب قریب ہر شاعر نے اس صنف کی طرف توجہ کی؛ اور اپنی توجہ کی کوئی نہ کوئی یادگار چھوڑی۔ اختر شیرانی کا "ہیں دل سے انہیں کیسے بھلاؤں سکھی میرے دل کو جو آکے لبھا ہی گئے"۔۔۔ ساغر نظامی کی "پجارن"۔ تاثیر کا گیت "میری وفائیں یاد کرو گے"۔ اندرجیت شرما کا "سکھی ری من کو لے گیا کون" (اور اس کے ساتھ کے گیت جو فلم "ایک رات" میں اب آچکے ہیں) احسان دانش کا گیت "ریت جگت کی سب سے نیاری بشپا ہے سنسار" اس سلسلے کی مشہور چیزیں ہیں۔ لیکن حفیظ کے ہم عصروں میں کسی نے اس نئی ادبی صنف پر خاص توجہ نہ کی۔ اور اگرچہ گیتوں کا اچھا خاصہ سرمایہ اس دور میں ہوگیا۔ پھر کوئی شاعر امتیازی طور پر گیتوں کے لئے مشہور نہ ہوسکا شاید ان لوگوں نے گیتوں کو محض ایک نئی چیز سمجھ کر اس میں فنی تجربے کئے۔ اور ان تجربوں سے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت مہیا کرنے کی کوشش کی۔

چنانچہ گیتوں کے سلسلے میں ان شاعروں کی یہ کوششیں ایسی ہی ہیں، جس طرح پرانے استاد دیوان مرتب کرنے کیلئے یہ ضروری سمجھتے تھے کہ رائج الوقت تمام اصنافِ سخن اس میں موجود ہوں جس طرح بدعت کے پیش نظر میر صاحب قبلہ جیسے ثقہ غمگینوں نے واسوختیں تک لکھیں۔ اسی طرح گیتوں کے تنوع اور نئی نئی مقبولیت سے متاثر ہو کر حفیظ کے دور کے قریب قریب ہر شاعر نے یہ نیا تجربہ کیا۔ مگر زیادہ تر یہ کوششیں زمانے کی کڑی کسوٹی پر پوری نہ اتر سکیں اور اب صرف ان کی یادگاریں رسالوں کے فائل ہی ہیں۔

لیکن اردو کے ایک شاعر مقبول حسین احمد پوری نے گیتوں کے تنوع سے جو تاثر لیا، وہ پائدار تھا۔ اسی تاثر کی بدولت اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے فطری تقاضے کے طفیل انہوں نے ہندی سیکھی۔ اور ہندی ادب و شعر کی عمدہ استعداد بہم پہنچائی اور پھر گیت لکھے۔ لیکن ہندی شعر و ادب کا تاثر اتنا گہرا تھا کہ انہوں نے زیادہ تر خالص ہندی گیتوں کو ہی اردو رسم الخط میں پیش کیا۔ شروع شروع میں یہ رنگ گہرا رہا۔ اس رنگ کی کامیاب اور مقبول مثال وہ "دوہے" ہیں جو کیلاش کنول کے نام سے "ساقی" اور "ہمایوں" میں چھپے تھے۔ یہ دوہے "عارف ہندی اقبال" کی شہرہ آفاق کتاب پیامِ مشرق کے ایک حصہ یعنی "لالۂ طور" کا ترجمہ ہیں۔

خالص ہندی کے ان گیتوں کے ساتھ مقبول حسین احمد پوری نے ایسے گیت بھی لکھے جن کی زبان اور ادبی ماحول بھگتی کی تحریک کے مشہور گیتوں کا ساتھا۔ اس کی عمدہ مثالیں ان کے گیت "سودا پریم کا سب سے نیارا ہاتھ لگے جو دام بنا"—— "ہردے لاگی بین کٹاری" اور خاص طور پر "لاگ اساڑھ چلی پُروَیا جھورے بدرا چھائے" ہیں —— اس آخری گیت کی ایک مثال کبیر اور مہارانی میراں بائی کے الہامات کے ساتھ ملاحظہ کیجئے:-

لاگ اساڑھ چلی پُروَیا جھورے بدرا چھائے!

کرے کُلیل پپیہرا بن میں گوالا شور مچائے ——
جھیل کنارے بگلا ڈولے سارس دوڑ لگائے
چھائیں مائیں کھیلیں بالک گورا ڈھول بجائے!!

راج باغ میں پڑے ہنڈولے سب کوئی جھولن جائے
دھیرے دھیرے جھولے کوئی کوئی پینگ بڑھائے
کوئی ہنسے کوئی کھیل کرے اور کوئی کجری گائے
شیام بنا سُونی ہے برکھا کچھو مگھ ملہار نہ بھائے!!

لاگ اساڑھ چلی پُروَیا جھورے بدرا چھائے

بھگت کبیر:-

مایا مہا ٹھگنی ہم جانی

ترگن پھانس کر ڈولے　　بولے نہ مدھری بانی
کیشو کے کملا ہوئی بیٹھی　　شو کے بھون بھوانی
پنڈا کے مورت ہوئی بیٹھی　　تیرتھ میں بھئی پانی
یوگی کے یوگن ہوئے بیٹھی　　راجہ کے گھر رانی
کاہو کے ہیرا ہوئے بیٹھی　　کاہو کے کوڑی کانی
بھگتن کے بھگتی ہوئے بیٹھی　　برھما کے برھمانی
کہت کبیر سنو بھئی سادھو　　یہ سب اکتھ گیانی
مایا مہا ٹھگنی ہم جانی

مہارانی میراں بائی:- کوئی کچھو کہے من لاگا

ایسی پریت من موہن بھیوں سونے میں سہاگا
جنم جنم کا سویا منوا ستگرو شبد سن جاگا
کوئی کچھ کہے من لاگا——

آپ نے دیکھا: زبان اور ماحول کی کس قدر ہم آہنگی ان تینوں میں موجود ہے —— یہی وہ چیز ہے جو مقبول حسین کو گیت کے دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔

اس رنگ کے علاوہ ان کے ہاں ایسے گیت بھی ہیں جو کھڑی بولی برج بھاشا اور ہندی کی نسبت اردو کے زیادہ قریب ہیں۔ اور ان کی زبان وہی ہے جسے آپ موجودہ لسانی ماہروں کے ہم زبان ہو کر "بنیادی اردو" کہہ لیں۔ سیاسی پیشواؤں کی پیروی میں ہندستانی کا نام دیدیں، یا اسے حضرت آرزو لکھنوی کی "خالص اردو" کہیں۔ میں اسے اردو گیتوں کی زبان کہوں گا۔ اس سلسلے میں ان کے مشہور گیت نوحہ (حسین! حسین!!!) اور برات (پنچھی دلیس بسانا ہوگا، مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ابوالاثر حفیظ کی پیشروی نے اردو میں گیتوں کو رائج کیا تھا۔ ان ہی کی باقاعدہ کوششوں سے اردو میں گیتوں کی جوت جلی۔ اور پھر اس جوت سے جوت جلتی رہی۔ تا آنکہ اردو شاعری کا جدید ترین دور آیا۔ اس دور میں گیت کی جوت پورے آب و تاب سے دمک اٹھی۔ اس نئی اور توانا دمک کا سہرا میراجی کے سر ہے۔

اب تک ان کے گیتوں کے دو مجموعے یعنی "میراجی کے گیت" اور گیت ہی گیت" چھپ چکے ہیں۔ ان میں ہر قسم، اور ہر ماحول کے گیت ہیں۔ ان میں قدیم ہندستان کی وہ روحانیت بھی ہے جو تقدیر پرست دلوں نے "گیان" اور "بھگتی" کے سانچوں میں ڈھالی ہے۔ ان میں "ان کے" اپنے من کے" گیت بھی ہیں جو نوجوان ناکام محبت کے نغمے ہیں۔ ان میں "پرائے دھن کے" گیتوں کی بھی کمی نہیں، جو "کسی" کو زندہ جاوید کرتے ہیں۔ ان میں دوگانے بھی ہیں اور ٹھمریاں بھی۔ غرضیکہ میراجی کے گیت ایسا عالم ہے جو ماحول اور فضا کے اعتبار سے گوناگوں اور بوقلموں ہے۔

نئی شاعری میں میراجی ایک اہم جگہ رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے گیتوں میں وہ ابہام، دور از کار باتیں اور کوہ کنی نہیں جس کے لئے ان کی نظمیں مشہور اور رسوا ہیں۔ اس کے برعکس ان کے گیتوں میں ہمیشہ ایک واضح احساس یا ایک ذاتی جذبے کی شدت جلوہ گر ملے گی۔ اسی لئے ان کے گیتوں میں محاکاتی پہلوؤں کی افراط ہے۔ یہی شاید ان کی کامیابی، ان کی ہمواری اور ان کے خوبصورت انداز کا اصلی راز ہے۔ ان گیتوں کی ٹیپ پڑھتے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی باتیں اپنے دل میں بھی تھیں۔ اور زندگی کا کوئی واحد احساس یا تنہا جذبہ جو کبھی بندھنوں کو چھوکر نکل گیا تھا۔ اب ایک دفعہ پھر اپنی پوری رعنائی اور قوت سے لوٹ آیا ہے۔ اسی لئے عام طور پر ان کے گیتوں میں پورے کے پورے افسانے جھلکتے ہیں۔

فنی لحاظ سے بھی میراجی کے گیت ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں۔ ان میں وہ کڑا پن نہیں جو حفیظ کے اکثر گیتوں میں اردو لفظوں اور فارسی ترکیبوں کے استعمال کی وجہ سے آگیا ہے۔ ان کے الفاظ ہلکے اور شیریں ہیں۔ ان میں افعال یا اسماء کے ترکیبی حروف میں وہ تعلیل یا توڑ مروڑ روا نہیں رکھی گئی جو کھڑی بولی اور برج بھاشا کا لسانی خاصہ ہے۔ اور جس سے عظمت اللہ خاں اور مقبول حسین احمد پوری نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس طرح انہوں نے گیت کی تفصیل اور اس کا پھیلاؤ بھی خاص سکیم کے مطابق کیا ہے۔ بلکہ عام طور پر یہ ترکیب برتی ہے کہ کہیں تو سالم ٹیپ کی تکرار ہے، کہیں اس کا ایک ٹکڑا ہی دہرایا جاتا ہے اور کہیں ہر بند کے ساتھ ٹیپ میں خفیف سی تبدیلی کر کے اسے بند کے ساتھ ربط دیدیا ہے۔ ایسے مربوط تجربے ان دوگانوں میں بہت کامیاب ہیں جہاں انہوں نے مختلف دوگانے کے بول اور کورس (—— CHORUS، کے ٹکڑے، ایک ہی گیت میں ترکیب دئے ہیں۔

میراجی کے علاوہ اس دور کے نئے شاعروں میں اکثر نے گیت لکھے ہیں ان میں قیوم نظر کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ الطاف مشہدی، سلام مچھلی شہری، تنویر نقوی کے گیتوں کے مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ لوک گیتوں کے سلسلے میں مطلبی فرید آبادی کا نام سب کے سامنے آچکا ہے۔ ریڈیو کے لئے گیت لکھنے کے سلسلے میں احمد ندیم قاسمی اور اختر الایمان کا نام قابل ذکر ہے: جنہوں نے اوروں کی طرح تجارت کو ہی پیش نظر نہیں رکھا، بلکہ اپنی شہرت کی لاج رکھی اور ان گیتوں میں اپنے پیشرووں کی مثالوں اور تجربوں اور اپنی فنکارانہ مہارت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ خدا کرے کہ ان دونوں کے گیتوں کے مجموعے لہروں کے پھندوں سے نکل کو کتابی صورت اختیار کریں، تاکہ ان پہ واضح طور پر کوئی رائے قائم کی جا سکے۔

میرا خیال تھا یہاں ہندستانی تھیٹر اور فلم کے گیتوں کا بھی ذکر کروں کیونکہ انہوں نے کلاسیکی سنگیت کی طرح اردو گیتوں کا ایک پس منظر تیار کرنے میں بلا واسطہ طور پر بڑا ہاتھ بٹایا۔ لیکن اس وقت اردو گیت کی ارتقائی کڑیاں ہی سامنے رہیں، اور اسی نے یہ سجھایا کہ جن گیتوں کی بدولت یہ سب کچھ کہنے کا موقع ملا ان کی بدولت ابھی میں نے کچھ نہیں کہا —— مگر اردو گیتوں کی ارتقائی کڑیوں پر پھر سے ایک سرسری نظر ڈالنے سے ایک اہم بات سامنے آتی ہے جس کا ذکر پیش نظر گیتوں کے سلسلے میں بھی ضروری ہے۔

گیت کا اصل مقصد گانا ہے۔ اس لئے گیتوں کے پرانے خالق یعنی ہندی کے پرانے کوی شعر اور نغمہ دونوں میں دسترس رکھتے تھے۔ مگر گیتوں کے ارتقا کے تمام مدارج کو سامنے رکھیں تو وہ مقام بھی محسوس ہوتا ہے جہاں گیت گانے یا گائے جانے کی شرعی قید سے کچھ کچھ آزاد ہو گئے ہیں۔ اس قسم کی آزادی یا بغاوت آپ کو ادب کی ہر صنف میں ملے گی۔ ڈرامہ پہلے پہل اسٹیج کے لئے لکھا گیا۔ اب بھی اس کا عیار یہی ہے کہ اسے کہیں نہ کہیں یا کسی نہ کسی طرح پیش کیا جا سکے۔ تہذیب کی ترقی کے ساتھ پیشکش کے وسیلے بھی مختلف التوع ہو گئے۔ مثلاً اسٹیج نے ترقی کی تو وقت اور مقام کے بندھنوں کو توڑ کر فلم کے پردے کا دامن تھاما۔ سٹیج کا عینی بندھن ٹوٹا تو کرداروں کی آواز ہی آواز کو برقی لہروں نے اپنایا۔ اور اپنے لئے ریڈیو ڈرامہ کی صنعت خاص وضع کر لی۔ پھر سٹیج کی قید بھی اٹھ گئی۔ ایسے ڈرامے، مکالمے اور چٹکلے لکھے گئے جو اسٹیج کے پردوں، روشنی کے اہتماموں اور باقی لوازموں کے بغیر کھلے میدان، ڈرائنگ روم یا کھانے کے کمرے میں بھی کھیلے جا سکتے تھے۔ ان سب مدارج میں ایک فنی لازمہ مشترک رہا۔ وہ یہ کہ مختلف قسم کے یہ ڈرامے پیش کرنے اور کھیلے جانے کے لئے ہی لکھے گئے۔ لیکن ان کے علاوہ ہزاروں ڈرامے ایسے بھی تصنیف ہوئے جن میں کھیلے جانے یا پیشکش کی اس قید لازم کی پابندی نہیں کی گئی۔ یہ ڈرامے صرف پڑھنے کے لئے لکھے گئے۔ انہیں لکھنے والوں نے اپنے خاص نظریوں، خاص خاص محاکموں، خاص خاص تجربوں کو ڈرامے کا جامہ پہنایا۔ اور انہیں یا تو جارج برنارڈ شا کی چبھتی ہوئی عاقبت گوئی سے کام لیکر "ایک طربیہ اور فلسفہ" کا عنوان دیدیا یا اسے ایک ادبی ڈرامے کی حیثیت سے چھاپ دیا۔ یہی حال ناول اور افسانوں کا ہے۔ ان کے ارتقا کی وہ منزلیں بھی آچکی ہیں جن [illegible] کے لازمی عنصر کو صرف ایک ضمنی حیثیت دیدی گئی ہے اور یا تو اظہار و انداز کو ہی اپنا منتہا سمجھا گیا ہے۔ یا کوئی نظریہ [illegible] کے اپنے محاکمے پیش کئے گئے ہیں۔ اردو گیتوں کے ارتقا کی عمر بہت چھوٹی ہے۔ اس لئے قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں بھی وہ منزل آگئی جہاں گیت نے اپنی فنی لازمے یعنی گانے کو

پس پشت ڈال دیا ہے۔ اور صرف ایک ادب پارے بلکہ شعر پارے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ڈرامے یا ناول کی طرح یہاں کوئی نظریاتی یا محاکماتی مجبوری نہیں جس نے ڈرامے کو پیشکش اور ناول کو کہانی کے فنی لازمے سے آزاد کیا۔ گیت کو گانے کے لازمے سے کافی حد تک آزاد کرنے اور اسے صرف ایک شعر پارہ بنانے کی دو وجوہات ہی ہو سکتی ہیں۔ ایک تخلیقی عمل سے تعلق رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی جذبے یا تاثر نے وجدان کو اس حد تک متاثر کیا کہ دُھن کی بجائے لفظ یا مصرعے پہلے ذہن میں آ گئے جنہیں کسی مروجہ طرز میں گنگنا گنگنا کر یا شاید چپ چاپ، لکھ لیا گیا چنانچہ اس تخلیق میں کسی خاص دُھن یا نغمگی کی کیفیت نے کم حصہ لیا، اور اس کی جا بڑی حد تک جذبے یا تاثر پر رہی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تہذیب کی ان سینکڑوں صدیوں نے ایک دوسرے سے متعلق ہو کر علوم کو قائم بالذات کر دیا۔ اس طرح موسیقی اور شاعری جو کبھی ناقابل تفریق تھیں، اپنی اپنی جگہ خاصے کا فن بن گئیں۔ شعر و نغمہ کے اسی افتراق کے زیر اثر آج یہ حال ہے کہ گیت لکھنے والے شاعروں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو سنگیت سے واقف ہو۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ گیت لکھنے والے شاعر ترنم آویز نغمگی سے بے بہرہ ہیں میں یہ بھی نہیں کہتا کہ گیت لکھنے سے پہلے ہمارے شاعروں کو سُر گیان، دھرپد اور خیال کی گائیکی اور تال اور ٹھیکے سے پوری واقفیت پیدا کرنا ضروری ہے۔ میری عرضداشت صرف یہ ہے کہ موجودہ دور کے گیت لکھنے والوں میں سے کتنے ہیں جنہوں نے ابوالاثر حفیظ کی طرح کسی خاص دھن یا نغمگی کی کسی خاص کیفیت کو تاثر اور جذبے میں سمویا۔ اور اس آمیزش سے کوئی گیت تخلیق کیا۔ یا ابوالاثر حفیظ کی طرح کتنے گیت لکھنے والے ہیں جنہوں نے ہیئت (کا یا؟) کے تجربے کرتے وقت موسیقی کی ادائیگی کا کتنا خیال رکھا۔ اور جب انہوں نے گیت کے ذہنی خاکے میں رنگ بھرے اور بندوں کی ساخت ایک خاص سکیم کے ماتحت مرتب کی یا مصرعوں کے ارکان کو گھٹایا یا بڑھایا تو اس میں سروں کی ترکیب اور پھیلاؤ کا بھی خیال رکھا؟

آپ کہیں گے اردو میں گیتوں کی عمر ہی کتنی ہے۔ اور گیت لکھنے والے ہی کتنے ہیں؟ گیتوں کی موجودہ تعداد اور ہمارے شاعروں کا ان سے شغف ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ اس لئے ایسی کڑی پابندیوں، یا کم سے کم ان کی امید بھی کچھ "پیش از مرگ" کی قبیل سمجھئے۔ مگر عرض یہ ہے کہ مندرجہ بالا پابندیوں یا فنی خاصوں سے چشم پوشی ایک اہم شاخسانے کی ذمہ دار ہے۔ یہ وہی ہے جس کا ذکر اس مبحث کے شروع میں ہوا تھا کہ "ہمارے گیتوں کے تمام مدارج کو سامنے رکھیں تو بعض مقام پر ایسے "گیتوں" سے بھی سابقہ پڑتا ہے جو گانے یا گلے جانے کی شرعی قید سے آزاد ہو گئے ہیں"۔ یہ گیت اس لحاظ سے تو گیت ضرور ہیں کہ ان میں ٹیپ یا استھائی کی تکرار موجود ہے جو وحدت قائم رکھتی ہے۔ ان کا موضوع بھی کوئی ہلکا سا احساس یا بے چینی یا سرشاری ہے، ان میں داخلی اندازِ نظر بھی ہے ــــ مگر ان باتوں کے باوجود یہ منظومات گیت کی نسبت نظم سے زیادہ قریب ہیں۔ شاید انہیں نظم کے طور پر ہی سوچا گیا۔ اسی لئے ان میں بندوں کی ساخت، مصرعوں کی ترکیب و ترتیب میں اس تجرباتی خصوصیت کو ملحوظ رکھا گیا جو اس دور کی بیشتر نظموں میں ملتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ گیت، اپنی نازکی کی بدولت اتنی تاب نہیں رکھتا کہ اس میں تخیلی یا فلسفیانہ عنصر زیادہ کر دیا جائے اور "سنگیت رویک" کا خاصہ کم کر دیا جائے۔ اگر گیتوں میں بھی تخیل کی وہی مرکزی اہمیت اور باقاعدگی در آئے جو غزل اور نظم کا مابہ الامتیاز ہے تو گیت خالص گیت نہیں رہتا۔ نظم کے قریب قریب کوئی منظومہ بن جاتا ہے۔

امتیاز کے یہ پردے بڑے ہلکے اور لطیف ہیں۔ گمر گیت نما نظموں کی بعض مشہور مثالیں حفیظ کا "جاگ سوزِ عشق جاگ" مقبول حسین احمد پوری کے منظومے "برات" (پیتم دیس بسانا ہوگا، اور نوحہ (حسین حسین!!) ساغر کی "پجارن"۔ تاثیر کا

غزلیہ منظومہ "میری وفائیں یاد کروگے" وغیرہ ہیں۔

(۴)

اردو میں زیادہ تر گیت اس وزن میں لکھے گئے ہیں جسے ہمارے ہاں فعلن فعلن یا فعل فعولن کے ارکان میں حلقہ بند کیا گیا ہے — ہندی کے بے شمار گیت، بلکہ ہندی شاعری کا بڑا حصہ اسی بحر کی خوابناک وسعتوں میں گم ہے۔

قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندی اور اس کے بعد اردو میں گیتوں کے لئے یہ بحر کیونکر مخصوص ہوگئی؟ اس تعین کے لئے ضروری ہے کہ اس بحر کے اصل اصول پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

اس بحر کا امتزاج علم عروض کا ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق شروع ہی میں میں اپنی کم علمی کا اعتراف کرتا ہوں گیتوں کی گھنی بڑھتی دھوپ چھاؤں میں چند لمحوں کے لئے جی لینا، اور ان لطف اندوزیوں کو آپ کے سامنے دہرانا ایک بات ہے، اور ایسی تحقیق بالکل دوسری چیز ہے۔ میرے ناکافی اور مختصر مطالعہ کی شہادت یہی ہے کہ عربی کے کلاسیکی ادب میں ہر قسم کی اختاں خیزاں بحریں تو ملتی ہیں، اور ان میں عجیب و غریب قسم کے زحافات ہیں۔ معقد اشعار ہیں۔ دو رکنی اور سہ رکنی تلامذے بھی ہیں۔ اور حد یہ ہے کہ صدر و ابتدا کے الٹ پھیر بھی ہیں، لیکن اس بحر کا وجود نہیں — عربی شعر و ادب کی مستند کتاب ابن قتیبہ کی الشعر والشعراء میں بھی اس کا سراغ نہیں ملتا۔

فارسی کی طرف آئیے تو یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فارسی عروض خلیل بن احمد بصری کے عروض سے بہت جلد الگ ہوگیا تھا اور تیسرے قرن میں (یعنی ۳۲۹ ہجری تک یقیناً) بہت کچھ ترقی کر چکا تھا۔ لیکن بحروں میں ایجاز اور ایجاد کی طلسم بندیاں متاخرین نے ہی کیں۔ یہ وزن بھی متاخرین ہی کی طباعی کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ پروفیسر محمود شیرانی مرحوم نے اپنے فاضلانہ مقالے "فارسی شاعری کی قدامت" (مطبوعہ "سہیل" ۱۹۲۶ء) میں تحریر فرمایا ہے کہ جو اوزان متاخرین کی کوششوں کا نتیجہ ہیں ان میں سے یہ بھی ہے — اس کی چار رکنی مثال انہوں نے حضرت امیر خسرو کے اس شعر سے دی ہے ؎

رائے پتھورا پورے داشت   پور نگویم حورے داشت

اس کی ایک اور مثال میرزا بیدل کا یہ بیمثال شعر ہے جس میں رکن فعلن بحرکت عین استعمال کیا گیا ہے ؎

چہ بود سرو کار بغلط سبقاں در علم و عمل بفسانہ زدن
بہ قبول دلائل بے خبری ہمہ تیر خطا بہ نشانہ زدن!!

لیکن فارسی میں اس بحر کے جوہر نہ کھلے۔ شاید اس کی نرمی اور نزاکت بیدل (جنہوں نے اس بحر کو اور بحر کامل متفاعلن آٹھ بار کو رواج دیا) کی زبانِ فارسی کی توانا بھنائی کی تاب نہ لاسکتی تھی۔ اس بحر کے اصل جوہر اردو میں آکر نمایاں ہوئے۔ جو دنیا کی دو شیریں ترین زبانوں یعنی فارسی اور برج بھاشا کا ریختہ تھی!!

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اردو میں سب سے پہلے کس شاعر نے اسے رواج دیا۔ استاد مصحفی نے قدما میں سے ایک صاحب مجبور سے خاں آشفتہ کی غزل اسی بحر میں اپنے تذکرۂ ہندی گویاں میں نقل کی ہے۔ بہر حال اس کا اولیں پرستار کوئی بھی ہو، یہ حقیقت ہے کہ اردو میں اس کا سب سے بڑا عاشق میر تقی میر کا چوٹ کھایا ہوا دل تھا۔ جن کے چھ دیوان ہر دوسرے تیسرے صفحے پر اسی بحر کی غزل در غزل سے مالا مال ہیں — یہ بحر میر صاحب کی افتادِ شعری کے لئے موزوں بھی تھی۔ کیونکہ اس میں وہی نرمی، وہی گداز، وہی ٹھہراؤ، وہی سنجیدہ سی موسیقی، اور پُر وقار آہنگ موجود ہے۔

جو میر صاحب کے دلِ گداختہ کی جان تھا۔ میر صاحب کی بدولت ہی یہ بحر اردو میں چل نکلی۔ لیکن متوسطین اور متاخرین نے اسے اتنی اہمیت نہ دی۔ غالب جیسے شاعر کے ...! شعروں والے مروّجہ دیوان میں اس کا وجود نہیں.... موجودہ دور میں جب غزل نے پھر سے سنبھالا لیا تو نواب سیّد علی محمد خاں شادؔ عظیم آبادی اور مرحوم فانیؔ نے اس بحر کو محبوبیت کا درجہ دیا.... اور ہمارے موجودہ نظم نگاروں میں شادؔ عارفی رامپوری اور میراجیؔ نے اس میں اپنی زبردست قدرت کے جوہر دکھائے۔

ہندی میں چنگل کے اوزان اس کا بدل تھے، پرانے ہندی گیت، زیادہ تر اسی بحر میں ہیں۔ مگر دوہوں، پدوں اور چھندوں یا دوہہ نما گیتوں یا پد کی طرح کے متصوفانہ گیتوں (جنہیں غلطی سے بھجن کہہ دیا جاتا ہے) کی بحریں جُداگانہ تھیں۔ اردو میں گیتوں کا آغاز بھی اسی بحر سے ہوا اور زیادہ گیت اسی بحر کے خوابناک ٹھہراؤ اور گھمبیر سنگیت میں ڈھلتے رہے (اگرچہ اردو گیتوں کی پہلی مسلم الثبوت شخصیت یعنی حفیظؔ جالندھری کے ہاں دوسری اور خالصتًا فارسی بحروں کے بھی گیت بکثرت ملتے ہیں) اس رواج کے پس منظر میں مندرجہ ذیل باتیں تھیں:۔

(الف)۔ اردو گیتوں کا رواج جیسے بھی ہوا یہ ظاہر ہے کہ ان کا مبداءِ فیض غزل کے برعکس فارسی شاعری نہیں تھا کیونکہ فارسی میں پہلے پہل تو گیتوں کو کوئی ادبی حیثیت نہیں ملی۔ موجودہ زمانے میں جب فارسی شاعری ادب و شعر کی کتابی اور خیالی بلندیوں سے اتر کر عام لوگوں کی سطح پر آگئی تو سیاسی ضرورتوں نے گیت نما چیزوں کو رواج دیا۔ جنہیں "تصنیف" کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو استاد براؤن، تاریخ ادبیات ایران جلد چہارم)

(ب)۔ اردو گیتوں کا مبداء اس لئے ہندی گیت تھے۔ لیکن اردو گیتوں کی صنف واضح طور پر اس وقت ظہور میں آئی، جب ہندی اور اردو الگ الگ زبانیں بن چکی تھیں اور سیاسی کرمفرماؤں نے انہیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار کر دیا تھا۔ اس لئے بلاواسطہ تاثر کا موقع نہ ملا۔

(ج)۔ ہندی شاعری اور اس کی مایۂ ناز چیز گیت انیسویں صدی کے وسط تک محض گورکھ دھندا بن چکی تھی۔ اور گیتوں کا تو گلا ہی گھٹ چکا تھا۔ ہندی کی حیاتِ ثانی اور گیتوں کا دوسرا جیون بھارتیندو ہریشچندر کی بدولت ہے۔ یہ لگ بھگ انیسویں صدی کے آخری بیس پچیس برسوں کا زمانہ ہے۔ اس وقت اردو گیتوں کا وجود نہ تھا۔ اس لئے بلاواسطہ تاثر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اردو میں گیتوں کے ایک پیشرو مرحوم عظمت اللہ خاں دہلوی اپنی شاعری میں ہندی ہی سے متاثر تھے۔ اور انہوں نے اردو غزل کے "روایتی عاشق" کا پیچھا چھوڑ کر ہندی شاعری کی "برہن" کو خیالوں کا مرکز بنایا۔ انہوں نے ہندی بحریں بھی اپنائیں اور اس طرح اپنی زیادہ نظمیں اسی بحر میں لکھیں جو اس وقت ہمارے زیرِ بحث ہے۔ اس وقت کے نئے شاعروں نے واضح طور پر مرحوم عظمت اللہ خاں کا اثر بھی قبول کیا۔ اور اختر شیرانی نے تو ان کے تتبع ہی میں اپنا مشہور گیت (میں جی سے کیسے بھلاؤں سکھی میرے جی کو جو آکے لبھا ہی گئے) بھی لکھا —— لیکن وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حفیظ بھی عظمت اللہ خاں سے متاثر ہو کر گیت لکھنے پر مجبور ہوئے —— کم سے کم اس تاثر کا کوئی عکس ان کے گیتوں کی بحروں میں تو نہیں ملتا!!

(د)۔ چنانچہ ہندی شاعری اور عظمت اللہ خاں کے اثرات کا معاملہ کمزور ہے۔ دوسرے عواقب کے سلسلے میں

سب سے پہلے ایک بات ذہن میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخری زمانے اور بیسویں صدی کے پہلے بیس ایک برس تک ہندوستان میں تھیٹر کا طوطی بولتا رہا۔ تھیٹر کی اس مقبولیت کے پس منظر میں امانت کی "اندر سبھا" اور "رہس" تھی جسے قیصر باغ کے الف لیلوی ماحول میں جانِ عالم اختر پیا (تاجدار اودھ) نے کبھی کھیلا تھا۔ امانت کی "اندر سبھا" نواب مرزا شوق کی مثنوی "زہرِ عشق" اور جانِ عالم کی "رہس" کو آج ہم آپ اوپیرا کہیں یا اسٹیج ڈراما سمجھیں۔ یہ واقعہ ہے کہ انہی کی بدولت حکومت لٹ جانے کے بعد بھی اسٹیج زندہ ہوئی اور مغرب زدہ متوسّل پارسیوں نے اسے باقاعدہ رواج دیا۔

تھیٹر کا رواج ہوا تو ہندوستانی اس کے دیوانے ہو گئے۔ ڈراموں کی مانگ ہوئی تو ترجموں کی بھرمار ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ "طبعزاد" کا بھی طوفان اٹھا۔ ان ڈراموں کے مکالموں کی ادائیگی کا ڈھنگ خاص تھا جس کے موجد شاید کاؤس جی کھٹاؤ تھے۔ اس خاص ڈھنگ کی بدولت سمجھئے، یا ہماری پرانی نثر کا اثر کہئے کہ مکالموں میں مقفٰی عبارتیں اور (زورِ کلام کے لئے) شعر ضروری قرار پائے —

جانِ عالم کی "رہس" اور امانت کی "اندر سبھا" کا سارا جادو گانے کی بدولت تھا۔ نثر میں ڈرامے لکھے گئے تو گانے ضروری جزو قرار پائے۔ چنانچہ غزلیں اور موزوں عبارتیں، تھیٹر کی اصطلاح میں "گانے" تصنیف کئے گئے۔

تھیٹر کے ان گانوں میں آپ کو ہر قسم کے موزوں وغیر موزوں مقفّیٰ اور بے قافیہ کلام سے واسطہ پڑے گا۔ بعض چیزیں ایسی بھی ملیں گی جو موجودہ معیار کے اعتبار سے بھی گیت کہی جا سکتی ہیں — مگر یہ یاد رہے کہ انہیں گانے کے بولوں کی حیثیت ہی سے سوچا گیا اور لکھا گیا۔ ان میں گیت کے احساس کی وحدت اور تکنیک کے لئے ہم آہنگی کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا — تھیٹر کے ڈرامہ نگاروں کے پیشِ نظر صرف ایک چیز تھی اور وہ یہ کہ منظر کی صورت کے مطابق ایسے جملے ایک لڑی میں پروئے جائیں جو کسی چلتی ہوئی دھن پر بٹھائے جا سکیں۔ اس لئے ان ٹکڑوں کی میزان شعر کی بحر سے کہیں زیادہ دادرہ اور ٹھیکہ جیسی تالیں[1] تھیں۔

---

[1] ان گانوں کے پس منظر میں ہندوستانی موسیقی کے وہ نغماتی مرکب Composition تھے جو دھرپد سے لے کر خیال تک کی گائیکی کے بولوں کی صورت میں آج تک رائج ہیں۔ تھیٹر کے عروج تک دھرپد اور خیال اپنے عروج کے سب مراحل طے کر چکے تھے۔ ان کے علاوہ ترانے، ترووٹ، ٹھمریاں، ٹپے اور دادرے بھی بے حد ترقی پا چکے تھے۔ ہندوستانی سنگیت کے ان تمام اصناف میں آپ کو ہر قسم کے "بول" ملیں گے۔ اگر ان میں اردو فارسی یا ہندی کے اوزان پر پورے اترنے والے ٹکڑے مل جائیں تو انہیں حضرت امیر خسرو، نائک گوپال، سید محمد بلگرامی، میاں صاحب تان سین اور نعمت خاں سدا رنگ جیسی عظیم الشان ہستیوں کی طبع کا ایک معجزہ سمجھئے جن کے لئے سنگیت اور شعر ایک دوسرے کا بدل بن چکے تھے۔ عام طور پر ان بولوں میں موزوں اور غیر موزوں ٹکڑے ملتے ہیں، یا دو دو تین تین بحروں کے سالم یا ناقص ارکان — چھوٹے بڑے ٹکڑوں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ اکثر جگہ تو آپ کو سیدھی سادی نثر سے واسطہ پڑتا ہے جس میں کوئی بات ادا کی گئی ہے۔

ہندوستانی سنگیت سے فنی طور پر جو حضرات روشناس نہیں انہیں یہ سن کر بڑی حیرت ہوگی کہ نثر بھی گائی جا سکتی ہے! (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(پہلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) کیونکہ عام طور پر کسی نہ کسی قسم کا وزن ترنم۔ نغمہ۔ آہنگ، وران کی ترقی یافتہ صورت یعنی موسیقی کے لئے ضروری خیال کیا جاتا ہے —— میری عرضداشت یہ ہے کہ نثر کے یہ بول آپ کے خیال میں نثر ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ آپ کے ذہن کے ترنم (جس کی بنیاد شعری اوزان پر ہوتی ہے) پر پورے نہیں اترتے۔ یعنی یہ بول بحر میں نہیں ہوتے۔ مگر ان کے لئے موسیقی والوں کا اپنا وزن، ان کی اپنی بحریں موجود ہیں۔ اور یہ ہیں ہندوستانی موسیقی کی وہ بے شمار مروج اور غیر مروج تالیں، جو مردنگ اور پکھاوج سے لیکر طبلے اور ڈھولک تک پر بجائی جاتی رہی ہیں۔ جنہیں آپ نثر سمجھ کر بحر سے خارج قرار دیتے ہیں وہ موسیقی والوں کے لئے باقاعدہ نظم ہے۔ کیونکہ ان کے وزن یعنی تال پر پوری طرح سے بٹھائی گئی ہے۔

یہاں پہنچ کر شعر اور موسیقی کے وزن اور بحر کی بحث ترنم اور آہنگ Rhythm کی بحث سے آن ملتی ہے!! آپ کہیں گے شعری اوزان کی بنیاد کسی نہ کسی ترنم اور آہنگ پر ہے۔ ادھر تال بھی ایک آواز یا دو آوازوں کے تواتر اور ان کے تسلسل کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے شعری اوزان کے بنیادی آہنگ اور تال کا صوتی تواتر ایک چیز ہے، پھر وزنِ شعر اور وزنِ موسیقی میں یہ تضاد، یہ تفاوت کیسا؟ —— اور اس اعتبار سے نثر کا گایا جانا، چہ معنی دارد؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ابتدا تو شاید ہر شے کی ایک شے ہی ہو۔ مگر جب منبع سے ایک دھارا جدا ہوتی ہے، اور پہاڑوں ندیوں اور میدانوں سے ہوتی ہوئی ہم آپ تک پہنچتی ہے تو اس کی شکل و صورت، مزاج اور انداز کا دار و مدار ان علاقوں پر ہے جہاں جہاں سے اس کا گزر ہوا، اسی منبع سے پھوٹنے والی دوسری دھارا ہمارے پاس پہنچنے تک ممکن ہے اتنی بدل جائے، کہ با ہمدیگر صورت بھی پہچانی نہ جائے!! ——

چنانچہ شعری اوزان اور موسیقی کے اوزان کا مبدا تو وہی صوتی تواتر۔ آہنگ یا ترنم سہی۔ مگر موسیقی اور شاعری نے صوتی تواتر آہنگ اور ترنم کی اس بنیادی بات کو جداگانہ تاثر اور جداگانہ حیثیت دیکر پیش کیا۔ نوع الگ الگ تھی تو ہو، مگر اصل اور فروع کا ارتقا ان کا مقصد اور ان کا کام جداگانہ حیثیت اختیار کر گیا۔ اس لئے جب شعر اور موسیقی ترقی یافتہ صورت میں تہذیب کا عنصر بنے تو ان کے اوزان، ان اوزان پر لکھے ہوئے کلام اور ان کے مقصدوں میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ——

دوسری بات جو پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی سنگیت میں ہر بول ایسا نہیں جو آپ کے اوزان سے خارج ہو —— اس کے برعکس بڑے بڑے سنگیت رتنوں نے فن کی بلندیوں پر پہنچ کر بولوں اور راگوں کے جو طلسم باندھے ہیں ان میں اعلیٰ شاعری اور اعلیٰ سنگیت دونوں کی روح کھنچ کر آ گئی ہے۔ اس لئے وہ آپ کے وزن (عام طور پر فعلن فعلن یا فعل فعولن یا پنگل کے وزن) پر پورے اترتے ہیں۔ اس کی مثالیں حضرت امیر خسرو اور میاں صاحب تان سین کی باندھی ہوئی دھرپدیں اور نعمت خاں سدا رنگ کے خیال ہیں، جو بجائے خود بڑے خوبصورت گیت ہیں۔ طوالت نے صرف ایک مثال درج کرنے کی اجازت دی ہے:۔

پیاری نویلی لاڈلی رادھکا
لاڈ کری بو
للن سنت ہنس رس کی بتیاں
کرت پیار ——

رہس رہس ڈولے آنگنوا
سنگ لئے سب سکھیاں آلی
پریم رنگ رس سدا رنگیلے
شیتل گات

پیاری نویلی لاڈلی رادھکا!!
پیاری نویلی لاڈلی رادھکا

چنانچہ ہمارے شاعر ان گانوں سے "گیت" کی حیثیت سے نہیں "گانے" کی حیثیت سے روشناس تھے وہ شاید انہیں گیت یعنی لفظ و نغمہ کا فنی توازن نہیں سمجھتے تھے ــــ اس لئے ہندستانی سنگیت کے پس منظر اور نقیضہ کے ان گانوں سے فعلن فعلن کا استدراک اور گیتوں کیلئے اس بحر کی تخصیص ثابت نہیں ہوتی۔

(س) موجودہ دور کی طرف آئیے تو حفیظ کے بعد جن لوگوں نے گیتوں کی طرف پہلے پہل خاص توجہ دی اور اپنے کامیاب گیتوں کی بدولت دوسروں کو اس صنفِ سخن پر مائل کیا اُن میں مقبول حسین احمدپوری، میراجی اور راندر جیت شرما کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گیتوں کو اس بے مثال بحر میں گنگنایا اور اس کی سُر اَولیوں کو گیت کا روپ دیا۔

فکری ارتقا کے لحاظ سے ان تینوں کو عظمت اللّٰہ خاں کا ساتھی کہنا چاہئے عظمت اللّٰہ خاں ہندی شاعری سے خوب واقف تھے۔ اندر جیت شرما برہمن زاد ہونے کیوجہ سے ہندی اور سنسکرت ادب سے متعارف ہیں، کیونکہ ان کے لئے یہ ایک نسلی اور مذہبی ضرورت ہے۔ اردو شعر و ادب ایک ثقافتی تقاضہ کہئے۔ چنانچہ جہاں انہوں نے اردو میں نظمیں غزلیں بھی لکھیں وہاں گیتوں کے تقاضے کو بھی پورا کیا، اور حق یہ ہے کہ خوب پورا کیا! مقبول حسین احمدپوری نے جانے کن حالات یا ذوق کے کن تقاضوں سے مجبور ہو کر ہندی شعر و ادب سے رسم بڑھائی اور پھر قلم اٹھایا تو ہندی سے متاثر جذبوں اور سرشار خیالوں نے انہیں گیتوں کا شاعر بنا دیا۔ انہوں نے ہر قسم کے گیت لکھے ہیں۔ بعض کی زبان ہندی ہے، بعض کی خالص برج بھاشا اور بعض اس خوبصورت اور بے مثال زبان میں لکھے گئے ہیں جس میں حضرت آرزو لکھنوی کی "سریلی بانسری" کی غزلیں (یعنی بقول انکے "خالص اردو") موجود ہیں۔ یہ وہی زبان ہے جسے آجکل کے لسانی ماہر "بنیادی اردو" اور سیاسی مفکر "ہندستانی" کہتے ہیں۔

ادھر میراجی کی شاعری کا ماحول ہر قید سے آزاد ہونے اور انکی جدید خیالی کے باوجود براہِ راست بھارت سے تعلق رکھتا ہے۔ انکے ذہن پہ بھی شرنی روایات حاوی ہیں جن سے کبیر اور میرا بائی کے عبودیت سے سرشار دلوں نے شعر اور موسیقی کا اکتساب کیا تھا۔ اس لئے ایک طرح سے گیت انکی ذہانت کے صحیح مظہر ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ حفیظ کے بعد گیتوں کی جوت شاید ماند پڑ جاتی، اگر میراجی اس طرح متوجہ نہ ہوتے۔ انکے گیتوں کی زبان بڑی ہلکی، بڑی سادہ اور بیحد شیریں ہے۔

ان تینوں کا شعری ماحول ظاہر ہے کہ ذہنی یا داروانی طور پر ہندی سے متاثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گیتوں کے ان باقاعدہ پرستاروں کے ہاں اسی بحر میں گیتوں کا سراغ ملتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہی لوگوں کے طفیل ہی اردو گیتوں کیلئے یہ بحر مخصوص سی ہو کر رہ گئی اور اس کی بنیاد وہی تاثر قرار پایا جو بلاواسطہ یا بالواسطہ ان لوگوں نے ہندی شاعری سے لیا۔

آخر میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں گیتوں میں اتنی تاب نہیں ہوتی کہ آپ انہیں علمیت یا شاعرانہ بصیرت کے بل بوتے پر پڑھ سکیں، اور اگر آپ میں کچھ تحمل کا مادہ بھی ہے تو اُن پر غور کرنے کے بعد کچھ اخذ کر سکیں۔ شاید بیشتر گیتوں میں غزلوں کا سا چونچلا اور چٹیلا پن بھی موجود نہیں ہوتا جو فرصت کے لمحوں میں بعض طبیعتوں کی "تماش بینی" کو آسودہ کر سکے۔ گیت ناصبوری کی ہلکی اور گہری لگاوٹیں ہیں جو ایک خاص نغمگی کی وساطت سے لفظوں میں آسکی ہیں۔ انکا رنگ دل پر اس صورت میں جم سکتا ہے کہ دل کی دھڑکنوں سے وہ لگاوٹیں خود چھیڑ کریں۔ انکا صحیح ادراک اسی صورت میں ممکن ہے کہ آپ کا ذہن انکی موسیقی اور ترنم سے ہم آہنگ ہو جائے۔ بقول اشتری الف لیلیٰ و لیلہ اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب پڑھنے والا خود بھی گیارھویں صدی کے بغداد میں سانس لینے لگے۔

طفیل احمد

اُردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کا مسئلہ

اُردو زبان اپنے ارتقا کی ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی ہے۔ جہاں اُس کو بغیر کسی دقت کے اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کی مثال بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس یونیورسٹی میں اُردو کو جس خاص انداز اور جس خاص شکل میں اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا ہے ممکن ہے۔ اُس کی بعض خصوصیات سے ہمیں اور آپ کو اختلاف ہو۔ لیکن اُس سے یہ حقیقت نہیں بدلتی کہ اُردو میں اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بننے کی صلاحیت پورے طور سے پیدا ہو چکی ہے۔ بلکہ اب تو یہ صورت ہے کہ اگر اس کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ نہ بنایا گیا۔ تو اس کے تنزل کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ارتقا کے دروازے اُس پر بند ہونے لگیں گے۔ اور اس کی صلاحیتیں استعمال کے بغیر تلف ہونے لگیں گی۔ ایک خاص عمر کو پہنچ جانے کے بعد اگر کسی ہٹے کٹے آدمی کی شادی نہ کر دی جائے۔ تو اس کی جسمانی اور دماغی صحت خراب ہونے لگتی ہے۔ آج وہی حال اردو کا ہے۔ جس کو اگر ایوانِ حکومت اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں جگہ نہ دی گئی تو اُس کا زوال شروع ہو جائے گا۔

زبان کا ارتقا سیاسی ارتقا کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ جو ممالک یا قومیں سیاسی اعتبار سے پسماندہ ہوتی ہیں اُن کی زبان بھی پچھڑی ہوئی ہوتی ہے۔ زبان کا مطالبہ قومی سیاسی تحریک کا ایک اہم مقصد ہوتا ہے۔ قومی زبان قومی سیاسی تحریک کا وسیلہ بن کر ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے۔ سیاسی تحریک سے نئی تہذیبی اور تمدنی ضروریات پیدا ہوتی ہیں اور زبان اُن کی تکمیل کا ذریعہ اور وسیلہ بن کر تبدیلی اور ترقی سے آشنا ہوتی ہے۔ دُنیا کی تمام جدید زبانوں کے ارتقا و عروج کی داستان قوموں کے وجود میں آنے اور آزاد سیاسی حیثیت اختیار کرنے کی داستان سے وابستہ و ہم آہنگ رہی ہے۔ برِ اعظم ہند کی تحریک آزادی کے مختلف منازل و ادوار کا اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو اردو کے ارتقا کے مختلف منازل و ادوار بھی اُس سے ہم آہنگ اور متوازی نظر آئیں گے۔ چنانچہ یہ فطری امر ہے کہ جب ہماری نصف صدی کی سیاسی تحریک کے تہذیبی نصب العین کو عملی شکل اختیار کرنے سے نہ روکیں، زبان کے ضمن میں اپنی پچھلی سیاسی تحریک کو نتیجہ خیز بنانے کی کوشش کریں۔ دوسرے لفظوں میں آزادی کی جدوجہد کو کامیاب و کامران اور بامعنی بنائیں۔ اس لئے کہ سیاست بہر حال ایک ذریعہ اور وسیلہ ہونے کی حیثیت رکھتی ہے، وہ اپنا مقصد آپ نہیں ہو سکتی۔ سیاست کا اگر کوئی مقصد ہے تو صرف تہذیبی اور تمدنی ترقی۔ اگر اُردو کو ہم اُس کا جائز مقام نہ بخش سکے۔ تو اس کے یہ معنی ہوں گے۔ کہ جدوجہد کے پچھلے دور میں جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو آ کر ختم ہوا ہے۔ ہماری سیاست بے مقصد تھی بغرض جس رائے عامہ پر ہماری سیاسی تحریک اب تک مبنی رہی ہے۔ اور جو آج سیاسی اقتدار کی حامل ہے۔ وہ چیخ چیخ کر مطالبہ کر رہی ہے۔ کہ اُردو کو ایک نئی سیاسی اور تعلیمی حیثیت دی جائے۔

قطع نظر اس سے کہ اُردو پاکستان کے کسی بھی علاقے کی بول چال کی زبان نہیں ہے۔ اور کھڑی بولی کی جس اساس پر اُس کا شاندار محل تعمیر ہوا ہے وہ پاکستان کے لسانی علاقوں کی بولیوں سے مختلف ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج اگر پاکستان کے مختلف صوبوں اور لسانی و تہذیبی علاقوں میں تہذیبی اشتراک اور تہذیبی تعلقات کا کوئی ذریعہ ہے تو وہ صرف اُردو ہے۔ خالص تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو طلبا کے دماغ کو آج کسی غیر زبان کی دستبرد سے بچایا جا سکتا ہے۔ تو صرف اُردو ہی کے ذریعہ۔ آج طلبا کی عمر کے سب سے قیمتی حصّے کو اصل مضامین کی بجائے صرف وسیلۂ اظہار کی نذر ہو جانے سے بچایا جا سکتا

ہے۔ تو صرف اردو ہی کے ذریعے۔ اور یہ تمام باتیں پاکستانی پنجاب نے اُردو کے جدید ادب اور جدید صحافت نگاری کی تخلیق و تعمیر میں سب سے نمایاں حصہ لیا ہے۔

غرض ہماری تحریک آزادی، اور قیام پاکستان کا منطقی نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہم اُردو کو جلد از جلد اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنائیں۔ جو لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کی کوشش سے بعض لاینحل مسائل وابستہ ہیں۔ جب تک اُن کا حل نہ تلاش کر لیا جائے اُس وقت تک یہ اقدام نہ کیا جائے۔ لیکن یہ تو گاڑی کو گھوڑے کے آگے رکھنے کے مرادف ہوا۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ایسے مسائل ہیں اور مزید پیدا ہوں گے۔ لیکن جب تک اس زبان کو اعلیٰ تعلیم میں دخیل نہ کیا جائے اُس وقت تک اُن مسائل کا حل ہونا تو ایک طرف اُن کے اُٹھنے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ غیر ممکن ہے کہ اعلیٰ تعلیم اور اردو سے متعلق تمام موجودہ اور آئندہ مسائل کو ایک ہی بار حل کر لیا جائے۔ مسائل بتدریج پیدا ہوں گے۔ اور ان کو بتدریج حل کیا جائے گا اُردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے لئے فلکیات کی تمام اصطلاحوں کے وضع ہو جانے کا انتظار کرنا زبان کی فطرت اور سرشت سے ناآگاہی کا ثبوت دینا ہے۔ یا مسئلہ کو ٹالنے کے مرادف ہے۔ دُنیا کی کوئی بھی زبان اس طرح ترقی نہیں کرتی۔ جب ایک بار اُردو کے ذریعہ تعلیم ہونے کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ تو آہستہ آہستہ مسائل سامنے آئیں گے۔ اور ان کو بتدریج اور ایک ایک کر کے حل کیا جائے گا۔

اُردو زبان کو یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کئے جانے کے ضمن میں سب سے بڑا اور عام بہانہ علمی اصطلاحات کا کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اصطلاحات کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے لیکن وہ یقیناً لاینحل نہیں ہے۔ ہاں البتہ جس انداز سے اس مسئلے کو دیکھا جا رہا ہے۔ وہ البتہ اُسے لاینحل بنا دے گا۔ لیکن وہ انداز زبان کی فطرت اور سرشت سے ناواقفیت پر مبنی ہے اور اُس سے زبان کے ارتقاء و عروج کے بنیادی اور فطری اصولوں سے ناآگاہی کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ایک نہایت ہی عام اور خطرناک غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اگر ہم طبیعیات کی اعلیٰ تعلیم کو اُردو میں رائج کرنا چاہتے ہیں تو اُس سے پہلے اُس کی تمام انگریزی اصطلاحوں کا عربی و فارسی الفاظ میں ترجمہ ہو جانا ضروری ہے۔ یہ خیال اگر ایک طرف نقصان دہ قسم کی قدامت پرستی کا پتہ دیتا ہے تو دوسری طرف لسانیات کے سائنٹیفک اصولوں سے ناواقفیت کا۔ دُنیا کی کوئی بھی زبان یقیناً اس طرح نہیں پھیلتی اور بڑھتی، یہ اس کی سرشت کے منافی ہے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ معاشرتی علوم (SOCIAL SCIENCES) کے مقابلے میں طبیعی علوم (PHYSICAL SCIENCES) میں اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کی گنجائش اور بھی کم ہے۔ اس لئے کہ عربی و فارسی کی وساطت سے معاشرتی علوم کا کچھ پس منظر ہماری زبان میں موجود ہے۔ لیکن طبیعی علوم کا بہت کم ہے۔

بہر حال اصطلاحات کے ضمن میں ہم کسی ایک طریقے سے کام نہیں لے سکتے۔ ہمیں اُن تمام شعوری اور غیر شعوری طریقوں سے کام لینا ہے جن سے ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان کے جزو لاینفک بن جاتے ہیں چنانچہ ہمارے ذہن میں چار طریقے ہیں جن سے کہ ہم اصطلاحات کا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔

(۱) انگریزی اصطلاحات کے جو بدل ہماری زبان میں پہلے سے موجود اور رائج ہیں ان کو اختیار کریں چاہے اُن کا مخرج کوئی بھی زبان ہو۔ فارسی ہو یا عربی، ترکی یا سنسکرت یا فرانسیسی۔

(۲) نئی اصطلاحات کا خیال رکھیں اور ان میں بدل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ موجودہ طرز تعلیم نے پڑھے لکھے طبقے اور

عوام کے درمیان مجلسی مغایرت اور لاعلمی کی اتنی مضبوط دیواریں کھڑی کر دی ہیں کہ ہم روز مرّہ الفاظ و اصطلاحات جو عوام کی روزمرّہ کی زبان میں رائج ہیں۔ ہم فارسی، عربی کی لغات میں ان کو تلاش کرتے اور بے ڈھنگی قسم کی نئی نئی اصطلاحات وضع کرنے پر مجبور ہیں۔ مثلاً میں لفظ نرما کے رہتے ہوئے LONG STAPLE COTTON کے لئے کسی فارسی یا عربی اصطلاح کو زبردستی رائج کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ اگر ہم اپنے صوبہ کے چھوٹے قصبات کی کاروباری زندگی کا مطالعہ کریں۔ تو ہمیں زرعی خرید و فروخت AGRICULTURAL MARKETING اور کامرس کی بہت سی اصطلاحیں مل جائیں گی یا عام اصطلاحات وضع کرنے کے ذرائع اور وسائل دستیاب ہو جائیں گے۔ بمبئی، کلکتہ اور کراچی کے دلّالوں سے مل کر ہم اسٹاک ایکسچینج کی بہت سی اصطلاحیں حاصل کر سکتے ہیں۔ زراعت کی بے شمار اصطلاحات حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنے کندھوں پر لغات لادے پھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ کاشت کار کی زندگی کے مطالعے کی حاجت ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جو الفاظ اور اصطلاحیں عام بول چال کی زبان میں رائج ہیں۔ وہ اب تک اس لئے ارتقا پذیر ہو کر سائنٹیفک اصطلاحات کا درجہ نہیں حاصل کر سکی ہیں کہ ہماری زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ نہیں بنایا گیا ہے۔ جب اس کو یہ حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ اس کے بعد اس کا ہماری زبان میں در آنا ایک فطری امر ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ کہ جب تک کسی زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اس وقت تک اس کی ترقی کے راستے مسدود رہتے ہیں

عام بول چال کے الفاظ و اصطلاحات کا ارتقا پذیر ہو کر علوم میں داخل ہونا ہی وہ منزل ہے جب پنجابی بولی (DIALECT) اُردو کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ میں پنجابی اور اُردو کو ایک دوسرے کا دشمن نہیں قرار دیتا۔ بلکہ دوست اور معاون۔ لسانیات کا سائنٹیفک مطالعہ بتاتا ہے۔ کہ دنیا کی کوئی بھی دو زبانیں ایک دوسرے کی دشمن نہیں ہیں۔ جب دنیا کی دو زبانیں ملتی ہیں۔ تو لازمی طور پر ایک دوسرے کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ نقصان اُس وقت ہوتا ہے جب مخصوص سیاسی اغراض کے تحت سرکاری اور تعلیمی امور میں ایک کو دوسری پر ترجیح دی جائے۔ مثلاً فطری طور پر تو اُردو کو انگریزی کے اثر سے فائدہ پہنچا ہے لیکن جب سیاسی پالیسی کے تحت انگریزی کو اُردو پر ترجیح دی گئی تو اُردو کو نقصان پہنچا۔ مغربی پنجاب میں اُردو کی بنیادوں کو مضبوط اور استوار کرنے کے لئے یہ ضروری ہوگا۔ کہ پنجابی بولی کے الفاظ و اصطلاحات کھڑی بولی کے ترقی یافتہ صوتی نظام کے سانچے میں ڈھل کر اردو کے ایوان میں داخل ہوں اور اُس کا ایک لازمی حصّہ بن جائیں اس کے لئے ضروری ہوگا۔ کہ پورے مغربی پنجاب میں حکومت کی طرف سے خواندگی کی مہم جاری کی جائے۔ جس میں پنجابی کے ساتھ اُردو کو لازمی قرار دیا جائے۔ تبھی وہ پورا معاشرتی اور تعلیمی عمل (PROCESS) پیدا ہوگا۔ جس کے تحت ہمارے تمام دیہاتی الفاظ و اصطلاحات ڈھل کر اور نکھر کر اُردو کے لئے قابلِ قبول ہو سکیں گے۔ اُردو کے قدم عوام کی زندگی میں گڑ جائیں گے۔ اور اس کا دامن حیات آمیز و حیات بخش الفاظ و اصطلاحات سے بھرپور ہو جائے گا۔ اور ایک ایسا ذخیرہ پیدا ہوگا۔ جس سے مستقبل میں ہم اپنے الفاظ و اصطلاحات کی تخلیق کر سکیں گے۔ یوں بھی پنجابی بولی کھڑی بولی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ انتقالِ آبادی کے باعث پنجابی پر کھڑی بولی کے اصطلاحی اثرات اور بھی بڑھ جائیں گے۔ اور پنجابی کے الفاظ و اصطلاحات اُردو کے سانچے میں ڈھل کر اُردو کو مالا مال کر دیں گے۔

(۳) الفاظ و اصطلاحات کے ضمن میں یہ بھی ضروری ہوگا۔ کہ بہت سی سائنسی اصطلاحات کو ہم اپنی زبان کے صوتی نظام SOUND PATTERN سے ہم آہنگ کریں۔ جیسے جدید ایرانی زبان میں ڈاکٹر کا دکتور ہو گیا ہے۔ اور PARASITE پارازیت اور اُردو میں CABINET کا کابینہ ہو گیا ہے۔ سائیکل والوں نے VALVE TUBE کو والو بنا لیا ہے۔ اب والو کوئی انگریزی لفظ نہیں ہے۔ یہ عمل شعوری بھی ہوگا۔ اور غیر شعوری بھی۔ جیسے کابینہ شعوری طور پر اُردو کا لفظ بن گیا ہے۔ اور

والٹو غیر شعوری طور پر۔

معاشرتی علوم میں تو کم لیکن طبیعی علوم میں ہمیں مغربی زبانوں کی بہت سی اصطلاحات جُوں کی تُوں لے لینی پڑیں گی۔ وہ کثرتِ استعمال سے خود بخود ہمارے زبان کے صوتی نظام سے ہم آہنگ ہو جائیں گی۔ اس سے ہماری زبان کی موسیقی اور خوش آہنگی پر کوئی مضر اثر نہیں پڑ سکتا۔ پھر یہ حقیقت بھی نہ بھولنی چاہیئے۔ کہ ہر زبان کا صوتی نظام بجائے خود ارتقا پذیر ہوتا رہتا ہے۔ یہ ارتقا خلا میں نہیں رونما ہوتا۔ بلکہ دوسری زبانوں کے الفاظ و اصطلاحات کے سہارے۔ کھڑی بولی کا صوتی نظام فارسی، عربی اور سنسکرت الفاظ کی بدولت ارتقا پذیر ہو کر اُردو کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اسی طرح انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کا اثر ہماری زبان پر پڑنا لازمی ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے۔ کہ مغربی زبانوں کے الفاظ و اصطلاحات اُردو میں داخل ہو کر ہمارے صوتی نظام میں ڈھل جائینگے اور اپنی اجنبیت کھو بیٹھیں گے۔ آخر ہم جو انگریزی یہاں بولتے ہیں۔ وہ کون سی خالص انگریزی ہے؟ تلفظ اور لب و لہجہ کے مطابق ہوتی ہے۔ روسی روسی لب و لہجہ میں انگریزی بولتا ہے۔ اُردو والے اُردو لب و لہجہ میں انگریزی بولتے ہیں۔ اور چینی اپنے چینی لب و لہجہ میں۔ اس کے یہ معنی ہیں۔ کہ روسی یا ہندوستانی یا چینی زبانوں کا صوتی نظام غیر مُلکی الفاظ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ یہ ایک فطری لسانی عمل ہے۔ چنانچہ ہمارے حلق کی ساخت اور صوتی نظام بھی انگریزی الفاظ و اصطلاحات پر حاوی ہو کر رہے گا۔ اس سے اُردو کی خوش آہنگی پر کوئی مضر اثر نہیں پڑ سکتا۔ ہمارا صوتی نظام مجروح ہونے کی بجائے ارتقا پذیر ہوگا۔ ٹھیک جس طرح کھڑی بولی کا صوتی نظام فارسی الفاظ کے سہارے ارتقا پذیر ہوا ہے۔ بہ مخصوص طور پر اس لئے ہوگا۔ کہ انگریزی بولتے ہوئے تو ہم انگریزی کے پورے پورے جملے ادا کرتے ہیں۔ اس لئے اس میں کچھ انگریزی صوتی نظام آ ہی جاتا ہے۔ اگرچہ اس کی پوری شکل اُردو کی ہوتی ہے۔ لیکن جب انگریزی کی الگ الگ اصطلاحیں ہماری زبان میں داخل ہوں گی۔ تو وہ اُردو کے صوتی نظام کے آگے اور بھی لاچار اور بے بس ہوں گی۔ اور ہم فوراً ہی اُن کو اپنے حلق کی ساخت مطابق کر لیں گے۔ ہمارے حلق کی ساخت تو کیا بگڑیگی خود انگریزی اصطلاحات اس کے سانچے میں ڈھل جائیں گی۔

یہ حقیقت بھی نہ بھولنی چاہیئے۔ کہ کسی زبان کا لازمی اور بنیادی حصہ اس کے صرف و نحو پر مشتمل ہوتا ہے۔ نہ کہ اس کے اسماء اور اصطلاحات پر۔ صرف و نحو میں تبدیلی بہت آہستہ آہستہ رُونما ہوتی ہے۔ لیکن زبان کے اندر الفاظ و اصطلاحات کی آمد و رفت کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ انگریزی اور یورپی اصطلاحات کی آمد سے ہماری زبان کا قواعدی ڈھانچہ تو نہیں بدل سکتا۔ اس لئے اُردو انگریزی نہیں ہو جائے گی۔ بلکہ اُردو ہی رہے گی۔ مثلاً ہم یہ کہیں کہ روڈ پر میں نے ایک ٹائم پیس پڑا ہوا دیکھا۔ تو اگرچہ یہ جملہ کچھ بھدا ہے۔ لیکن اگر کوئی آپ سے یہ پوچھے گا۔ کہ یہ جُملہ کس زبان کا ہے۔ تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ انگریزی کا جُملہ ہے۔ اس لئے کہ اس کا صرف و نحو اردو کا ہے۔ انگریزی کا نہیں۔ اگرچہ اس کے دو اسمار انگریزی کے ہیں۔ اسی طرح I SAW A HINDUSTANI IN THE JUNGLE یہ جُملہ اُردو کا نہیں ہے۔ بلکہ انگریزی کا ہے۔ اگرچہ اس میں دو الفاظ انگریزی کے ہیں۔ "مصنوعی RESPIRATION سے ہم قلب کو دوبارہ متحرک کر سکتے ہیں۔" یہ جُملہ اُردو کا ہوا نہ انگریزی کا۔ ڈبل روٹی اُردو کی اصطلاح ہے نہ کہ انگریزی کی۔

انگریزی میں سائنسی اصطلاحات کی آمد سے ہماری زبان کا علمی ذخیرہ مالا مال ہو جائے گا۔ ہر زبان کا علمی حصہ اسی طرح ترقی کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ترجمہ سے بھی ہم ضروری کام لیں گے۔ لیکن زبان کے ارتقا کے جو بنیادی اور خارجی اصول ہیں اور جن کو

ہم اپنی جذبات پرستی سے نہیں بدل سکتے۔ وہ ترجمہ کی گنجائش کو بہت محدود کر دیتے ہیں۔ چونکہ الفاظ و اصطلاحات محض SYMBOLS ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اسی وقت وجود میں آتے ہیں جب ان کے مظاہر (PHENOMENA) اور ان کے تجربات پہلے سے موجود ہوں۔ اگر ہماری زبان میں سائنس کی بیشتر اصطلاحات نہیں ہیں۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے بہت سے مظاہر کا تجربہ و تصور نہیں کیا ہے۔ لیکن دُنیا کے دوسرے گوشوں کے انسان نے ان کا تجربہ اور تصور کر لیا ہے۔ اس لئے ان کی زبان میں ان کے (SYMBOLS) بھی موجود ہیں یعنی الفاظ و اصطلاحات بجائے یہ تو سیدھا اور فطری طریقہ یہ ہے۔ کہ ہم ان SYMBOLS یعنی الفاظ و اصطلاحات کو بھی اپنی زبان میں داخل کر لیں۔ تاکہ اُن کے مظاہر کا تصوّر ہم اپنے ذہن میں لا سکیں۔ پُوری انسانی تہذیب اور علمی سرمایہ کو واحد اور ناقابلِ تقسیم سمجھنے کی بنا پر میں اسے قطعاً تضیع اوقات سمجھتا ہُوں۔ کہ مظاہر اور تصورات کے SYMBOLS جو فرانس یا ڈمبکٹو میں ہیں۔ ان کا ہم دوبارہ ترجمہ کرنے بیٹھ جائیں۔ چونکہ ہم اپنی قومی ترقی کی رفتار تیز کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم اس قسم کے تضیع اوقات کو اپنے مفاد کے منافی سمجھتے ہیں۔ یوں بھی یہ ایک ناممکن العمل سی شے ہے۔ اور لسانیاتی ارتقا میں اس قسم کی احمقانہ حرکت کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔ ترجمہ کی ہوئی اصطلاحیں کبھی بھی پُورے طور پر رائج نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے کہ اُن کے ساتھ وہ رابطے ASSOCIATIONS نہیں پیدا ہو سکتے۔ جو اس الفاظ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ الفاظ کا ترجمہ تو کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان کی ASSOCIATIONS کا نہیں۔ وہ صرف استعمال سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ترجمہ سے وہ ذہنی مقاصد نہیں پورے ہو سکتے۔ جو عام طور سے اس سے وابستہ کئے جاتے ہیں۔ چونکہ الفاظ مخصوص مظاہر سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ان مظاہر کا تصوّر ذہن میں لانے کے لئے ان الفاظ ہی کو لے لینا فطری اصُول کے مطابق ہے۔ ترجمہ شدہ الفاظ مظاہر کے SYMBOLS نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کا دھندلا سا عکس (SHADOW) ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور مظاہر سے بہت دُور ہٹ جاتے ہیں۔ اس سے طالب علم کے ذہن کو غیر ضروری طور پر ایک دوہرے عمل سے گذرنا پڑتا ہے۔ اور دماغی ارتقا کی رفتار سُست پڑ جاتی ہے۔ فارسی عربی و ترکی زبانوں سے تمام سائنسی اصطلاحات کا اُردو ترجمہ کرنا ناممکن العمل اور غیر لسانیاتی حرکت ہو گی۔ اس لئے کہ خود ایران و ترکی و بخارا و تاجکستان والے یورپی اصطلاحات یا تو اختیار کر رہے ہیں۔ یا ان کو ایڈیپٹ (ADAPT) کر رہے ہیں۔ آپ اپنی اصطلاحات کے لئے جسطرح فارسی و ترکی و عربی کو اپنا مخرج بنانا چاہتے ہیں۔ وہ خود ایران و عرب و ترکستان میں شکل بدل چکی ہے۔ لے دیکر عہدِ متوسط کی فارسی و عربی آپ کا تہذیبی مخرج رہ جاتی ہے۔ اب عہدِ متوسط سے ایسا بھی عشق کیا ؟ ذرا کسی ایرانی کے سامنے سعدیؒ والی فارسی بول کر دیکھئے کہ وہ آپ پر کس طرح مُسکراتا ہے۔

عام طور سے نیم جاہل لوگ یہ حوالے دیتے ہیں کہ انگریزی و فرانسیسی زبان کا اصطلاحاتی مخرج لاطینی رہی ہے۔ اس لئے یہ فطری امر ہے کہ ہم اپنا مخرج کلاسیکی زبانوں یعنی فارسی و عربی کو بنائیں۔ ایسے لوگ نہایت درجہ سطحی و چھچھلی معلومات کے ہوتے ہیں وہ یہ نہیں سوچتے کہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں نے اگر لاطینی یا یونانی کو اپنی بہت سی علمی اصطلاحات کا مخرج بنایا تو اس لئے نہیں کہ ان پر کوئی مذہبی جنون سوار تھا۔ بلکہ اس لئے کہ ان کو اس زمانے میں جدید اور انقلابی خیالات کے دھارے یا پُرانے علوم کی نئی توضیح یونانی و لاطینی زبانوں ہی میں مل سکتی تھی۔

نشاۃ الثانیہ RENAISSANCE خزانوں کے زیرِ اثر پہلے اٹلی ہی میں ہوا۔ عربی زبان جو عہدِ متوسط کی سب سے زیادہ علمی زبان تھی۔ اس کے بھی بے شمار الفاظ و اصطلاحات یورپی زبانوں میں رائج ہو گئیں۔ باوجود اس حقیقت کے کہ اس

زمانہ میں صلیبی جنگیں ہو رہی تھیں۔ تعصب اس راستہ میں حائل نہیں ہؤا۔ پھر زندگی سے متعلق جس دُنیادی (SECULAR) نقطۂ نظر کی انہیں تلاش تھی۔ وہ عہد متوسط کے ہزار سالہ تاریک عہد سے پہلے کی یونانی اور رومی زبانوں ہی میں مل سکتا تھا۔ یا عہد متوسط کی عربی زبان میں۔ اس لئے لازمی و لابدی طور پر انگریزی و فرانسیسی زبانوں کی علمی اصطلاحات کا مخرج لاطینی اور یونانی زبانیں بن گئیں۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ آج ہمیں جدید ترین اور انقلابی خیالات کے دھارے اور مخصوص دُنیادی (SECULAR) نقطۂ نظر جس پر سائنس مبنی ہے کن زبانوں سے مل سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ فارسی عربی نہیں ہے۔ بلکہ یورپی زبانیں ہیں۔ جن میں انگریزی بھی شامل ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنی زبان میں جدید سائنسی علوم لانا چاہتے ہیں تو ہم کو مغربی اصطلاحات لینا ہی پڑیں گی۔ اور مغربی زبانیں ہی سائنسی اصطلاحات کا منبع و مخرج بن سکتی ہیں۔

رسم الخط کی طرف آیئے تو یہاں بھی ہمیں بنیادی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ رسم الخط کے مسئلے کو کسی طرح بھی اصطلاحات کے مسئلے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ سائنسی اصطلاحات کو اُردو میں لینے کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔ کہ ہم رومن خط اختیار کر لیں۔

فارسی خط نے اُردو ادب کی اشاعت میں بڑی رکاوٹیں ڈالی ہیں۔ اور لکھائی چھپائی میں جو اس خط کی وجہ سے دقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ ہماری طباعت و اشاعت میں اس خط کی وجہ سے سُست رفتاری پیدا ہو گئی ہے اس لئے ہماری تہذیبی سرگرمیوں کو بھی سُست رفتار بنا دیا ہے۔ ہزار تصحیح اور پروف ریڈنگ کیجئے مگر غلطیاں رہ ہی جاتی ہیں۔ مجھے تو یہ منظر عہد متوسط کی یاد دلاتا ہے کہ کاتب صاحب اپنے گھٹنوں پر پیلا کاغذ رکھے قلم گھس رہے ہیں۔

ہمیں فارسی عربی میں علوم اور جدید خیالات کا دھارا تو نہیں مل سکتا وہ تو ہمیں یورپی زبانوں میں ہی مل سکتا ہے۔ اس لئے اُردو کا اور اُردو کے ذریعے پُورے پاکستانی کلچر کا عہد جدید سے تعلق پیدا کرنے کیلئے اُردو کو سائنسی علوم کا حامل بنانے کیلئے اُردو کے ذریعے پاکستانی کلچر میں عقلیت (RATIONALISM) اور دنیاویت (SECULARISM) پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم رومن رسم الخط اختیار کر لیں پاکستان میں تہذیبی نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) پیدا کرنے کے لئے مغربی علوم اور مغرب کے مادی عقلی و سائنسی نقطۂ نظر سے گہرا ربط پیدا کرنیکی ضرورت ہے۔ اور رومن رسم الخط یہ کام آسان ہو جائیگا میری رائے میں اب تک پاکستان میں نشاۃ الثانیہ نہیں رُونما ہؤا ہے۔ تجدید پرست (REVIVALISM) کا پہنہ ضروری ہوتی ہے لیکن دونو کا فرق سمجھنا ضروری ہے۔ رومن خط کا اختیار کرنا بین الاقوامی تہذیبی اور سیاسی تعلقات کو آگے بڑھانے کے لئے ابھی ضروری ہے۔

اس وقت زیادہ تر مسلم ممالک نے اپنے سیاسی اور سرکاری امور میں محض عملی وتسہل کی وجہ سے ہی فارسی یا عربی خط ترک کر کے رومن یا روسی خط اختیار کر لیا ہے۔ مثلاً انڈونیشیا، افغانستان، ترکی، تاجکستان، ازبکستان وغیرہ لیکن اس کی وجہ سے نہ توان کے زبان و ادب پر کوئی مضر اثر پڑا اور نہ ان کے حلق کی ساخت بگڑ گئی۔ بلکہ زبان کی مزید ترقی ہوئی۔ اور اسمیں جدت آگئی۔ اور عالمگیر تہذیب و تمدّن کے دھارے پر چل نکلی پھر اُردو کے لئے رومن رسم الخط اختیار کر لینا کوئی نئی بات نہ ہو گی۔ ہندوستانی اور پاکستانی فوج کی زبان پہلے ہی سے "رومن اُردو" ہے جو بے حد آسان اور سہولت آمیز ہے۔ میں نے خود تجربہ کے طور پر کئی تین ماہ تک انگریز فوجیوں کو "رومن اُردو" پڑھائی ہے۔ زبان خالصاً اُردو ہوتی تھی اور خط رومن۔ لیکن نہ تو پڑھنے میں دقت تھی۔ اور نہ تلفظ میں۔ بلکہ رومن خط اختیار کر کے اُردو کو پہلے سے زیادہ PHONETIC بنایا جا سکتا ہے۔ رومن خط اختیار کر لینے کے بعد پُورے اُردو ادب کو رومن خط میں چھپوا دینا کچھ مشکل نہیں۔ پھر دیکھئے ہمارا سارا ادبی سرمایہ رومن خط میں موجود ہے۔

سجاد ظہیر

لوئی آراگوں

پہلی جنگ عظیم کے دوران فروری ۱۹۱۶ء میں ایک رومانوی ترستان زارا ایک جرمن ہیوگو بال اور السا س کے رہنے والے ہانس آرپ اور چند اور نوجوانوں نے سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورک میں آرٹ کی ایک نئی تحریک شروع کی۔ انہوں نے اس سلسلے میں اپنی خاص قسم کی تصویروں کی نمائش کی۔ میوزک کمپوز کیا۔ نظمیں لکھیں اور ایک رسالے کے ذریعہ آرٹ کے متعلق اپنے نظریوں کا اظہار کرنے لگے۔ اس تحریک کا نام اس طرح رکھا گیا کہ زارا نے ایک ڈکشنری کو ہاتھ میں لے کر بغیر کسی خاص ارادے کے ایک جگہ سے کھول دیا۔ اس طرح اتفاق سے جو صفحہ کھلا، اس پر پہلا لفظ دادا تھا، بس اس تحریک کا نام اس دن سے دادا رکھ دیا گیا۔ اس تحریک کی خصوصیات اس کی تقریباً ہر چیز اور ہر عقیدے سے بغاوت تھی چنانچہ انہوں نے ایک بار اپنے رسالے میں جس کا نام بھی دادا تھا یہ لکھا۔

"ہم طوفانی جھکڑ ہیں جو بادلوں اور دعاؤں کی چادر کو پھاڑ ڈالتے ہیں اور بربادی، آتش زنی اور گلنے سڑنے کے عظیم الشان تماشے کی تیاری کرتے ہیں۔"

تحریک دادا کے ماننے والے، منطق، سماجی تفریق اور تمیز، یادداشت، مستقبل سب کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ "دادا سے مراد بے ساختگی سے پیدا ہونے والے ہر ایک خدا پر یقین ہے۔"

سوئٹزرلینڈ کے اس بین الاقوامی گروہ کی طرح کا ایک گروہ پیرس میں بھی تھا، جس میں اکثریت شاعروں کی تھی۔ یہ لوگ دو رسالے نکالتے تھے۔ ان میں سوئٹزرلینڈ والے گروہ کی لکھی ہوئی چیزیں چھپتی تھیں۔ دونوں گروہوں میں ہم آہنگی تھی اور چونکہ دونوں ہی فرانسیسی میں لکھتے تھے اس لئے وہ رفتہ رفتہ مل گئے۔ پیرس کے گروہ میں آندرے برتون اور لوئی اراگون بھی تھے۔ جہاں تک مصوری کا تعلق ہے۔ یہ لوگ کیوبسٹ یا اقلیدس کی شکلوں اور رنگوں کی آمیزش سے بنائی ہوئی منزہ یا مجرد تصویریں بناتے تھے، ان کا کہنا تھا آرٹ کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے۔ جہاں سے نقل ختم ہوتی ہے، دوسرے انہوں نے یہ بھی کہا کہ

"ہمیشہ دوسری چیز ڈھونڈو، ہمیشہ دوسری چیز، اس لئے کہ ڈھونڈھنا، یہی زندگی ہے اور پانا یہ موت ہے۔"

اس گروہ کے لوگ اپنے عام جلسوں اور تماشوں میں اکثر ایسی حرکتیں کرتے تھے کہ پبلک کے مروجہ اعتقادات اور اخلاق اور خیالات کو سخت دھکا لگے، چنانچہ ان کے بہت سے جلسوں میں ہنگامہ ہو جاتا تھا اور یہ لوگ اس کو اپنی کامیابی سمجھتے تھے۔ اونچے طبقے کے لوگ جو اپنے کو شرافت، اور مذاق سلیم کا اجارے دار سمجھتے تھے، انہیں ہر طرح سے بیوقوف بنانا اور زک پہنچانا یہ بھی ان لوگوں کا مقصد تھا۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں اس گروہ کی جانب سے اس کے ایک ممتاز فرد آندرے برتون نے ایک اعلان نامہ یعنی فسٹو شائع کیا۔ اس کا عنوان شعور یا لزم (ماورائیت) کا اعلان تھا۔ اس زمانے سے یہ تحریک سوریالسٹ تحریک کہلانے لگی۔ ان لوگوں نے ایک نیا ادبی رسالہ بیتے جاتے LITTE RATURE کے نام سے بھی جاری کیا۔ لوئی اراگون۔ پال ایلوآر۔ فلپ سوپول۔ آندرے برتون پال ایلوری اس کے خاص اراکین تھے۔ آرٹ کی سوریالسٹ تحریک صرف فرانس تک ہی محدود ہی نہیں رہی۔ بلکہ انگلستان، جرمنی اور خاص طور پر امریکہ میں بھی اسے فروغ ہوا۔ وہ جدت پسندی کی پہچان بن کر کچھ عرصہ کے لئے فیشن میں بھی داخل ہو گئی۔ فرانس کے تحت الشعور کے نظریوں نے بھی اس پر

اثر ڈالا۔ سور ریالسٹ شاعروں نے اشاریت پسندوں اور خاص طور پر ریمبو سے کافی حد تک اثر قبول کیا، ہر ظاہر اور مبین چیز سے انکار، ہر اخلاقی قدر سے نفرت، آرٹ کی ہر روایت سے گریز، نظم کی ہر بندش سے آزادی، ان کا اصول بنی۔ انہوں نے انتشار، ابہام، غیر معمولی اور اچھوتی مثالوں اور تشبیہوں اور حیران کن، عجیب نقوش، ان دیکھے مثالی پیکروں، غیر مرتب اور غیر مسلسل خیالی چنگاریوں، پریشان سروں، اور دلخراش رنگینیوں کی ایک نئی دنیا بنانے کی کوشش کی۔

لوئی آرآگوں بھی اسی گروہ کا ایک شاعر تھا۔ ۱۹۱۹ء سے لے کر جب اس نے شاعری شروع کی ۱۹۳۰ء تک کی آرآگوں کی نظمیں اسی قسم کی ہیں۔ اس تحریک سے ہمدردی رکھنے والے ایک نقاد رینے برتھے نے سور ریالسٹ شاعری کی حقیقت یوں بیان کی ہے۔

"شاعری کی ایک نئی تعریف ہوتی ہے۔ شاعری ایک گریزاں اندرونی کیفیات کا بے ساختہ اظہار بن جاتی ہے، ہر قسم کی ہیئت سے باغی، ایک چمک، ایک جگمگاہٹ، ایک ندا، ایک کیف، حواس کی بے محابا مبہوں کے انتشار سے ٹوٹا ہوا ایک ٹکڑا۔ باطنی زندگی کے سمندر کی سب سے تاریک گہرائیوں کی ناپ کرنے سے اسکی تہوں میں عجیب غریب درختوں اور جانداروں ہستیوں کی دولت ملتی ہے۔ وہاں ایک نیا حسن بھی ملتا ہے، عجیب پریشان کن، لرزہ خیز۔"

تقریباً دس سال تک آرآگوں باطنیت کے اس جنگل میں سرگرداں رہا۔ اسکی اس زمانے کی شاعری میں مطلب و معنی مشکل سے ملتا ہے لیکن واہمہ اور خواب کی اس دنیا اور مجرد خیال آرائی کی اس مشق سے ایک خاص قسم کی شاعرانہ دولت اس کے ہاتھ آئی، یعنی ندرت جدت، قدرتِ کلام، تشبیہوں اور استعاروں کی بوقلمونی، تخیل میں ایک خاص قسم کی گہرائی اور دل آویز رنگ آمیزی۔

سنہ ۱۹۳۰ء سے آراگون کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس سال سے اس نے سور ریالسٹ تحریک سے اپنا ناطہ توڑ لیا۔ اور اس کے تھوڑی مدت بعد فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر ہو گیا۔ اس وقت آراگون کی عمر تینتیس سال کی تھی۔ اس انقلابی تبدیلی کے اسباب آراگون نے خود ایک مضمون میں جو اس نے سنہ ۱۹۳۵ء میں لکھا تھا ان الفاظ میں بیان کئے ہیں۔

"وہ لاچار ہو کر ایک آخری کوشش تھی سمجھنے کی دو چیزوں کے ما بین زندگی کی طرف برسوں سے جو میرا رویہ تھا اور اس حقیقت کے ساتھ جس سے میں ٹکرا گیا تھا۔ اس کوشش کے علاوہ یقینی رفاہ عام کے کاموں میں میرے شامل ہونے نے بھی مجھے ماضی کے جال میں دوبارہ پھنس جانے سے بچا لیا۔ یہ ماضی بالکل ابر آلود تھا جہاں میرے پہلے کے دوست چلا چلا کر مجھے بلاتے۔ یہاں تک کہ میری ذلت کر کے مجھے وہاں رکھنا چاہتے تھے۔ میں چھوٹے سے چھوٹے کام کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ چاہے وہ کیلیں گاڑنے، یا کسی ہال کے دروازے پر کھڑے ہو کر ٹکٹ بیچنے کا ہی کام کیوں نہ ہو۔ اس طرح کے کاموں نے لا انتہا بحثوں کے مقابلے میں جو مجھے سور ریالسٹوں کے ساتھ کرنی ہوتی تھی۔ معاملات کے صاف کرنے میں میری زیادہ مدد کی۔

"واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی دانشور INTELLECTUAL دوران زندگی میں متضاد باتیں کرنے پر مجبور ہو جائے تو اس کا ایک گہرا، انسانی اور سچا سبب ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کا دماغ اپنے ارتقا کے دوران میں بعض ایسے حقائق سے رو پوشی نہیں کر سکتا جنکی منطق اسکے اپنے علیحدہ تصورات سے مختلف ہے۔ کسی تصور کا اگر وہ تصور کہلائے جانے کے لائق ہے، ایک شخص پر اثر قائم نہیں رہ سکتا اگر ابتدائی اور بنیادی حقائق اسکی نفی کرتے ہوں۔ مثلاً یہ حقیقت کہ مزدوروں کا مقابلہ پولیس اور گولیوں سے کیا جاتا ہے یا یہ کہ جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں یا یہ کہ بعض ملکوں میں فاشسٹ اقتدار قائم ہے۔ انسانیت کی شان کا تقاضہ ہے کہ اپنے تصورات کو ان واقعات کی روشنی میں دیکھے۔ بجائے اس کے کہ کسی ذہنی عیاری سے اسکی کوشش کی جائے کہ واقعات کو اپنے تصورات کا تابع بنایا جائے، چاہے یہ تصورات کتنے ہی انوکھے کیوں نہ ہوں۔"

آراگون کے اس بیان سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ دس برس کی مسلسل رُوحانی اور ذہنی جد و جہد کے بعد اس کے گرد و پیش ہونے والے واقعات نے اُسے اپنی پہلی نظری اور عملی پوزیشن بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سوررئیلسٹ تحریک کے ساتھ اسکی وابستگی سرمایہ دارانہ سماج، اسکی جھوٹی اخلاقی قدروں، اس کے منصب، اور کھوکھلے آرٹ، اسکی خود غرضی اور خود پرست زندگی، اسکی آدم کشی اور خون آشامی سے ردِعمل کے طور پر ایک ذہنی بغاوت تھی۔ جنگ اور جنگ کے بعد ہونیوالے واقعات نے درمیانی طبقہ کے حساس نوجوانوں کو اس قسم کی بغاوت کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ بغاوت کر کے وہ کونسا راستہ اختیار کریں؟ باطنیت، رہبانیت، عیاشی، خودکشی بھی مروجہ زندگی سے بغاوت کی قسمیں ہیں۔ سوررئیلسٹ تحریک سے جو نوجوان وابستہ تھے۔ انکی بغاوت بجائے اس کے کہ انہیں احساسات اور عمل سے بھرپور نئی، بہتر، اور سچی زندگی کی طرف لے جاتی، اس نے انہیں تحت الشعور کے گرداب میں بُری طرح پھنسا دیا۔ الفاظ کو جملوں کے خفیہ، مبہم اور اشاراتی مطالب کی شکل دے کر وہ شعور کی اس نچلی اندھیری دنیا میں بھٹکتے اور اسی کو زندگی کا منشا سمجھتے ظاہر ہے کہ ان میں سے جو زیادہ ایماندار اور حساس تھے۔ ان میں جو ایسے تھے جو دراصل ایک نئی سچائی اور اصلی حقیقت کی جستجو میں مروجہ راہوں کو چھوڑ کر ذہن کی اس دھندلی بھول بھلیاں میں داخل ہوئے تھے وہ خود اپنے تجربے کی بناپر وہاں سے باہر نکل آئے۔

یہ بات شاید تعجب کی نہ سمجھی جائے کہ آئندہ دس سال تک یعنی سنہ ۱۹۳۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۰ء تک آراگون کی شاعری کی مقدار بہت کم رہی۔ سوررئیلزم کو ترک کرنے کے بعد اسکی نظموں کے دو مختصر مجموعے شائع ہوئے، جن میں سے ایک میں وہ نظمیں ہیں جو آراگون نے سوویت رُوس کی اشتراکی تعمیر سے متاثر ہو کر لکھیں۔ ان نظموں میں سپاٹ پن کی حد تک سادگی ہے۔ لیکن ان میں ایک نیا جوش ہے اور انسانیت میں اعتماد کا اظہار ہے۔ بہر حال ان نظموں کا درجہ خود آراگون کی شاعری میں کچھ زیادہ بلند نہیں ہے۔ ان سے آراگون کی شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز معلوم ہوتا ہے ان میں آغاز کی تازگی ہے۔ لیکن تکمیل کی شان اور گہرائی نہیں ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے ابھی اسکو بہت سی دشوار گذار منزلیں طے کرنی تھیں۔

کمیونسٹ پارٹی کا ممبر ہونے کے بعد آراگون کی زندگی سخت محنت اور جد و جہد کی زندگی ہو گئی۔ ہٹلر اور جرمن فاشزم کے عروج کے بعد سے سارے یورپ کے لئے نہایت خطرناک دور شروع ہو گیا تھا۔ جنگ کا خطرہ دن بدن بڑھتا جاتا تھا۔ فرانس میں بھی فاشسٹ جمہوری طرز حکومت کو ختم کر دینے پر تُلے ہوئے تھے اب ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے کمیونسٹ پارٹیوں کی رہنمائی میں عوامی متحدہ محاذ قائم کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ فرانس کے چند دُوسرے بڑے مصنفین، اہل علم اور سائینس دانوں ہنری باربس، رومین رولاں، آندرے مالرو، لانجوین، وائیان کوتوریئے (کمیونسٹ روزنامہ ہیومانیتے کے متوفی مدیر) کے ساتھ مل کر آراگون نے فرانس میں کلچر کے تحفظ کے لئے دانشوروں کی ایک انجمن بنانے میں حصّہ لیا۔ اس انجمن میں فرانس کے تمام جمہوریت پسند ادیب اہل علم شریک ہوئے۔ آراگون کی ہی کوششوں سے پیرس میں اشتراکی اور جمہوری ادیبوں کا ایک ادارہ Maison de la Culture (تہذیب خانہ) بھی قائم کیا گیا۔ جہاں پیرس کے ترقی پسند مصنفین جمع ہوتے اور ادب و سیاست پر بحث کرتے۔ اسکی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ انقلابی اور ترقی یافتہ مزدور طبقے کے لوگ بھی بکثرت یہاں پر جمع ہوتے تھے اور اس طرح درمیانی طبقہ کے ترقی پسند ادیبوں اور مزدوروں میں باہمی رفاقت بڑھتی تھی۔ آراگون نے بعض دُوسرے اشتراکی ادیبوں کے ساتھ مل کر ایک ماہانہ ادبی رسالہ "کمیون" بھی جاری کیا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں اپنے ایک روزنامہ اخبار Ce Soir یعنی آج شام کی بھی بنیاد ڈالی۔ تھوڑے دنوں میں اسکی اشاعت کئی لاکھ روزانہ کی ہو گئی۔ یہ اخبار شام کو نکلتا اور ایک طرح سے (پاپولر فرنٹ) عوامی متحدہ محاذ کی تمام پارٹیوں کا متحدہ اخبار تھا۔

اسی زمانہ میں مختلف سیاسی مہموں میں بھی آراگون نے حصّہ لیا۔ مثلاً جب ہٹلر جرمنی میں برسرِاقتدار آیا تو جرمنی میں ترقی پسند

ادیبوں، مصنفوں، آرٹسٹوں، اہل علم و سائنس، اشتراکی اور دوسری جمہوری پارٹیوں پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ان میں سے بہت سے قتل کئے گئے۔ بہت سے کونسن ٹریشن کیمپوں میں زندہ درگور ہوگئے۔ بہتوں کو طرح طرح کی خوفناک جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں اور ہزاروں لاکھوں کو جرمنی چھوڑنا پڑا اور جرمن مہاجرین کی امداد کی تحریک میں آراگون نے پورا حصہ لیا۔ اسی طرح جب چین پر جاپانی فاسسٹوں کا حملہ ہوا اور ابی سینا پر مسولینی حملہ آور ہوا۔ تو آراگون نے رائے عامہ کو بیدار کرنے اور چینی اور حبشی عوام کی مدد کرنے کی تحریک میں حصہ لیا۔ آسٹریا اور چیکوسلواکیہ پر جرمن فاشسٹ اقتدار کے خلاف اس نے آواز بلند کی۔ آخر میں ہسپانوی خانہ جنگی میں جمہوریت پسندوں کی ہر طرح سے امداد کرنے کے سلسلہ میں فرانس میں بھی جد و جہد ہوئی آراگون اس کی تنظیم میں پیش پیش رہا۔

روزمرہ کی سیاسی مہموں میں اس قدر انہماک، مضامین لکھنا، چندہ جمع کرنا۔ جلسوں میں تقریریں کرنا۔ کمیٹیوں کی شرکت اور ان کا کام کرنا۔ مصنفین کی انجمن کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنا۔ ایک ادبی رسالے کی اڈیٹری اور ایک روزانہ اخبار کا اجرا اور اسکی اڈیٹری، کام کے اس ہجوم میں آراگون کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بسر ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں اور مصروفیت کے اس عالم میں میری ملاقات آراگون سے ہوئی۔ یہ اکتوبر ۱۹۳۵ء کی بات ہے اور مجھے کتنی حیرانی ہوئی۔ جب میں نے آراگون کو ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی مجوزہ تحریک میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے پایا! مجھے ابھی تک یاد ہے کہ اس نے دو باتوں کی طرف خاص طور سے مجھے دھیان دینے کو کہا تھا پہلے تو یہ کہ ہمیں ہمیشہ اپنی تحریک میں مختلف مکتب خیال کے ترقی پسند مصنفوں کو شامل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مثلاً اشتراکی خیال کے مصنفین کو دوسرے محب وطن اور پرانے مصنفین کا تعاون حاصل کرنا چاہیئے۔ دوسرے ادیبوں اور مصنفوں کا منظم کرنا بہت مشکل کام ہے اس لیئے کہ مصنف اپنے کو ہر قسم کی تنظیم سے اورا تصور کرتے ہیں۔ آراگون نے مجھ سے کہا کہ اس کام میں بہت صبر، استقلال، وسیع المشربی سے اگر کام نہ لیا جائے گا تو کامیابی مشکل ہے۔ ہمارے دس سال کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ آراگون کی یہ نصیحت ٹھیک تھی۔

اگر ان مہموں میں شرکت اور دن رات کی سیاسی مشغولیت کے سبب سے آراگون شاعری کی طرف توجہ نہ کر سکا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس نے بڑے پیمانے پر ادبی کام کرنا ہی چھوڑ دیا۔ ٹھیک ان مشغولیتوں کے درمیان وہ ناول نگاری بھی کرتا تھا، اس نے اپنے زمانے کی فرانسیسی سوسائٹی کی پوری تصویر ناولوں کے ایک سلسلے کے ذریعے سے پیش کرنے کی اسکیم بنائی۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۹ء تک کے عرصہ میں اس نے تین طویل[1] ناول لکھے۔ ان ناولوں میں آراگون نے فرانس کے حکمران سرمایہ دار طبقوں کا اخلاقی اور سیاسی انحطاط، درمیانی طبقوں کی ذہنی اور روحانی کش مکش اور مزدور طبقے کی تنظیم اور اسکی جد و جہد کی بے مثال تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ ان تینوں ناولوں میں آراگون کا بنیادی موضوع محبت ہے افراد کی محبت اور اس سے بھی بڑھ کر انسانیت کو متحد اور متحرک رکھنے والی زنجیر محبت، باہمی اشتراک، باہمی جد و جہد، اجتماعی عمل، انقلاب کے لیئے، تخلیق کے لیئے، نئی دنیا کی تعمیر کے لئے۔ اگرچہ فنی اعتبار سے آراگون کے یہ ناول فرانس کے سب سے بڑے ناول نگاروں، بالزاک، فلوبیئر، وکٹر ہیوگو اور زولا کے بہترین ناولوں کے برابر اچھے نہیں ہیں، لیکن بالزاک اور زولا کی طرح آراگون نے بھی اپنے زمانے کی فرانسیسی سوسائٹی کے اوپری طبقوں کا ابتزال، سرمایہ داری نظام کا انحطاط بہت اچھی طرح واضح کیا ہے۔ جو تصویر آراگون نے یہاں پر پیش کی ہے اس میں

---

(۱) Les Voyeru gonrsdl. Imperiale شاہی گاڑی کے مسافر۔

(۲) Les Clochesde Bale بال کے گھنٹے۔

(۳) Les Benx Inartiers خوبصورت محلے۔

خلوص ہے اور ایک خاص قسم کی دردناکی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اس نئے طبقے یعنی مزدوروں کے عروج کی تصویر بھی کھینچی ہے، ہڑتالوں میں مزدوروں کی رفاقت اور بہادری حکومت اور سرمایہ داروں کے ہتھکنڈے اور مظالم بےشمار طریقے سے بیان کئے گئے ہیں۔

جنگ شروع ہوئی اور جبری بھرتی کے قانون کے مطابق آراگون بھی فرانسیسی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ فرانس کی شکست ایک ہولناک مہیب اور دلشکن حقیقت بن کر نازی اقتدار کی صورت میں سارے ملک پر چھا گئی، یورپ کا سب سے مہذب ملک، انقلاب اور جمہوریت قدیم کا گہوارہ فنونِ لطیفہ کا بین الاقوامی مرکز وحشی تہذیب یا دشمن نازیوں کے پیروں تلے روند ڈالا گیا۔ فرانسیسی اجارہ دار سرمایہ دار بڑے بڑے ٹرسٹوں کے مالکوں اور ان کے نمکخوار جنرلوں نے درمیانی طبقے کی پارٹیوں کی کمزور اور ڈانواڈول سیاست سے فائدہ اٹھا کر فرانسیسی طاقت کو اندر اندر سے کھوکھلا کر دیا اور ملک کو پہلے انگریز سرمایہ داروں کے پٹھوؤں اور بعد کو ہٹلری جاسوسوں کے ہاتھ گرو کر دیا۔ آزادی خواہ اور بہادر فرانسیسی عوام کے ساتھ انکی ایک ہزار سال کی تاریخ میں خود فرانس کے حکمران اور صاحب اقتدار امیر طبقوں نے اتنی بڑی غداری کبھی نہیں کی تھی۔

ایک طرف فرانسیسی حکمران طبقوں کے غدار گروہ مارشل پے تین کو اپنا رہنما بنا کر فرانس کی شکست کو اٹل اور دائمی تصور کر کے ہٹلری استبداد کے سامنے اپنی گردنیں خم کئے ہوئے تھے (مارشل پے تین۔ ویشی کی ماتحت حکومت کے افسر اعلےٰ کا قول تھا "میں ہر صبح اٹھ کر کہتا ہوں ہم کو شکست ہوئی ہے"، ایک طرف فرانس کے بڑے بڑے سرمایہ دار حکمرانوں کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ اور نازیوں کے لئے سامانِ جنگ فراہم کر رہے تھے، ایک طرف فرانس کے وہ مصنف جو جنگ کے پہلے ہی جمہوریت کے مخالف ہو گئے، (چارلس مورا، وریولا، دشل، مونتھرلاں)، نازیوں کی مدح سرائی اور فرانس کی شکست کی تاویلیں کر رہے تھے، دوسری طرف قومی ذلت اور غلامی کے اس زمانے میں جب چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا، فرانس کا مزدور طبقہ اور اس کا آگے بڑھا ہوا انقلابی دستہ، وہ جس کے رہنماؤں کو غدار فرانسیسیوں نے جیلوں میں گرفتار کر لیا تھا، جسکی کمیونسٹ پارٹی کو نازی فتح کے پہلے ہی غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ فرانسیسی قوم کو نازی دشمنوں سے لڑنے، ان کے منصوبوں میں رخنہ اندازی کرنے، انکی فتح کو شکست سے بدل دینے کا انقلابی پیغام دے رہا تھا۔ صرف پیغام ہی نہیں، بلکہ اپنے عمل، اپنی تنظیم، اپنی مسلسل جدوجہد اور اپنی قربانیوں سے سارے ملک کے محبانِ وطن کے لئے ایک زندہ مثال بن گیا۔ یہاں تک کہ فرانس کے سب سے بڑے رجعت پسند ادیب موریاک کو یہ بھی اعتراف کرنا پڑا کہ جب اوپر کے طبقے فرانس سے غداری کر رہے تھے اور جب دوسرے طبقوں پر جمود طاری تھا ایسے وقت میں فرانس کا مزدور طبقہ ہی ایک ایسا طبقہ تھا جس کے قدم حب الوطنی کے راستہ پر کبھی نہیں ڈگمگائے۔ معلوم ہوتا تھا کہ پستی کی تحت الثریٰ تک پہنچ جانے کے بعد جیسے فرانس کی زخمی روح تڑپ کر بیدار ہو گئی اور شکست خوردہ گروہوں۔ جماعتوں اور افراد کی تاریک پیشینگوئیوں اور تاریک تر سازشوں اور چالوں کے باوجود آزادی اور اس کے پرستاروں اور اس کے لئے مر مٹنے والوں کا پلّہ بھاری ہونے لگا۔ نازی جلادوں کی سختیاں بھی بڑھتی گئیں۔ لیکن ان کے چہروں پر ہراسانی، اور ان کے ہاتھوں میں لرزہ ہوتا تھا جب وہ کسی فرانسیسی محب وطن جانباز کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالتے تھے یا کسی کے سینے کو اپنی گولیوں کا نشانہ بناتے۔ مقتول کے چہرے پر اطمینان اور فتح کا نور چمکتا تھا۔ چنانچہ جب مشہور فرانسیسی کمیونسٹ رہنما گابری ال پے ری کو بالکل بلا قصور موت کی سزا دی گئی تو اس نے مرنے کے چند گھنٹے پہلے جیلخانہ میں یہ آخری کلمات لکھے:۔ دسمبر ۱۹۴۱ء

"میرے دوستوں کو معلوم ہو کہ میں اپنی زندگی کے نصب العین پر ثابت قدم رہا۔ میرے ہم وطنوں کو معلوم ہو کہ میں جان

دے رہا ہوں اس لئے کہ فرانس زندہ رہے۔

مَیں نے آخری مرتبہ اپنے ضمیر کا جائزہ لے لیا ہے، میں ایک مثبت نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ اگر مجھے ایک بار پھر زندگی ملے، تو میں اسی راستہ پر چلوں گا۔ آج کی رات بھی میرا عقیدہ یہی ہے کہ میرا عزیز دوست واَیان کوُتوُریئے ٹھیک تھا جب اُس نے کہا کہ کمیونزم دنیا کا شباب ہے" اور وہ ایسے فرداؤں کی تیاری کر رہا ہے جو نغمہ سنج ہونگے"۔ میں موت کا مقابلہ کرنے کیلئے کافی طاقت محسوس کرتا ہوں، خدا حافظ، فرانس زندہ باد"

آزادی کی یہی لافانی رُوح تھی جس نے آراگون اور فرانس کے اور بھی بہت سے شاعروں، مُصنّفوں، فلسفیوں، آرٹسٹوں اور پکھے پڑھے لوگوں کو دل و جان سے اپنے ملک کی تحریک مقابلہ (Resistance) میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا۔ اب آراگون کی زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ اُس نے اپنی قوم کو مایوسی اور شکست خوردگی کی مہلک اور مسموم فضا سے نکالنے کے لئے اپنی جان تک کی بازی لگا دی۔ اس زمانہ میں کمیونسٹ ہونا، یا کسی طرح سے بھی فرانس کے نازی حکمرانوں یا اُنکی بنائی ہوئی حکومت کی مخالفت موت کے مترادف تھی۔ لیکن آراگون مسلسل تین سال تک روپوش رہا۔ وہ نظمیں اور افسانے لکھتا جنہیں غیر قانونی کتابچوں اور اخباروں میں شائع کیا جاتا۔ وہ محبِّ وطن فرانسیسی مصنفوں اور ادیبوں، اور دوسرے دانشوروں کی کمیٹیاں اور انجمنیں قائم کرتا، اور ان لوگوں کو تحریکِ آزادی کے لئے کام کرنے کے لئے تیار کرتا، وہ دشمنوں پر آخری حملے کے لئے اسلحہ جمع کرتا۔ وہ فری فرانس کی روپوش فوج کے دستوں سے ملتا، اپنی نظمیں انہیں سُناتا اور انہیں دشمن سے آخری دم تک لڑنے کا پیغام دیتا۔ ایک انگریز ترقی پسند مصنف نے آراگون کی اس زمانے کی مصروفیتوں کو یوں بیان کیا ہے:۔

"خطرہ اور تھکاوٹ اسے شکست نہیں دے سکتے تھے وہ مختلف خیال اور مشرب کے لوگوں کو ایک محاذ پر جمع کرتا رہتا تھا عمل کے لئے، ایک نصب العین کے لئے وہ مجسّمہ بن گیا تھا۔ اس فرانس کا جو انسانی آزادی کے لئے خطرے اور صعوبت کے زمانے میں بار بار از سرِ نو پیدا ہوتا ہے۔۔۔۔"

نازی اُنکی خفیہ پولیس گسٹاپو اور ان کے فرانسیسی ایجنٹ شکاری کتوں کی طرح اس کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ وہ جگہ جگہ اس کا سراغ لگانیکی کوشش کرتے لیکن اسے پکڑ نہ پاتے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نازیوں کو معلوم ہوا کہ آراگون اس وقت فلاں گاؤں میں ہے انہوں نے سارے گاؤں کا مکمل محاصرہ کر لیا پھر وہاں کے باشندوں کو حکم دیا کہ جلد سے جلد سارا گاؤں خالی کر دیں۔ گاؤں کے ہر ایک شخص کو انہوں نے حراست میں لے لیا اس کے بعد سارے گاؤں کو آگ لگا دی۔ لیکن آراگون اس گاؤں سے پہلے ہی غائب ہو چکا تھا آراگون اور اس کے رفیقوں کی کوششوں کا آخر نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس میں مصنفین اور جرنلسٹوں کی ایک زبردست متحدہ انجمن قائم ہو گئی جسکے تقریباً بیس ہزار ممبر تھے۔ یہ انجمن غیر قانونی تھی اور اس کے افراد Movement کے لئے کام کرتے تھے۔

اس زمانے میں آراگون نے کئی سال کی خاموشی کے بعد دوبارہ شاعری شروع کی۔ سنہ ۱۹۴۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۴ء سال تک کے عرصے میں اسکی نظموں کے تین مجموعے شائع ہوئے لیز یو دیل زا (الزا کی آنکھیں) کریو کو (شکستِ دل) لا ڈیان فرانسیز (فرانس کی دیوی)

شکستِ دل میں سنہ ۱۹۴۰ء کی لکھی ہوئی نظمیں ہیں اس زمانے کی جب فرانس میں کسی طرف سے بھی امید کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی اور جب ہٹلر یہ اعلان کر رہا تھا کہ نازی نظام اب دنیا میں ایک ہزار سال کے لئے قائم ہو گیا۔ اس وقت فرانس میں مقابلہ کی تحریک بڑے پیمانے پر شروع نہیں ہوئی تھی۔ آراگون کی یہ نظمیں فرانسیسی فوجوں کی ہزیمت، فرانس کے ساتھ غداری، فرانسیسی عوام کی تکالیف

اور دردمندی کے متعلق ہیں۔ ان میں عمل کا جذبہ نہیں ہے۔ وہ ایک تھکے ہوئے دل کی فریاد ہیں۔ لیکن الزا کی آنکھوں کو سنہ ۱۹۴۲ء و سنہ ۱۹۴۳ء کی نظموں میں ہمیں پھر ایک تبدیلی سی نظر آتی ہے۔ اس مجموعہ کے دیباچہ میں آراگون نے لکھا ہے،

"میں انسان کے گانے گاتا ہوں..... کسی کو یہ حق نہیں کہ میرے گانوں کے وجود سے انکار کرے۔
کیونکہ وہ انسان ہے جس کے وجود کا سبب زندگی ہے"۔

ایک دوسری نظم میں جس کا عنوان "آنسوؤں سے زیادہ حسین" (Plus belle que les larmes) آراگون نے ان لوگوں کو جواب دیا جو شاعری کو زندگی سے علیحدہ کوئی چیز سمجھتے تھے اور جو آراگون سے اس وجہ سے خفا تھے کہ اب وہ اپنی شاعری کو اپنی قوم کی جہاد آزادی کا اسلحہ بنانا چاہتا تھا۔ آراگون نے اپنے ان مخالفوں کا ایک بند میں یوں ذکر کیا ہے!

"جب میں سانس لیتا ہوں تو بعض لوگوں کو جینا دوبھر ہو جاتا ہے،
میں ان کی نیند میں نہ معلوم کونسی محرومی پیدا کر دیتا ہوں،
معلوم ہوتا ہے کہ جب میں مصرعے موزوں کرتا ہوں تو جیسے ڈھول پٹنے لگتے ہیں۔
اور اتنا غل ہوتا ہے جس سے مردے بھی جاگ اٹھیں"

ایک دوسری نظم میں جو اس نے اپنی بیوی الزا تریولٹ Elsa Triolet کو مخاطب کر کے لکھی ہے اس نے اپنی شاعری میں دشواری اور مشکل پسندی کو ترک کرنے کا سبب بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ آراگون کی بیوی الزا تریولٹ خود بھی ادیب ہے اور کمیونسٹ پارٹی کی ممبر ہے۔ آراگون کہتا ہے:۔

تو نے مجھ سے کہا۔ تھوڑی دیر کے لئے مختلف نغموں کی پُر شور موسیقی بند کر دو۔
کیونکہ اس وقت زمانہ ایسا ہے کہ جو غریب لوگ ہیں
وہ لغت میں سر گردانی نہیں کر سکتے۔
وہ معمولی الفاظ چاہتے ہیں۔
جنہیں وہ سوتے وقت آہستہ آہستہ دہرا سکیں۔
تو مجھ سے کہتی ہے اگر تم چاہتے ہو کہ میں تم سے محبت کروں، اور میں تم سے محبت کرتی ہوں۔
تو میری تصویر جو تم کھینچو گے وہ ایسی ہو
جس طرح سورج مکھی کے پھول کے دل میں ایک زندہ کیڑا ہوتا ہے۔
موضوع میں موضوع چھپا ہوا
طلوع ہونے والے سورج کی روشنی سے محبت کو بیاہ دو"۔

سنہ ۱۹۴۲ء اور سنہ ۱۹۴۳ء کی نظمیں آراگون کی مقبول ترین نظمیں ہیں وہ چھپنے کے بہت پہلے ہی فرانس میں سب کو یاد ہو چکی تھیں ان میں جو نظمیں سب سے زیادہ مقبول ہوئیں وہ تین ہیں Le musée Grévin La Rose et le Reseda اور Ballade de celui qui chanta dans les supplices۔ بدقسمتی سے مجھے پہلی نظم دستیاب نہیں ہوسکی اس لئے اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔

دوسری نظم کا موضوع یہ ہے کہ دو نوجوان جو ایک ہی بستی سے محبت کرتے ہیں نازی جیل میں گرفتار ہیں، انہیں موت کی سزا مل چکی ہے ان کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے فرانس کی آزادی کے لئے نازیوں کے خلاف ہتھیار اٹھایا۔ ان میں سے ایک کیتھولک مذہب

کا ہے اور دوسرا کمیونسٹ ہے۔ آراگون نے یہ نظم فرانس کے قدیم طربائی انسانے BALLAD کے طرز میں لکھی ہے۔ یہ اتنی سہل فرانسیسی میں لکھی گئی ہے کہ معمولی فرانسیسی جاننے والا بھی اسے بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اسکی سادگی میں اتنا زور ہے، اتنا خلوص ہے اور اتنی گہرائی ہے کہ یہ ایک غیر جانبدار شخص کو بھی متحرک کر دیتی ہے اس نظم میں ہر بند کے خاتمہ پر یہ دو مصرعے بار بار دہرائے جاتے ہیں

ایک وہ جسے آخرت پر ایمان تھا

ایک وہ جسے ایمان نہ تھا۔

فرانس میں کیتھولک اور کمیونسٹ گروہوں میں سخت دشمنی تھی۔ کیتھولک چرچ کے بڑے پادری اپنے سرمایہ دارانہ مقاصد کو محفوظ رکھنے کے لئے مذہب کی بنا پر فرانس کے کیتھولک عوام کو کمیونسٹوں کے خلاف بھڑکاتے تھے۔ لیکن جنگ آزادی کی آگ میں جل کر یہ دوری بڑی حد تک دور ہو گئی۔ آراگون کی نظم اسی عوامی اتحاد کا جذباتی اظہار کرتی ہے اس کا آخری بند ہے۔

اور جب درد انگیز صبح نمودار ہوئی۔
جو انہیں زندگی سے موت کی طرف لے جاتی تھی۔
ایک اُسے جسے آخرت پر ایمان تھا۔
ایک اُسے جسے ایمان نہ تھا۔
دونوں کے لبوں پر اسی محبوبہ کا نام تھا۔
جس سے دغا اس نے اور نہ اس نے بے وفائی کی تھی۔
اب اُن کا سرخ خون بہہ رہا ہے۔
جس کا رنگ بھی ایک ہے اور جس میں چمک بھی ایک سی ہے۔
اُس کا جسے آخرت پر ایمان تھا۔
اور اس کا جسے آخرت پر ایمان نہ تھا۔
وہ بہتا ہے اور بہہ کر مل جاتا ہے۔
اس زمین سے جو انہیں اتنی پیاری تھی۔
تاکہ جب نئی فصل ہو۔
تو انگور کی بیلوں سے تازہ عنابی خوشے پھلیں۔

آراگون اور اس کے ساتھی شاعروں نے فرانسیسی شاعری میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ سو سال یعنی وکٹر ہیوگو کے بعد سے فرانسیسی شاعری کا شاندار دھارا اشاریت، ابہام، یاس پرستی، قنوطیت۔ شعر محض کے بے برگ و بار ریگستان میں گم ہو گیا تھا اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ شاعر، شعر کی حقیقت، اسکا سوز و ساز اور اسکا نغمہ، انسانوں کی زندگی سے دور اپنی خیالی دنیا میں ڈھونڈھتا تھا آراگون نے شعر اور زندگی کی اس دوری کو یکسر ختم کر دیا۔ ایسا کرنا اس کیلئے اس لئے ممکن ہوا چونکہ اس نے اپنے قوم کی آزادی کی لڑائی میں انقلابی مزدور طبقے کے ساتھ مل کر جدوجہد کی۔ اس جدوجہد کے تجربے نے اُسے نئی بصیرت، نیا شعور، نیا اعتماد اور نئی زبان عطا کی۔ آراگون نے ایک جگہ خود لکھا ہے "شاعر کا خطاب اپنی پارٹی سے"

"میری پارٹی نے میری یادیں تازہ کردیں اور میری بصیرت مجھے دوبارہ عطا کی۔

مجھے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ میں ایک بچے کی طرح تھا
یہ کہ میرا خون آشنا سرخ ہے اور میرا دل ایک فرانسیسی کا دل ہے
میں نہ جانتا تھا، مجھے صرف یہ احساس تھا کہ رات بڑی اندھیری ہے
میری پارٹی نے میری یادیں مجھے لوٹا دیں
میری پارٹی نے فرانس کے جھنڈے میرے ہاتھ میں دوبارہ دیئے۔
شکریہ، میری پارٹی
شکریہ ان سبقوں کا جو تو نے مجھے دیئے!
اور جب سے یہ ہوا ہے۔
میرا تمام ترغم و غصہ، تمام تر محبت و مسرت ترانے بن کر میرے سینے میں پھوٹ پڑے ہیں۔

آج یورپ میں وہ نقاد بھی جو آرٹ کو سیاست سے علیحدہ کوئی چیز تصور کرتے ہیں اور وہ بھی جو اشتراکی نظریئے کی بنیادی طور پر مخالف ہیں، آراگون کی شاعرانہ عظمت کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ آراگون جدید فرانس کا ہی انہیں خارج نئے یورپ کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اپنی مقبولیت کے بارے میں آراگون نے خود ایک تقریر کے دوران میں یہ کہا ہے۔

"مجھے یقین نہیں کہ وہ نظمیں جو جلدی میں کاغذ کے معمولی ٹکڑوں پر لکھائی گئی تھیں اور جن ٹکڑوں کو اکثر اس ڈر سے جلا دیا جاتا تھا کہ وہ دشمن کے ہاتھ نہ پڑ جائے۔ آج نہ صرف آزادی سے چھاپی جاتی ہیں۔ بلکہ لوگ انہیں پڑھتے بھی ہیں"

تفکّر کا رنگین تنوّع ـــ
ـــ اسلوب کی منفرد لطافت
انسانی فطرت کے اَن مِٹ ہیولوں کا رقصِ مسلسل
• وہ رقص •
اور حسن کے رنگا رنگ روپ
ہیولے
میں پیش کیے گئے ہیں
فکر تونسوی کی نظموں کا مجموعہ ـــ!
مکتبہ اردو لاہور

ممتاز شیریں

قرۃ العین حیدر

ایک منفرد افسانہ نگار

قرۃ العین حیدر ہمارے افسانہ نگاروں میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں تو وہ سب سے زیادہ منفرد ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں ان سے اچھے افسانہ نگار ہوں گے۔ چنانچہ قدرت اللہ شہاب، شمس آغا، انور، آغا بابر وغیرہ لیکن قرۃ العین کو ایک خاص انفرادیت حاصل ہے

جس طبقے کی اور جس قسم کی زندگی کی وہ مصوری کرتی ہیں۔ اس سے جدید اردو ادب اب تک خالی تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو افسانے میں اونچا طبقہ کبھی پیش نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن اس کا کوئی واضح نقش نہیں تھا۔ اور حجاب امتیاز علی کے افسانوں کی فضا تو کچھ حقیقت سے پرے ہی تھی۔ اب قرۃ العین نے پہلی دفعہ اس زندگی کی نہ صرف اتنی اچھی اور صاف تصویر کشی کی ہے بلکہ اُسے ایک نئے زاویے سے دکھایا ہے۔ اس کی بے رُخ مصروفیتوں، اکتاہٹ، سطحیت، کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا ہے۔ اس لحاظ سے میرے خیال میں قرۃ العین کے افسانے ترقی پسند بھی ہیں۔

اور بھی بہت سی باتوں میں وہ الگ ہیں۔ جہاں دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں — اور خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں بھی — محبت اور جنس پیش کرتے ہوئے اس کے جسمانی پہلو کو بہت دخل ہوتا ہے، قرۃ العین کے افسانوں میں صرف جذبات اور احساسات کی عکاسی ہوتی ہے۔ "جسم" کا کہیں بھی احساس نہیں ہوتا۔ نازک سے نازک موقعوں پر بھی وہ اس سے بچ نکلتی ہیں۔ محبوب جوڑوں کی ادبی میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں، رقص ہوتے ہیں، ڈرمیٹک انداز سے تنہائی میسر آجاتی ہے، ایسے موقعوں پر بھی عریانی تو ایک طرف "جسم" کے "لمس" کا ہلکا سا احساس بھی نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ایک ہلکا سا اشارہ دیکر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ "پرواز کے بعد" میں جمال انور آتشیں لڑکی شاہندہ کے ساتھ ناچ رہا ہے۔ ان دونوں کے حرکات اور کیفیتوں کے تفصیلی ذکر کے بجائے بس اسی ایک جملے کا اشارہ ہے۔

"اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ رمبا کی ہر مومنٹ کے ساتھ ساتھ آگ کے شعلوں میں گھوم رہا ہے۔"

اور ایک اس سے بھی زیادہ نازک موقع —

"جب طوفان گذر چکا" کے آخری جملے ہیں —

"روشنی بجھ گئی، اور فضاؤں کے راگ بند ہو گئے۔ اور پھر خواب گاہ کے خوبصورت نیلے ایرانی قالین پر سے اسے (ازابلا کو) بازوؤں کی مضبوط گرفت میں اٹھا لیا گیا اور دریچے سے باہر چاندنی رات کو ہوائیں چلنا بند ہو گئیں۔ اور فضا میں گرمی بڑھ گئی . . . . اور یوں ہوا کہ ایک کبوتر مریم کے پاس آیا اور یوں ہوا کہ وہ روح القدس سے بھر گئی۔" ان لطیف اشاروں کی داد نہیں دی جا سکتی!

ممکن ہے یہ خیال ہو کہ بوس و کنار کو بھی وہ ایسے لطیف اور بہمہ دردانہ انداز میں، اور معصومیت کے روپ میں پیش کرتی ہیں۔ "جب طوفان گذر گیا" کے اس نوجوان کو بھی معصومیت کا روپ دیا گیا ہے لیکن ازابلا کے زاویے سے یہ تصویر کتنی اچھی کھنچی ہے! ازابلا، وہ معصوم لڑکی "جو کچھ بھی نہیں جانتی" جو مریم کے چرنوں میں پہنچنے کی تمنا رکھتی ہے، بات بات پر کراس کر لیتی ہے اور آدھی رات کے وقت اس نوجوان کو اپنی خواب گاہ میں دیکھ کر کہتی ہے،

اسے سینٹ فرانسس دکھائی دے رہا ہے۔ اسے بالکل یہی محسوس ہوتا ہوگا کہ شمع ماند پڑ رہی ہے، روشنی بجھ گئی ہے۔ اور اسے مضبوط بازوؤں میں اُٹھایا جا رہا ہے۔ اور پھر اچانک وہ گرمی جیسے فضا میں گرمی بڑھ گئی ہو۔ "فضا میں گرمی" کتنا نادر اشارہ ہے۔ ان کے جسموں کے لمس سے پیدا ہونے والی گرمی کے لئے! . . . "اور یوں ہوا کہ وہ روح القدس سے بھر گئی" آخر تک بھی وہی تقدیس کی فضا قائم رکھی گئی ہے۔ یہ ایک بڑی فنی خوبی ہے۔

قرۃ العین کے افسانوں میں نثر کا سا ترنم اور روانی ہوتی ہے۔ شوخی تیرتی نظر آتی ہے۔ اور ساتھ ہی وہ ہر طرف طنز کی پھلجھڑیاں بکھیرتی چلی جاتی ہیں۔ تو قرۃ العین کی طنز میں بھی انفرادیت ہے۔ ترقی پسند افسانے میں طنز ایک بہت بڑی خوبی قرار دی گئی ہے۔ خواہ وہ سستی طنز ہی کیوں نہ ہو۔ طنزیہ افسانے بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ جدید افسانوں میں آپکو ہر طرح کی طنز ملے گی۔ کھوکھلی 'سستی' صرف طنز کرنے کی خاطر، طنز جیسے نوآموزوں اور سطحی قسم کے "ترقی پسندوں" کے افسانوں میں ملتی ہے۔ جوشیلی خلوص بھری لیکن جذباتی طنز جیسے مہندر ناتھ کے افسانوں میں ہوتی ہے۔ یا کرشن چندر کے بھی طنز جس میں جھنجلاہٹ ہوتی ہے جیسے ابراہیم جلیس کی، حسن عسکری کی استہزائیہ، عصمت چغتائی کی شوخ، منٹو کی تلخ، تیز، اختر رائے پوری کی فن میں چھپی ہوئی بھرپور طنز۔ قرۃ العین حیدر کی طنز ان میں سے کوئی بات نہیں۔ وہ طنز کرتی ہیں تو ایک ذہین تماشائی کی طرح۔ اکثر لوگ طنز کو قرۃ العین کے افسانوں کی خصوصیت تو ضرور بتاتے ہیں اور ان کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا خاص طور پہ ذکر کرتے ہیں لیکن اس کی نوعیت کو سمجھے بغیر ان کی نظر میں قرۃ العین کی طنز میں بھی تلخی اور تیز دھار ہوتے ہیں فرسودہ سماج پر، سرمایہ داروں پر، سامراجی حکومت پر۔ مثلاً یہ کہ "اودھ کی شام" میں ہمارے "سامراجی حکمرانوں" پر جا بجا وار ہیں وغیرہ —— دوسری طرف بعض اور لوگوں کا خیال ہے کہ وہ سب کچھ بورژوا نظر سے دیکھتی ہیں۔ اور اپنے افسانوں میں ایک خاص سیاسی پارٹی کا مذاق اڑاتی ہیں۔ یہاں بھی لوگ انہیں سمجھ نہیں سکے ہیں۔ ان کی طنز ایک طرح کے ہلکے استہزا اور ہجو کی حد کو ضرور چھوتی ہے لیکن ان کا مقصد کسی خاص سیاسی پارٹی یا طبقے وغیرہ کو اپنی ہجو کی زد میں لانا نہیں ہے۔ وہ تو اپنے افسانوں میں سب کا مضحکہ اڑاتی نظر آتی ہیں۔ اپنے طبقے کا، اونچی سوسائٹی کی بے روح مصروفیتوں، سطحی کھوکھلی زندگی کا، آبا و اجداد کا، ان آدمیوں کا جو اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ اپنی اہمیت جتاتے ہیں اور اس اہمیت کو جتانے ہوئے کتنے بے وقوف لگتے ہیں"۔ حضرتِ انسان کا جنہوں نے واقعی اپنی دانست میں دُنیا کے کتنے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ لیکن قدرت اور قسمت کے ہاتھ میں محض کھلونا ہیں بلکہ اپنے آپ کا بھی۔ وہ سب کا مذاق اڑاتی ہیں لیکن دل شکن ہجو یا نہ انداز میں نہیں۔ بڑے اچھے اور ہلکے موڈ میں ——

اور قرۃ العین کے لکھنے کا انداز، اسلوب، تکنیک سب کچھ منفرد ہے۔ احمد علی نے ہماری گلی لکھ کر ایک نئے انداز کی بنا ڈالی اور راب اظہاریت، رمزیت اور گہرے فلسفے کو جدید اردو ادب میں لے آنے والے وہی پیش رو ہیں۔ کرشن چندر پابندیوں کو توڑ کر ایک نئی راہ پر نکل کھڑے ہوئے، انہوں نے افسانے کی ہیئت بدل دی عسکری نے "حرامجادی" لکھ کر ایک اور نئی راہ کھول دی۔ "شعور کی رو" نے اردو افسانے کو ایک نیا میدان دیا۔ ان سب کی انفرادیت اور نئی راہوں نے ہمیں چونکا دیا تھا۔ اب قرۃ العین ایک نئی، بالکل آزاد تکنیک لے کر آئی ہیں۔ پلاٹ۔ ہیئت، زمان و مکان کی قید، تناسب و توازن سب سے آزاد۔ ایک نئے انداز کی بنا ڈالنا بجائے خود قابلِ قدر ہے کیتھرائن مینسفیلڈ کی مثال لیجئے اُنہوں نے گنتی کے چند افسانے لکھے ہیں۔ اور ان کے افسانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جسے عظیم کہا جا سکے۔ لیکن چونکہ اُنہوں نے اس وقت کے لئے ایک بالکل نئی راہ کھول دی تھی۔ ان کا نام آج بھی بڑے بڑے ادیبوں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اور کوئی بہترین انتخاب ایسا نہیں جس میں ان کا افسانہ شامل نہ ہو۔ قرۃ العین نے اگر ایک بھی اچھا افسانہ نہ لکھا ہوتا (یہ الگ بات ہے کہ اُنہوں نے اچھے اور بہت اچھے افسانے لکھے ہیں) تاہم ان کا یہ انداز اور یہ تکنیک ہی اردو افسانوی ادب کیلئے قابلِ قدر

اضافہ ہوتا۔ اس لحاظ سے اور بھی قابلِ قدر کہ گو وہ خود اس تکنیک کی وسیع دامنی سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکی ہیں۔ کیونکہ ان کا میدان محدود ہے۔ اور سب افسانوں کا مواد قریب قریب ایک ہی ہے۔ انہوں نے دوسروں کے لئے نئی راہ کھول دی ہے۔ جن کے تجربات اور مشاہدات وسیع ہوں۔ جو زندگی کے تنوع اور اہم پہلوؤں کو زیادہ گہرائی سے پیش کر سکیں، وہ اس تکنیک کی مدد سے بڑھیا بلکہ عظیم چیزیں تیار کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں بڑی وسعت ہے۔ اس میں بہت کچھ سمویا جا سکتا ہے۔ اور زندگی کا ایک وسیع منظر دکھایا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اپنے مضمون "تکنیک کا تنوع" میں تفصیل سے بتایا ہے، قرۃ العین کا یہ انداز ورجینیا وولف کے انداز سے بہت کچھ ملتا ہے، ان کا زندگی کو دیکھنے کا ایک DETATCHED انداز ہے۔ کچھ عجیب طرح سے وہ افسانے میں موجود ہو کر بھی اس سے پرے ہوتی ہیں۔ جیسے وہ زندگی سے الگ ہو کر اسے دیکھ رہی ہوں اور اس پر COMMENT کرتی جا رہی ہوں "ہم لوگ" میں ایک جگہ لکھا ہے "کھلے آسمان اور چمکیلے ستاروں کے نیچے اپنی بلندی سے دیکھئے۔ زندگی کا یہ مارچ پاسٹ" اپنے افسانوں میں وہ خود بھی دنیا کو اور اس دنیا کے رہنے والوں کو اسی افق سے دیکھتی ہیں۔ اور جیسے سیٹ اوپر سے ایک بے پروا، ترچھی نظر ڈال کر کہتی ہیں: "دنیا والو تم جو سر اٹھائے زندگی کے راستے پر چلے جا رہے ہو، تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ تم سب ننھے بچے ہو، قدرت اور قسمت کے ہاتھوں میں محض کھلونے۔ وہ تم سے کھیلے گی، پھر تمہیں پھینک دے گی۔ اور تم ہار کر، تھک کے چلے جاؤ گے۔ اس وسیع، پیچیدہ، ہر دم بدلتی دنیا میں بھلا کیا حقیقت ہے تمہاری اور تم اپنے آپ کو بہت اہم سمجھتے ہو!"

بہت اوپر جا کر طائرانہ نظر ڈالنے سے انہیں ایک خاص چھوٹا سا قطعہ زمین نہیں نظر آتا۔ نظر ٹھوس تفصیلوں اور گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتی لیکن اوپر سے زمین کا ایک وسیع حصہ نظر آتا ہے اور اس پر بکھری بکھری چیزیں۔ اسی طرح قرۃ العین کی نظر گہری نہیں جاتی، وہ ایک پھیلے ہوئے منظر کو سمیٹ لیتی ہے اور بکھری بکھری چیزوں کو کئی واقعات، ادھر ادھر کے کئی کردار، جذبات، احساسات، محسوس کیفیتیں، کئی مناظر، کئی یادیں، جو مختلف جگہوں اور مختلف وقتوں سے وابستہ ہیں۔ لیکن یہ سب وقت کے تسلسل اور حال کے دھرے کے ساتھ، اور ان سب پر چھائی ہوئی ایک فضا، رنگ و نور اور موسیقی میں ڈوبی ہوئی، خواب کی سی فضا، اور ایک ہلکا سا، مدھم سا احساس دنیا کی بے ثباتی کا، انسان کی بے بسی کا، زندگی کے حسن اور زندگی کے غم کا۔

قرۃ العین کے افسانوں میں بہت زیادہ یکسانیت ہے، تکنیک، مرکزی خیال، کردار، فضا سب ایک سے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے افسانے الگ الگ پڑھتے ہوئے ہم ہر افسانے سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ کسی مجموعے میں جمع کئے جائیں یا یکساں پڑھے جائیں تو ان کی یکسانیت ہمیں اکتا دیتی ہے۔

انہوں نے دوسری تکنیکیں بھی آزمائی ہیں چنانچہ "اودھ کی شام" ڈوروتھی پارکر کے "جسٹ اے لٹل دن" کی طرز کا مانولاگ ہے۔ "رقصِ شرر" میں صرف ڈائلاگ اور اسے تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ "آہ اے دوست" آزاد تلازمِ خیالات کی بھی مثال ہے۔ پھر بھی ان کا وہی انداز ہے اور ان افسانوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ یہ انداز ان میں کچھ ایسا رس بس گیا ہے کہ جب کبھی وہ اس سے الگ ہو کر لکھتی ہیں۔ تو ان کے افسانے کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ ان افسانوں کی بات نہیں ہے جو ان کے اس مخصوص انداز کو اختیار کرنے سے پہلے لکھے گئے تھے یعنی "خوابوں کے محل" "دیوار کے درخت" "میری گلی میں ایک پردیسی" وغیرہ۔ یہ تو حجاب امتیاز علی کی طرز کے رومان تھے۔ بلکہ ان کے تازہ افسانوں کی۔ "منگیتر" اور "ٹوٹتے تارے" عملی سے رومان ہو کر رہ گئے ہیں۔ "سنتا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیاگر تھا" میں، جو معمولی بیانیہ میں لکھا گیا ہے۔ انہوں نے ایک کردار پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ افسانے کا آخری حصہ گو بہت جذباتی انداز میں لکھا گیا ہے، دردناک اور اثر انگیز ہے۔ اور آصف کی آئینہ آپ سے بے انتہا محبت اور دل

کی جھوٹی تسلی کے لئے دوسری لڑکی سے رومان لڑاتے ہوئے آصف کے شکستہ دل کی فریاد جس کا قیمتہ سمجھ نہیں سکتی یہ حصہ بھی بہت اچھا ہے لیکن افسانے کا پہلا حصہ بہت طویل ہے۔ اس میں آصف کا کردار پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اتنی تفصیلوں کے باوجود آصف کا کردار بالکل نہیں اُبھرا ہے۔ اور "آصف اور موت ؟" کے تضاد کو جتنی شدت سے فن کار نے محسوس کیا ہے۔ اس احساس کو اس شدت سے وہ پڑھنے والوں میں منتقل نہیں کر سکی ہیں۔ لیکن ان کے دو بالکل تازہ افسانوں ۔۔۔ ساقی کے سالنامہ ۱۹۶۲ء میں "جب طوفان گذر چکا" اور "آج کل" کے سالنامہ ۱۹۶۲ء میں "دوسرا کنارہ" پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اب وہ کسی خاص موضوع اور کسی خاص کردار کی زندگی کو بھی پوری توجہ دے کر گہرائی سے پیش کر سکتی ہیں۔ "جب طوفان گذر چکا" میں کانونٹ کی مقدس فضا، کانونٹ کی زندگی کو اور پھر ازابیلا کو جو یہاں پڑھ رہی تھی اور بعد میں راہبہ بن جانا چاہتی تھی۔ انہوں نے پوری توجہ سے پیش کیا ہے۔ محبت اور محبت کی شکست تو ان کے تقریباً ہر افسانے کا مرکزی خیال رہے ہیں۔ لیکن اس شکست کی داستان "دوسرا کنارہ" میں کتنی گہری اور موثر ہے! چند بیر گرافوں میں اڑتے اڑتے ذکر کرنے کی بجائے اس افسانے میں تو ایک زندگی کی تباہی بتائی ہے۔ راج کماری جہاں آرا جس کی محبت کی اس کے محبوب جمیل کو ذرا بھی خبر نہیں ہوتی۔ ایک عیاش تعلقہ دار سے بیاہ دی جاتی ہے پھر اس سے طلاق، اپنے بچے کی جدائی، پھر ایک اور انتقام، ایلمر بریڈلے سے شادی لیکن جمیل اسی طرح بے خبر ہے۔ ایک ہی جہاز میں سفید پردے کی دوسری جانب وہ اس سے جسمانی طور پر اتنا قریب ہو کر بھی اس کی زندگی سے کتنا دور ہے! اس کی زندگی میں ایک زہر سرایت کر جاتا ہے۔ اس کی روح ایک جالکاہ درد میں جکڑی ہوتی ہے۔ اور اس کی زندگی میں ہر تبدیلی کے ساتھ، تبدیلی جس میں صرف اس کا جسم حصہ لیتا ہے، یہ درد زیادہ گہرا ہوتا جاتا ہے گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ روح کو اس گہرے درد، اس گہرے اندھیرے کو فضا میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ ایک بھیانک ڈراؤنے خواب کی سی "اظہاری" قسم کی تصویر کے ذریعہ "اندھیرا، بہت گہرا اندھیرا"۔ . . . اور دھواں اوپر اُٹھتا رہا۔ شعلوں کی سرخ اور زرد پرچھائیوں نے پانی کی سطح کو اور سرخ کر دیا۔ اور سرخ۔ اور چاند ڈوب گیا۔ پرانے درختوں کی شاخیں آگے جھک آئیں۔ آبشار ٹوٹ کر چٹانوں پر بکھر گئے۔ چاند ٹوٹ پھوٹ کر تھک کر نیچے گر پڑا۔ اور ہوائیں روتی رہیں۔" ان الفاظ سے کتنا شدید، کتنا گہرا اثر پیدا کیا گیا ہے۔ ان کے دوسرے افسانوں میں فضا "زائد" ہوتی ہے۔ ایک خوبصورت فضا جس کا افسانے پر براہِ راست کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن یہاں فضا اور احساس ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ گویا جہاں آرا کی روح کا کرب فضا میں بھی منتقل ہو گیا ہے۔

ان دو تازہ افسانوں میں قرۃ العین کا فن پختہ نظر آتا ہے۔ ان افسانوں میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ان کے دوسرے افسانوں کے برخلاف ان میں تسلسل اور وحدتِ اثر ہی نہیں ۔۔۔ COMMUNICATION بھی ہے۔ کمیونیکیشن آرٹ کا ایک لازمی جزو ہے۔ قرۃ العین کے افسانوں میں کمیونکیشن کی کمی ہے۔ ان معنوں میں نہیں جیسا اظہاری یا رمزی سرئیلسٹ یا گہرا فلسفہ لئے ہوئے افسانوں کو سمجھنا دشوار ہے یا ورجینیا وولف کی پُر اسرار گہرائی لئے ہوئے "شاعری" کو بلکہ ان معنوں میں کہ بہت کچھ پڑھنے کے بعد بھی یہی احساس رہتا ہے "یہ کیا لکھ رہی ہیں؟" ان کے افسانوں کی فضا سے ان کے لکھنے کے انداز سے ان کے طنز کی ذہانت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم پڑھتے چلے جاتے ہیں لیکن کوئی واضح نقش ہمارے ذہن میں قائم نہیں ہوتا۔ "رقصِ شرر" میں کوئی بات ہی نظر نہیں آتی۔ مونالزا کے صفحے کے صفحے پڑھ جائیے کچھ پتے نہیں پڑتا۔

قرۃ العین کے افسانوں کی دُنیا احساسات کی دُنیا ہے۔ خارجی حقیقت اور ٹھوس کرداروں کی دُنیا نہیں ہے سٹیفن سپینڈر الزبتھ بون کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ ان کے افسانوں میں ہمیں متنوع ٹھوس کردار نہیں ملتے . . . .

. . . . ورجینیا وولف کے افسانوں کے موضوع "شاعرانہ" ہیں۔ ہماری زندگی میں چند شاعرانہ لمحات آتے ہیں

جیسے جب ہمیں محبت ہوگئی ہو یا شدید مایوسی کا عالم ہو اور یہ احساس کہ ہم نے سب کچھ کھو دیا ہے۔ ایلزبتھ بوین ایسے ہی شاعرانہ لمحات کو اپنے افسانوں کی گرفت میں لے آتی ہیں۔ اس لئے ایک ٹھوس کردار کی تعمیر کرنے کی بجائے توجہ احساسات کی عکاسی پر زیادہ ہوتی ہے۔ یہی بات قرۃ العین حیدر کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ قرۃ العین کے موضوع بھی اسی طرح شاعرانہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں کوئی واضح کردار نہیں ہوتے، اگر کوئی واضح کردار انہوں نے پیش کئے ہیں تو یہی "جب طوفان گذر چکا" کی انامیکا اور "دوسرا کنارہ" کی جہاں آرا ہیں۔ ان کی مکمل رومانی ہیروئن صرف راج کماری جہاں آرا ہے۔ قرۃ العین کے کرداروں میں انفرادیت نہیں ہے۔ جمال انور ہو یا تلکے بھائی یا کیپٹن عثمان یا مسٹر پنٹ یا پھر ثریا یا فریدا یا رشیا سب ایک سے ہیں۔ یہاں تک کہ ہیرو اور ہیروئن کی بھی کوئی الگ امیج نہیں۔ یہ ایک زاویہ سے ٹھیک ہی ہے کیونکہ ایک خاص آدمی پر فوکس کریں تو اس کی تصویر اُبھرتی ہے منظر وسیع ہو تو وہ اور دوسرے کے منظر میں اور دوسرے کرداروں کے جھنڈ میں گھل مل جاتا ہے۔ اپنی اپنی جگہ پر فرد اہم ہے لیکن اس وسیع دنیا میں اس کی کیا اہمیت ہے؟ پھر اس پر گذرنے والے واقعات اس کے لئے کیا کچھ معنی نہ رکھتے ہوں لیکن زندگی کو اس سے کیا غرض؟ زندگی تو یونہی رواں دواں ہے۔ قرۃ العین کے افسانوں میں کرداروں کی حیثیت تنکوں کی سی ہے۔ جو زندگی کے ریلے میں بہے چلے جاتے ہیں۔

قرۃ العین کی تکنیک گویا مکڑی کے جال کی طرح ہے۔ بالکل چھوٹا سا مرکز اور اس سے نکل کر چھوٹتے ہوئے، بکھرتے ہوئے تار۔ یہ تار چمکیلے اور جھلملاتے ضرور ہیں لیکن ان کا رشتہ مرکز سے اتنا ہلکا اور نازک ہے کہ توازن بگڑ جانے پر کہیں زیادہ دباؤ پڑنے سے یہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ قرۃ العین کے کئی افسانوں میں یا تو غیر ضروری تفصیلوں میں داستان ڈوب جاتی ہے۔ یا اگر تفصیلیں اچھی بھی ہوں تو توازن بگڑ جاتا ہے۔ یہ تکنیک تناسب اور توازن سے آزاد ضرور ہے لیکن اگر ایک حد تک توازن قائم رکھا جائے تو بہت اچھا اثر لایا جا سکتا ہے جیسا کہ ان کے افسانے "پرواز کے بعد" میں پورا اثر پیدا ہوتا ہے۔ "پرواز کے بعد" ان کے اس مخصوص انداز کا سب سے متوازن اور مکمل افسانہ ہے۔ اس میں انہوں نے منظر کشی، کرداروں اور واقعات کے بیان میں توازن قائم رکھا ہے اس افسانے میں کئی اہم کردار ہیں اور ان سب کی داستان اور داستان کا ہر پہلو پوری طرح اُبھرا ہے۔ اس میں کئی کرداروں کا INTERPLAY ہے۔ یہ کردار آپس میں ٹکراتے ہیں۔ ایک ہی رومان میں اُلجھ جاتے ہیں اور سب کے سب زخمی ہو جاتے ہیں۔ سب کے لئے اس محبت کا انجام ٹریجڈی ہے اور ان سب کے المئے مل کر ٹریجڈی کو اور گہرا کر دیتے ہیں۔

اس آزاد تکنیک میں ایک اور آسانی یہ ہے کہ جہاں مخصوص موضوع اور پلاٹ ہونے پر اسی سے چپکے رہنا پڑتا ہے۔ یہاں بیک کر جدھر چاہے جا سکتے ہیں، اور جو چاہے کہہ سکتے ہیں۔ قرۃ العین اس "آزادی" کا بڑی اچھی طرح استعمال کرتی ہیں۔ وہ موضوع سے ہٹ کر زندگی اور آج کی دنیا کے بڑے بڑے مسئلوں پر مختصر طور پر ہلکے پھلکے انداز میں بڑی ذہانت سے COMMENT کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کی یہ ذہین تشریحیں "ہم لوگ" میں سب سے زیادہ کشش انگیز ہیں۔ "ہم لوگ" ان کے دو ایک بہترین افسانوں میں سے ہے۔ اور اس کی بہت اچھی مثال کہ کس طرح بکھرے بکھرے خیال، بکھرے بکھرے واقعات پیش کر کے بھی ایک ہلکا سا مجموعی تاثر لایا جا سکتا ہے۔

اس میں ان کے طنز اور ان مختصر ذہین تشریحوں کی چند مثالیں دیکھئے:-

"ایسے زندہ رہ کر زندگی کے سوال کا حل تلاش کرنا ہے اور زندہ رہنا کر وکنگ چیئر پر جھولنے والوں کے علاوہ دوسروں کے لئے تمام مصیبت کا کام ہے۔"

"ہم بہت مطمئن ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ منزل بے فیشن کی ان نیلگوں روشنیوں سے بہت دور کہیں دھندلکوں کے پرے

چھپی ہوئی ہے۔ منزل ـــــ قطعی سب ہی لغو اور بے معنی لفظ ہے۔ یہ زندگی ذوقِ سفر کے سوا کچھ بھی نہیں خصوصاً جب یہ سفر ایک پیکیرڈ میں کیا جاتا ہو؟"

"ریٹا سیٹیاں بجاتی ہے۔ اپنی ماں کی طرح، اس کی ماں کی ماں نے بھی یونہی ہلکی ہلکی سیٹیاں بجائی ہوں گی۔ نظامِ عالم کی تشکیل اسی طرح ہوئی ہے لیکن حماقت دیکھیے۔ فرسکو کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں نسلوں کے اختلاط سے منتج مسائل کے حل کے لئے لیگ آف نیشنز قائم کی جاتی ہیں۔ لڑائیاں لڑی جاتی ہیں۔ حالانکہ اس ساری دردسری کے باوجود ان پروبلمز کو نہایت آسانی اور اطمینان سے انڈیا گیٹ کے آس پاس تاج کے سوٹوں اور دسواکی کاٹجوں میں حل کر دیا جاتا ہے۔ غور فرمائیے کہ انہیں سیٹیوں اور جوابی مسکراہٹوں کے غیر مرئی تار کے سہارے یہ دنیا نقصان بے بگڑتے میں قدرت کی نوبل ٹوکری برقرار رکھنے کے لئے یہ ساری باتیں بے حد ضروری ہیں۔ اور اس نکتہ کو وہ زرد رو عیسائی لڑکی اور میری بہن ریٹا اور شاہدہ اکرام جو چند ماہ میں جونیئر اوفیسر سے ایک دم سینیئر کمانڈر ہو گئی سب اچھی طرح سمجھ چکی ہیں۔

"کیپٹن عثمان کا راجپوت خاندان جان لارنس کے زمانے سے دولتِ انگلشیہ کا جاں نثار اور وفادار رہا ہے ۔۔۔۔ ان کا بیٹا بھی اپنی خاندانی بہترین روایات کو محفوظ رکھتے ہوئے آئندہ پچیس سال بعد بین الاقوامی سیاست کی لیبورٹری میں تیار شدہ کسی نئی "ازم" کے خلاف لڑے گا اور نفرت کرے گا۔"

"ہم لوگ" میں رومانی اور خواب کی سی فضا نہیں ہے۔ یہاں جو فضا قائم کی گئی ہے۔ وہ خاص معنی رکھتی ہے۔ اور اس فضا کی تعمیر میں جو چیزیں استعمال کی گئی ہیں۔ وہ اپنے اصلی معنوں میں نہیں رمزیہ طور پر مستعمل ہوئی ہیں۔ مے فیئر کی نیلگوں روشنیاں، مال، پیکیرڈ، رقص وغیرہ۔ ریٹا کے رس بھری گی ٹھنڈی کونپلوں کے خواب، خواب ہیں یعنی جس طرح کی زندگی کی وہ تمنا رکھتی ہے اور اس تا تھکا ہوا آمادت اس کی اصل زندگی ہے یعنی جس طرح کی زندگی اسے بسر کرنی ہوگی۔ مے فیئر کی نیلگوں روشنیاں منزل کا پتہ دینے والی مشعلیں ہیں۔ پیکیرڈ کے ٹائروں کے نیچے تیزی سے بہتی ہوئی مال زندگی ہے۔ اور پیکیرڈ متمول طبقے کی علامت اور اس میں بیٹھے ہوئے لوگ اونچے طبقے کے لوگ۔ اختتام میں یہ اشاریت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے۔

"ہم سارے کے سارے رات کے کہرے میں چھپی ہوئی اس مال پر رواں ہیں۔ ایک دوسرے کی نظروں سے بچتے ہوئے، اور ہمارے پیچھے ان کہی پہیلیوں اور جانے بوجھے سوالیہ نشانوں کا ایک عظیم الشان کارواں دبے دبے قدموں سے گرتا پڑتا چلا آ رہا ہے۔ ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ مڑ کر اسے دیکھ سکیں۔ ہم اس سے چھپنے کے لئے مے فیئر کے نیلگوں دھندلکوں میں پناہ لیتے ہیں۔۔۔۔"

"ہم لوگ" قرۃ العین کا نمائندہ افسانہ ہے۔ اور اس میں ان کے منفرد انداز کی خاص خوبیاں اور خصوصیتیں اپنے بہترین روپ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ قرۃ العین میں ایک قوت تعمیر نظر آتی ہیں۔ جو ابھی "محفوظ" ہے۔ اور پوری طرح ظاہر نہیں ہوئی ہے۔ ان کا یہ آغاز شاندار آغاز سہی، پھر بھی آغاز ہے

اب ان کے تازہ افسانوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے آگے ۔ ۔ ۔ "جہاں اور بھی ہیں"

فکر تونسوی

سخن گسترانہ

آزادی آئی، اور مسرت و سکون کی بجائے اضطراب اور دُکھ کا تحفہ لے آئی۔ یہ وہ صالح اضطراب نہیں تھا جو نئی زندگی کیلئے خوشگواری کا پیش خیمہ ہوتا۔ یہ وہ محبوب دُکھ نہیں تھا جسے امرت کا گھونٹ سمجھ کر پی لیا جاتا۔ یہ اضطراب اور دُکھ سامراجی طلسم کی پیداوار تھا۔ پُرامن آزادی کے حصول کے بعد ہم ایک عجیب قسم کی جنگ آزمائی میں مصروف ہو گئے۔ یہ اصولوں کی جنگ نہیں تھی۔ اور نہ نظریئے کے واضح اور صحت مند تضاد کی غمازی کرتی تھی۔ بلکہ اندرونی اور بیرونی رجعت پسند طاقتوں کی سازش کا جال ہم پر پھینکا گیا تھا۔ اور ہم اس میں اُلجھ کر آپس میں لڑنے لگے تھے ——— خون، خون، خون، ——— آگ، آگ، آگ! ——— چاروں طرف ایک کھلبلی سی مچا دی گئی تھی۔ ہراج اور لاقانونی کے ایسے مظاہرے دُنیا کی تاریخ میں کہیں بھی دکھائی نہیں دیتے۔ مؤرخ حیرت زدہ رہ گئے۔ سائنسدان بوکھلا گئے۔ فلاسفر اپنی انگلیاں چٹخانے لگے۔ اور ادیبوں نے دانتوں تلے اپنی انگلیاں کاٹ کھائیں۔ کہ آخر کیا ہو رہا ہے؟ ———

اور "سخن گسترانہ" لکھنے والا فکر تونسوی اپنے محبوب ادبِ لطیف اور پیارے لاہور سے جدا ہو کر اپنی نسل کی بھیڑوں میں آ ملا۔ کیونکہ اُسے ایک چھرا بردار غنڈے نے زندگی میں پہلی مرتبہ یہ احساس دلایا تھا کہ وہ نسلاً ہندو ہے۔ لاحول ولاقوۃ! یہ ہندو کیا بلا ہے؟ شاید اس چھرے اور ہندو میں کوئی خاص رُوحانی مناسبت ہوگی۔ شاید اس غنڈے اور فکر تونسوی میں کوئی پُراسرار بُعد ہوگا۔ شاید وہ اسے سمجھ نہیں سکا یا شاید دونوں نے ایک دُوسرے کو سمجھ لیا۔

——— اور میں جان بچا کر واگہ کی سرحد عبور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ "سخن گسترانہ" لکھنا میری شریعت میں داخل ہو چکا تھا۔ میں اس شریعت کو چھرے اور غنڈے کا شکار نہیں بنا سکتا تھا۔ میرا جسم ہندو ہوگا۔ میرے ہاتھ پاؤں کی ساخت، میری آنکھوں اور کانوں کی بناوٹ ہندو ہوگی۔ کیونکہ مجھے اُس مزاج کے ذوقِ انتخاب، نظر اور قوتِ حکم و فیصلہ پر صاد کہنے کی گنجائش نظر آ سکتی ہے لیکن میرا ذہن، میرا قلم، میری رُوح مجھے ان میں سے کسی ایک چیز پر بھی اُس درویشِ مقدس کا سایہ دکھائی نہیں دیتا جسے 'مذہب' کہتے ہیں۔ 'مذہب' نے انسانیت کو پچھاڑ دیا ہے لیکن وہ مجھے 'سخن گسترانہ' لکھنے سے نہیں روک سکتا۔ کیونکہ 'سخن گسترانہ' کسی 'مذہب' کا ہدایت نامہ مرتب نہیں کرتا۔ ادب کے زاویے پیش کرتا ہے۔ ادب جو 'مذہب' جیسے لاکھوں بلند مزاجوں سے بھی بلند مزاج ہے۔

چنانچہ آج میں پھر حاضر ہو گیا ہوں۔

یہ خونیں اور زہریلا وقفہ جو چار پانچ ماہ پر مشتمل ہے۔ اپنے پیچھے حقائق و شواہد کی چند دلچسپ یادگار اور لافانی لکیریں چھوڑ گیا ہے۔ یہ وہ ذہنوں کی ابتلائی کیفیت کا دور تھا۔ سماج کی تعصبات نہایت تیزی کے ساتھ کروٹیں بدل رہی تھی۔ کئی تو سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ اور مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ کئی ایک سوچنے کے اسلوب میں ایک نیا رنگ بھر رہے تھے۔ اور کئی ایک کشاکش و تذبذب کی فضا میں سے گذر رہے تھے۔ فکری تغیرات کا ایک بے پناہ طوفان تھا۔ جو گرد و پیش کو بڑی سنگدلی کے ساتھ اپنی لپیٹ میں لئے جا رہا تھا ——— اور اس وقفے میں مجھے ذہنی نفسیات کی ان عجیب و غریب شکلوں کا نہایت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ خاص طور پر ادبی حلقوں میں تو یہ بدلتے ہوئے روپ نہایت گہرا اور فیصلہ کن اثر چھوڑتے جا رہے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں کی جماعت آزمائش کے

کٹھن مرحلے میں سے گذر رہی تھی۔ اور جیسا کہ ادبی حلقوں سے تعلق رکھنے والے ہر ساتھی کو معلوم ہے کہ یہ دَور ایک کسوٹی تھا جس پر ادیبوں کو گھسا جا رہا تھا۔ جس طرح شراب کے نشے کی براہِ راست لہریں انسان کے داخلی نقوش کو لبوں پر لا کر بے ساختگی کے ساتھ نمایاں کر دیتی ہیں۔ بالکل اسی طرح یہ کسوٹی پوری سنگینی کے ساتھ اپنا عمل سرانجام دے رہی تھی۔ اور ادیب تھے کہ بے اختیاری کے ساتھ اپنے ذہن کے نہاں خانوں سے باہر آ رہے تھے۔ بے رحمی کے ساتھ چھانٹی ہو رہی تھی۔ دو قطاریں منضبط ہو رہی تھیں! اور نئے ادیبوں کا بے حد شمار ہجوم اپنی اپنی قطاروں میں اپنے اپنے محاذوں، اور اپنے اپنے مقام کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔

ہماری تحریک کے گذشتہ چار پانچ سالوں میں رجعت پسند ادبی حلقے کی طرف سے ہم پر یہ الزام متواتر لگایا جاتا تھا۔ کہ یہ لوگ مارکسزم کے معتقد ہیں۔ اس دَور میں یہ الزام تیزی کے ساتھ صحیح ثابت ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس عہد کی یہ تاریخی سچائی تھی۔ کہ درحقیقت مارکسی نظریۂ حیات پر یقین رکھنے والے فن کار ہی سچے ترقی پسند تھے۔ اب اس میں کسی بین میکھ کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ پنڈت نہرو نے ایک میٹنگ میں قتل و غارت کے اس دَور کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر آنے والا مؤرخ مجھ سے پوچھیگا کہ اس زمانے میں کس کا ذہن واضح اور کس کی فکر سلامت رہی ہے تو میں بلا تجھجک کمیونسٹ دوستوں کا نام لے دوں گا۔

مارکسی ادیب، مذہبی علمبردار نہیں تھے، مذہب جو کسی سے بَیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ اُسے ان ادیبوں کی سرپرستی کا فخر حاصل نہیں رہا لیکن اس کے باوجود وہ کسی سے بَیر رکھنے کی ماہیت سے آشنا تھے۔ وہ اُس تصوّر سے کماحقہٗ آگاہ تھے جو ایلی ریاضت کی واضح اور روشن اور سیدھی لکیروں سے جنم لیتا ہے۔ اور ترقی پسند ادیبوں کی روح کا لازمہ بن جاتا ہے۔ انہوں نے موجودہ سیاسی ہڑبونگ کے پس منظر میں کام کرنے والے اشاروں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مذہبی جذباتیت کا ایک بہت بڑا وسیع جال پھیلا کر سامراجی ایجنٹ ہمارے ملک کی شطرنج پر ایک خوفناک اور گھناؤنی بازی کھیل رہے ہیں اور ہمارے ملک کے رجعت پسند جاگیردار، سرمایہ دار، رجواڑے اور نواب اس بازی کے اہم مہرے بن کر ہمیں تہذیبی اور تمدنی دیوالیہ پن کے غار میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ سب کچھ واضح تھا سب کچھ صاف تھا۔ اندھیرے کی کوئی بھی موج، ان کے اس سیاسی تفکر میں رخنہ انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ پاکستان پیدا ہو رہا ہے۔ اس نفرت کی کوکھ سے، جو مسلمان کو ہندو کی اقتصادی برتری نے عطا کی تھی۔ اور مذہب کی چھاپ لگا کر اس نفرت کو مقدس اور مسلم کر دیا گیا تھا۔ اور پھر یہ بدنصیبی بھی ان کے سامنے تھی۔ کہ مقابلے پر ہندو مذہب پرستی اُبھر کر فاشسٹ شکل میں نمودار ہو چکی ہے۔ سامراجی سازش کے مکمل شیطانی عناصر لیس ہو کر میدان میں اتر آئے تھے۔ ٹکراؤ لازمی تھا۔ ایک ذلت آمیز ٹکراؤ، ایک غیر انسانی ٹکراؤ، لیکن تاریخی حقائق کا ٹکراؤ!

مجھے اس ٹکراؤ کی واقعاتی تصویر یا اُس کے نتائج سے بحث کرنا بے معنی نظر آتا ہے۔ کیونکہ رجعت پسندی کو اس عروج پہلے جایا گیا تھا کہ اب عظیم سے عظیم دماغ بھی اسے سنبھالا نہیں دے سکتا تھا۔ اس لئے وہ المیہ ہو کے رہا جس کے لئے ابلیسی قوتیں چشم براہ تھیں۔ اتنے بڑے مشترکہ تمدن کو جو مستقبل کے سامراجی محاذ کے لئے ایک زبردست خطرہ بن سکتا تھا۔ دو دشمن اور کمزور ریاستوں میں تقسیم کر کے دراصل قبر میں دفنا دیا گیا تھا۔

——— اور اس کے بعد ———؟!

اور اس کے بعد مجھے یاد ہے کہ کس طرح ترقی پسند ادیبوں کے گروہ میں غلغلہ اُٹھا کس طرح مارکسی نظریہ کا صحیح اور مکمل شعور رکھنے والے ادیب کرب میں مبتلا دیکھے گئے۔ اگر ایک طرف بڑی بڑی چٹانیں دھڑام سے گر کر چکنا چور ہو گئیں، تو دوسری طرف ننھے ننھے تنکے اپنے خلوص اور شعور کی گردن اٹھائے اپنے آپ کو صحیح سلامت کنارے پر لے جاتے ہوئے پائے گئے ہمیں کل تک جن کے ادب کی

کی ترقی پسندی پر ناز تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ جس نے کل تک فاشزم اور بربریت کے خلاف انسانیت کو بیدار و بلند رکھنے کی دھن میں نظمیں لکھی تھیں۔ وہ بندوق کاندھے پر رکھے شکار کی تلاش میں گھومتا اور سونگھتا پھرا۔ جس نے کل تک زنگ اور بربریت سے انسانیت اور تہذیب کی بلند قدروں کو زندہ رکھنے کی خاطر نفرت بھری لکیروں کو بین الاقوامیت اور ابدیت بخشی تھی۔ وہ آج آگ اور خون کی ہولی کا "کنہیا" بنا ہوا تھا۔ جو کل تک شب ۔۔ قوتوں کا راگ الاپنے کے بعد کسانوں کے جھونپڑوں اور چوپالوں میں مارکس اور لینن کی عقیدت کو شعروں میں ڈھال رہا تھا۔ اور چھاتی پر زور زور سے ہاتھ مار کر انسانیت کی بقا کے لئے اپنا تن من اور دھن بھینٹ کرنے کے بلند بانگ دعوے کر رہا تھا۔ وہ رہزنوں اور لٹیروں کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کو گونجا رہا تھا جس نے کل تک انسانی دکھوں الجھنوں اور مجبوریوں کے راز فاش کر کے کہانیاں لکھی تھیں۔ وہ آج اپنا نقاب اٹھا کر سیاسی اندھیرے میں سینہ تانے پھرتا تھا۔ جو کل تک مشترکہ کلچر اور مشترکہ تہذیب کے تحفظ کے لئے جگہ جگہ اپنے گیتوں کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرتا تھا۔ اس پر ایک ایک اپنے مذہب کی عظمت اور سنسکرتی کے راز فاش ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اور وہ بازاری اور عامیانہ صلواتوں کے ذریعہ اپنے مذہبی دشمنوں سے انتقام لے رہا تھا۔ اور چٹخارے بھر رہا تھا ۔۔۔ جو کل تک اپنے فنکارانہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر سماجی اور سیاسی آمریت ۔ رجعت پر تیروں کی بوچھاڑ کرتا رہتا تھا۔ اسے آج دوسرے کا مذہب وحشی، غدار اور غیر مہذب دکھائی دینے لگا تھا۔ اور جو کل تک اپنے آپ کو لال جھنڈے والی جمعیت خود لسان کا واحد ترجمان اور نقیب سمجھتا اور ان کے لئے مضامین لکھتا، لیکچر دیتا اور نظمیں پڑھتا رہتا تھا۔ وہ آج مصیبت زدہ پناہ گزینوں کے گھروں کا مال و اسباب لوٹ کر شہر کی گلی کی سڑک پر آ گیا تھا۔ اور رجعت پسندوں فرقہ پرور غنڈوں اور وحشیوں کو حق بجانب ٹھہرا رہا تھا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ جو عظیم آرٹسٹ ایک مدت تک مارکسی نظریے کے مستند سمجھا جا رہا تھا۔ اور جس کی ذات پر ترقی پسند ادبی حلقے ناز کیا کرتے تھے۔ وہ آج عریاں ہو کر زبان کے مسئلہ پر یہ نعرہ بلند کر رہا تھا۔ کہ ہندی مسلمانوں کو ہندوستانی سانچے میں ڈھال کر اردو زبان سے قطع تعلق کر لینا چاہیئے۔

۔۔۔ آپ نے اندازہ لگا لیا ہے کس قدر تحیر خیز حقائق ہیں یہ کس طرح اس دہکتی ہوئی بھٹی میں سے کندن اور لوہے کے ٹکڑے الگ الگ ہو گئے۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر اس دہکتی ہوئی بھٹی کا ایک المیہ پہلو تھا تو ایک خوشگوار پہلو یہ بھی تھا کہ ہماری تحریک کو بہت سے ستھرے ادیب میسر آ گئے۔ اور ہمارے سامنے ان ادیب دوستوں کے تیور واضح ہو گئے جو ہمارے ساتھ تھے لیکن ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ ہم نے ان کی جھکی ہوئی گردنوں اور بدلتی ہوئی نگاہوں کو دیکھ لیا۔ آج سمجھوتے مصالحت یا مفاہمت کا وقت نہیں رہا۔ ایک عظیم اور کڑی جدوجہد ہمارے سامنے منہ پھاڑے کھڑی ہے۔ اس لئے اب ہمیں کڑی نگاہ سے کام لینا پڑے گا۔ ہمیں ذرا ذہنی تشدد برت کر کئی ایک دوستوں کو جھٹک دینا پڑے گا۔ تاکہ وہ ہمارا دامن تھام کر ہمیں نئی جنگ کے لئے روک نہ لیں۔ اور یہ اچھا ہوا کہ ہمیں ان کے الجھاؤ سے نجات ملی۔

اس سلسلہ میں ایک بات نے مجھے ہمیشہ پیچیدگی میں رکھا۔ کہ مشرقی پنجاب، مغربی پنجاب اور دہلی میں بسنے والے ادیبوں کی نقل مکانی تو سمجھ میں آ سکتی تھی۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ یو۔ پی سے بھی ادیب دوست چلے آ رہے ہیں بمبئی سے بستر اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ مجبوراً ٹھاٹھیں مارتا سمندر پار کر رہے ہیں۔ کلکتہ سے سوار ہو کر آ رہے ہیں۔ اور اگر پوچھا جائے کہ کیوں حضرت خیریت تھی؟ تو فسادات کے موہوم خطرے کی آڑ لے کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ خاموشی مجرمانہ ہے۔ یہ خاموشی ذہن کی ان الجھنوں سے پیدا ہوتی ہے۔ جو غیر مارکسی اور غیر ترقی پسند نظریوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ بات اب صاف ہو جانی چاہئے کہ آپ اپنی الجھنوں کی لپیٹ میں رہ کر بھی ترقی پسند ادبی گروپ کا ساتھ دینا چاہتے ہیں۔ یا اس گروپ کا ساتھ چھوڑ کر لپیٹ میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

میں اُس دوست کا ممنون ہوں گا جو مجھے اس اُلجھن سے نجات دلانے کا کوئی راستہ بتا دے!

اسی طرح کا ایک سوال گذشتہ دنوں مجھ سے سہیل عظیم آبادی نے پوچھا تھا۔ کہ جب ڈوگرہ شاہی استبدادیت کی حمایت میں چند "ترقی پسند" فن کاروں اور ادیبوں کی اپیل شائع ہوئی تھی اور جس پر بڑے بڑے جغادری ادیبوں اور بزرگوں کے دستخط نمایاں ہیں وہ کیا چیز ہے؟ یہ ترقی پسند دوست کشمیری عوام کے خونی تقاضے اور حق کو الگ کر کے کیوں نہیں دیکھ سکتے؟ —— تو سہیل کا یہ سوال میرے دماغ پر ابھی تک مسلط ہے اور مجھے اوروں سے شکوہ نہیں لیکن اشتراکی شاعر کے نام پر ہمیں ضرور دھچکا تھا۔ اور یہی شکایت سہیل کو تھی کہ اگر اب ادیب سے بھی یہی فاشیت اور جمہوریت کی واضح تصویر نہیں دکھا سکتا۔ تو پھر؟ ——

ادبی محاذ کی اس تاریخی کشمکش اور انتشار کے بعد ——؟ کیا ہمیں صرف ٹوٹے ہوئے تاروں کی مرثیہ خوانی تک محدود رہنا چاہیے یا منقسم کرنے والے عناصر کی بیخ کنی کر کے اپنی دونوں آزاد ریاستوں میں ایک نئی اور روشن تہذیب کا آغاز کر دینا چاہیے۔ یہ سوال ہر ادبی حلقے کے لئے ایک اہم موضوع بنا ہوا ہے۔ اب اس حقیقت میں شک و شبہ کی کوئی بھی گنجائش نہیں رہی کہ ادب برائے زندگی کے صحت مند نظریے پر اپنے فن کی بنیادیں رکھنے والے ادیبوں کو سیاست سے الگ نہیں رکھا جا سکتا۔ سیاست ہماری زندگی پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی ادیب چاہے کہ وہ کسی بھی سماجی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے سیاست سے اپنا دامن بچا سکے تو ہم کہیں گے کہ اسے ادب جیسی مقدس اور بلند ترین وادی میں قدم رکھنے کا کوئی حق نہیں۔

اسی لئے پاکستان اور ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں پر ایک بہت بڑی ذمہ داری آ پڑی ہے۔ انہیں دونوں ریاستوں کے سیاسی رُخ پر کڑی اور واضح نگاہ رکھنی پڑے گی۔ بین الاقوامی سیاست کے پہلوؤں کو جانچنا ہوگا۔ دوسری بڑی جنگ کے بعد دنیا تیزی کے ساتھ دو محاذوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ایک تو سامراجی محاذ ہے۔ جو دنیا کو اپنی معاشی اور سیاسی برتری کی زنجیروں میں جکڑ کر اپنے دست نگر بنا رکھنا چاہتا ہے۔ اور دوسری جانب جمہوری محاذ ہے۔ جو سامراجی بلاک کی ریشہ دوانیوں سے آشنا ہو چکا ہے اور منظم ہو کر اس کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں اتر آیا ہے۔ ہماری ریاستوں کے ادیبوں کو بھی اپنے ملک کی برسرِ اقتدار طاقتوں کے سیاسی رجحانات کا جائزہ لینا پڑے گا کہ وہ بین الاقوامی سیاست میں کس مقام پر کھڑے ہیں۔ ہمیں اس امر کا شعور رہنا چاہیے کہ آزادی ملتے ہی ہماری دونوں ڈومینیوں پر سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے نے اپنا تسلط قائم کر لیا ہے۔ اور فطری تقاضے کے طور پر وہ سامراجی محاذ کا بازو بننے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ کیا ہمارے ادیب اس کوشش میں ہاتھ بٹانا پسند کریں گے یا عوامی اور جمہوری محاذ کا ساتھ دے کر انسانیت کی خوشحالی اور مستقبل کی مسرت کو قریب تر لانے میں مدد دیں گے؟

میرے خیال میں ہمیں اس بارے میں کسی تذبذب کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے قلم سے لکھے ہوئے ہر لفظ، ہر فقرے اور ہر سطر سے جمہوری محاذ کی استواری کا ثبوت ملنا چاہیے۔ چاہے اس کے لئے ہمیں مصائب کے طوفانوں میں سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔ یہ طوفان ہم پر ٹوٹ پڑے گا۔ اور وہ اپنے ملکوں کی اندرونی سیاست کے رجعت پسندانہ جھکاؤں سے پیدا ہوگا۔ اگر ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر، جذباتی یا منطقی طور پر بھی رجعت کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی غلطی کریں گے تو ہم تاریخ کے بہت بڑے مجرم ٹھہرائے جائیں گے۔

شاہنامۂ اسلام جلد چہارم

جسکا بیتابی سے انتظار تھا شائع ہوگئی ہے

اِس حالت میں کہ ہر سُو ایک تلاطم بپا ہے۔ اسلام اپنے بدترین دشمنوں سے معرکہ آرا ہے اور مسلمان شانِ اسلام کے ہاتھوں خون خاک میں ملائے جا رہے ہیں

ابوالاثر حفیظ جالندھری

نے شاہنامہ اسلام کی چوتھی جلد نظم فرما کر شائع کر دی ہے

اس جلد میں آپ ملاحظہ کریں گے کہ ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر ہمارے ہادیٔ اکرم اور آپ کے صحابۂ کرام کو بھی مشرکوں یہودیوں ساہوکاروں اور وحشیوں کی متفقہ دست درازی اور کمینگی کا اسی طرح آماجگاہ بننا پڑا تھا جس طرح آج امتِ اسلامیہ اغیار کے نرغے میں ہے

تیسری جلد میں میدانِ اُحد کے اندر مسلمانوں کی شہادت۔ آنحضرتؐ کا زخمی ہونا۔ منافقین کی شرارتیں آپ دیکھ چکے ہیں۔

چوتھی جلد میں اُحد کی ضربِ کاری کے باوجود آنحضرتؐ اور صحابۂ مجاہدین کی محیر العقول اولوالعزمی اور زخمداری کے باوجود دشمنوں کا تعاقب۔ مدینہ کے منافقین کی حرکات۔ مشرکینِ حجاز اور قبائلِ نجد کے ہاتھوں مبلغینِ اسلام کا قتلِ عام۔ مکہ میں مسلمان مبلغوں کا نیلام اور قتل کا میلہ۔ یہودیوں کی سرمایہ داری کا فتنہ۔ تمام عرب کے وحشیوں کا مدینے پر متحدہ دھاوا۔ مسلمانوں کا محصور ہونا اور انتہائی آزمائش کے بعد صبر و ضبط و ایمان کی قوت کے سبب اسلام کی فتح۔ آپ اس جلد میں پڑھیں گے۔

انشاء اللہ یہ کتاب آپ کی موجودہ مشکلات کا حل پیش کرے گی

حفیظ جالندھری کی دیگر تصنیفات

شاہنامۂ اسلام جلد اول	شر	معیاری افسانے	عہ/	پردہ اور تعلیم	للعہ/
شاہنامۂ اسلام جلد دوم	شر	نغمہ زار	عہ/	بچوں کے گیت اور نظمیں چار حصص	
شاہنامۂ اسلام جلد سوم	صر	سوز و ساز	ہے/	فی حصہ	۸ر
شاہنامۂ اسلام جلد چہارم	صہ/	تصویرِ کشمیر	۱۲ر	سلام ۴ر / دو حصہ	۴ر
تلخابۂ شیریں (جدید مجموعۂ کلام)	صر	یہ ہماری انجمن	۴ر	ہفت پیکر (حفیظ کے افسانے)	عہ/

HAFEEZ Poet Son of India by ANELA
(انگریزی)　　5/-

(ملنے کے پتے)

شیخ غلام علی اینڈ سنز
تاجرانِ کتب کشمیری بازار لاہور

ملک دین محمد اینڈ سنز
تاجرانِ کتب کشمیری بازار لاہور

شیخ برکت علی اینڈ سنز
تاجرانِ کتب کشمیری بازار لاہور



غالب [illegible]

نظمیں، غزلیں، گیت

فکر تونسوی
محمود جالندھری
علی سردار جعفری
منیب الرحمٰن
سید مطلبی فرید آبادی
احمد ندیم قاسمی
عبدالمجید بھٹی
انجم رومانی
قیوم نظر
وشوامتر عادل
شاد عارفی
تابش دہلوی
قتیل شفائی
کمال احمد صدیقی
کیفی اعظمی

خاطر غزنوی
جگر مراد آبادی
حفیظ ہوشیارپوری
ساحر لدھیانوی
عبدالمتین عارف
روش صدیقی
سیف الدین سیف
یوسف ظفر
مختار صدیقی
عبدالحمید عدم
اثر لکھنوی
مضطر اکبر آبادی
ناصر کاظمی
حافظ لدھیانوی
مقبول احمد پوری

ہمارے ساتھی

فکر تونسوی: نئے لکھنے والوں میں شکل و شباہت کے لحاظ سے فکر غالباً سب سے زیادہ ستم رسیدہ ہے ـــــ دبلا پتلا، مختصر سا جسم، سانولا رنگ، پچکے ہوئے رخسار، اندر کو دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی بے جان سی آنکھیں، تنگ پیشانی جس پر ہر لحظہ سوچتے رہنے کے باعث شکنیں پڑ چکی ہیں، بے ڈھب ناک، چھدرے ہوئے کان اور لٹکے ہوئے بازو ـــــ آپ اس سے مل کر بے حد مایوس ہوں گے اور اس سے دور بھاگنا چاہیں گے۔ مگر وہ ان لمحوں میں نہایت انہماک سے آپ کے دل کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوگا۔ اس کے جسم کا ہر حصہ آپ سے کہہ رہا ہوگا "مجھ سے گریز مت کرو میں بہت فیاض ہوں میرے پاس خلوص کی بے پناہ دولت ہے میں تمہیں اس سے مالا مال کر دوں گا" مگر آپ یہ کہتے ہوئے دروازے کو اور بھی زیادہ مضبوطی سے بند کر لیں گے کہتے جائیں "یہ دولت میرے کس کام کی؟" لیکن فکر برابر آپ کے دل کا دروازہ کھٹکھٹاتا رہے گا۔ حتیٰ کہ یا تو آپ خود ہی اس کے پٹ کھول دیں گے یا وہ نقب لگا کر اندر چلا آئے گا

فکر کو دیکھ کر آپ کے ذہن میں والٹیئر کی یاد کوند جائے تو بعید نہ ہوگا کیونکہ والٹیئر کی طرح اگر وہ جسمانی لحاظ سے دائم المریض اور ناتواں سا دکھائی دیتا ہے تو والٹیئر ہی کی طرح اس کی ذہنیت صحت مند، توانا اور انقلاب انگیزی کے لحاظ سے لپکتے ہوئے شعلوں کا مسکن دکھائی دیتی ہے، وہ شعلے جو کبھی مذہب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور کبھی حکومت کو، کبھی سماج کو اور کبھی خود اپنے آپ کو

قارئین کا ایک طبقہ فکر کو صرف ایک بڑا نثر نگار تسلیم کرتا ہے۔ دوسرا صرف ایک بڑا شاعر۔ "ہیولے" کی اشاعت نے پہلے طبقہ کی رائے کو یکسر بدل ڈالا ہے اور "چھٹا دریا" غالباً دوسرے طبقے کے نظریہ کو منقلب کر کے رکھ دے گا۔

چار سال تک مکتبہ اردو اور ادب لطیف کی شب و روز بے لوث خدمت کرنے کے بعد آجکل فکر اہل شہر کی "مذہب پرستی" کے احترام کے پیش نظر لاہور چھوڑ کر جالندھر میں مقیم ہو گیا ہے اور وہاں سے ترقی پسند مصنفین کے لئے ہفتہ وار جریدہ "رفتار" نکال رہا ہے!

ساحر لدھیانوی: رات کے دو بجے سونے اور دن کے دس بجے بیدار ہونے والا یہ شاعر اپنی موٹی موٹی بیتاب آنکھیں، لمبی ناک، طویل مگر دبلا پتلا جسم لئے اور لمبی لمبی انگلیوں میں سگرٹ دبائے آپ کو تین چار بلکہ کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ دوستوں کے جھرمٹ میں کندھوں کو قدرے سکیڑے اور گردن کو ایک جانب جھکائے زندگی کی باقاعدگی کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا ـــــ کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر میں، لاہور کے کسی قہوہ خانے میں، کسی سیاسی، روزنامہ یا ادبی ماہنامہ کے دفتر میں، کسی سینما ہاؤس میں یا کسی سڑک پر ـــــ کیونکہ وہ ایک آزاد طبیعت کا مالک ہے اور بقول علامہ اقبال "نہیں مقام کی خوگر طبیعت آزاد!"

وہ ستیارتھی کے میلا پن کی داستانیں اکثر سناتا ہے لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ خود ستیارتھی سے کہیں زیادہ میلا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اگر ستیارتھی جٹا دھاری ہیں تو ساحر خالص مغربی انداز سے بال ترشواتا ہے اور اگر ستیارتھی نے بڑی احتیاط سے داڑھی چھوڑ رکھی ہے تو ساحر اسے ہر روز بڑی بے رحمی سے بلیڈ کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس میلا پن نے ساحر کی غیر معمولی ذہانت، معاملہ فہمی اور دور اندیشی پر ایک نہایت لذیذ سا پردہ ڈال رکھا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے اسے زندگی میں رومان کی بہت سی سیڑھیاں چڑھنے میں مدد دی ہے!

ذاتی صفات سے قطع نظر ساحر کی شاعری سے تلوار کی طرح چمکتی ہوئی نغمگی، ستاروں کی طرح جھلملاتی ہوئی رعنائی اور لاوے کے مانند بہتی ہوئی انقلاب پسندی، اس کے عوامی فلسفہ اور اس کی پرستاری اپیل نے ساحر کو نوعمری کے باوجود چوٹی کے شاعروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ ادب کے سماجی فرائض اور اس کی افادیت کا اتنی سختی سے قائل ہے کہ اگر اس نظریہ کی پیروی کے جرم میں نکتہ چین فن کے تاجر اسے فنکار ماننے سے بھی انکار کر دیں تو اسے رنج نہ ہوگا۔

فکر تونسوی

نئے بادشاہ نئے عوام

نئے شہنشاہو، خادموں کا سلام پہنچے
—تو آپ تشریف لے ہی آئے زمیں کی بے رنگ بارگہ میں۔
یہ سچ ہے آخر حضور کب تک نقابِ دامِ درسن میں رہتے۔
ہم اپنے ظلِّ الٰہی کی چشمِ نم کے صدقے،
کہاں تلک یوں عذاب سہتی ہماری درماندگی کی خاطر
بھلا غلاموں کی تاب تھی جو ہمارے شہزادگانِ عالی
بایں ہما بختی، قید و بندِ فرنگ میں سردآہ بن کر گزار دیتے
ہم اُٹھے اور اپنی زندگی کو،
لہُو کے دریا میں ڈوبنا، تیرنا سکھایا،
دہکتے انگاروں پر گذرنے کی خُو بتائی
بہار آتے نہ ہم نے دیکھی، گلاب کھِلتے نہ ہم نے پائے
ہم اپنی بے حُرمتی میں گم تھے، ہم اپنی رسوائی میں مگن تھے
ہم اپنے ماضی کے مُردہ و مَحنی سے ڈھانچے کو لا رہے تھے
کہ اس میں اب پھر سے رُوحِ بجرنگ و لا الٰہ کا وہ ناد پھونکیں
جو چاہے ہم سے تو ننھے بچّوں کو نوکِ شمشیر پہ اُٹھا لیں
جو چاہے تو ہم جوان بہنوں کی بے بہا عصمتیں لُٹا دیں
اگر وہ چاہے تو خونِ یکرنگ میں اِک ایسی سیاہ دھاری سی جھلملا دیں
کہ آسماں پر زمیں پھٹے اور پہاڑ ٹکرا کے ٹوٹ جائیں

— ہمارے مرحوم غمگسارو! — نئے شہنشاہو، بخت قائم!!
سُنا ہے ہم نے بہار آئی ہے، غم مٹا ہے۔
اور آپ نے بھی تو جامۂ فقر (چشمِ بد دُور) پھاڑ ڈالا
یہ تاجِ سیمیں، یہ خلعتِ زرنگار آخر پہن لئے ہیں۔
"نہیں نہیں، آپ کی جبیں پہ یہ قطرۂ انفعال کیا ہے؟"
وفا کے کم ظرف کو صلے کی تڑپ نہیں ہے۔
بھلا غلاموں کو اپنی آزادیوں سے مطلب؟
ازل کے تشنہ لبوں کو آئے گی اب کہاں سے مجالِ رندی
یہ غم گساری نقاب کی طرح پہنی جاتی رہی ہے اکثر
یونہی شہنشاہ بھیس بدلے ہوئے اندھیرے میں گھومتے ہیں
یونہی سجاتے ہیں اپنی بزمِ سرود و مینا
مگر ہمارے یہ بوسہ ہائے وفا نہیں خوگرِ شکایت
کہ اب بھی یہ ساغرِ مےناب ہی بنیں گے
بتائیے حکم دیجیے، بندگانِ عالی!
کہ اپنے کھیتوں کی لہلہاہٹ سمیٹ لائیں،
کہ اپنے گلشن کی نکہتوں کو لپیٹ لائیں،
کہ اپنے دریاؤں کہساروں کو چیر کر جُوئے شہد و امرت نکال لائیں،
کہ آسماں پر کمند پھینکیں، حسیں ستاروں کو نوچ لائیں،
کہ اپنے ہونٹوں سے گیت چھینیں،
کہ جھونپڑوں کے دیئے بُجھا دیں،
اور اپنے تازہ شہنشہوں کی قبائے سیمیں کی نذر کر دیں۔

مخمور جالندھری

باڑھ

وہ غار ہو، کوئی جھونپڑی ہو کوئی محل ہو
بلند و مضبوط کوئی دیوار اپنے چاروں طرف اٹھا کر
مجھے تو رہنا تھا گھر بنا کر
کہ غیر محفوظیت ازل سے عذاب ہے میری زندگی پر
نفس نفس اک عتاب ہے میری زندگی پر
وجود کے خوف سے بڑی دیر تک اسیرِ عدم رہا ہیں
وجود میں آگیا تو محبوسِ آشیان و قفس رہا ہیں
چہار دیواریوں کی ظلمت فروز وسعت میں بس گیا میں
کڑکتی بجلی کے تازیانوں سے، باد و باراں کے تند ریلوں سے خوف کھا کر
یہ اپنے ہی قافلے میں چلتے ہوئے درندوں کے تیز دانتوں کا عزم پا کر
مجھے تو رہنا تھا گھر بنا کر
بلند اور پائدار دیوار اپنے چاروں طرف اٹھا کر
کہ بربریت جو آکے ٹکرائے بھی مجھے چھیڑنے نہ پائے

زمیں کے سینے پہ بوجھ اینٹوں کا رکھ چکا ہوں
زمیں کا سینہ ـــــ کہ جس کی بے داغ اچھوتی رعنائیاں ابھی تک نگاہ میں ہیں
اچھوتی رعنائیاں ـــــ ہر اک سمت آج حالِ تباہ میں ہیں
زمیں کے سینے پہ دیکھتا ہوں لہو سے رستی ہوئی خراشیں
لہو سے رستی ہوئی خراشیں یہ دستِ حیوانیت کی گلکاریوں کے زخمِ نظر کرم ہیں
زمیں کے نقشے ـــــ کئی ممالک کی سر دھکیلی ہوئی شکستہ غلیظ لاشیں
عظیم اور منحنی ممالک گھروں کے مجموعے خار پار مکڑیوں کے جالے
زمیں کے چہرے کے چند اذیت فروز چھالے
عظیم اور منحنی ممالک بڑے بڑے گھر جو چھوٹے چھوٹے گھروں کو آغاز سے سمیٹے ہوئے ہیں
اپنی حدوں کے اندر

کہ جیسے خوں تھوکتے ہوئے ہوں مریضِ مہتاب رنگ صحت کدوں کے اندر
مریض ـــــ ایسے مریض جو جانتے تو ہوں درد کا مداوا
دوا کسیلی سمجھ کے لیکن کئے چلے جا رہے ہوں اپنی اجل گوارا
اور اپنے ہی ہاتھ سے یہ کھینچی ہوئی لکیروں میں سرحدوں میں
تڑپتے ہوں پھیلتے بھی ہر لمحہ دیکھتے جا رہے ہوں خوف و ہراس کے جانگداز سائے
ہراس ـــــ کوئی ادھر لکیروں کو پار کر کے چلا نہ آئے
کوئی لکیروں کو پار کر کے ادھر کی دُنیا پہ چھا نہ جائے
جو لُوٹ کے مال کے ذخیرے ہیں کھا نہ جائے
ادھر لکیروں کے رہنے والے ادھر لکیروں کے رہنے والوں سے ڈر رہے ہیں
حدوں کے طرفین خوں ارزانیوں کی تدبیر کر رہے ہیں
جلال پھیلا ہوا ہے حد بندیوں کے اندر
دھڑام سے گر پڑے گا حد بندیوں کا پنجر ـــــ

دھڑام سے گر پڑا ہے حد بندیوں کا پنجر
ادھر لکیروں کے رہنے والے اُدھر لکیروں کے رہنے والوں سے مسکراتے ہوئے ہم آغوش ہو گئے ہیں
تمام جاگے ہوئے جو فتنے تھے سو گئے ہیں
یہ شرق اور غرب کے افق ـــــ جانے کتنی صدیوں کا ایک بچھڑا ہوا جوان اور جمیل جوڑا
لپک کے مشتاق باہیں پھیلا کے مل گیا ہے
کنول جو مرجھا رہا تھا صدیوں سے کھل گیا ہے
گذر کے بنتا ہے درد حد سے یونہی مداوا
زمیں کے سینے پر کوئی چھالا لہو سے رستی ہوئی نہیں ہے خراش کوئی
کہیں بھی سڑتی ہوئی نہیں سرد لاش کوئی
سکوں سے رہنے لگا ہے دل گھر میں بلند و مضبوط ایک دیوار اپنے چاروں طرف اُٹھا کے
بلند و مضبوط ایک دیوار اِک چٹان ـ اِک فصیلِ آہن
اب ان لکیروں کو پار کر کے ریا کے جھونکے، فساد و فتنہ کے تند ریلے
اِدھر نہیں آسکیں گے ہرگز رہے گا محفوظ میرا مسکن
تمام جلوہ گہِ زمیں اِک وسیع اور پُرنشاط گھر بن گئی ہے میرا

سردار جعفری

تلنگانہ

(حیدر آباد کے جاگیردارانہ نظام کے خلاف تلنگانہ کے کسانوں کی مسلح بغاوت)

تیز ہے وقت کی نبضوں میں لہو کی گردش
زلزلہ خیز ہے بپھرے ہوئے تاروں کا خرام
دھڑکنیں دل کی بجاتی ہیں دُہل سینے میں
ہاتھ لہراتے ہیں سرمست پھریروں کی طرح

تین سو سال کے لب بستہ دہن کھلتے ہیں
جوشِ گفتار میں پگھلے ہوئے لاوے کا اُبال
کتنا بیباک ہے صدیوں کی خموشی کا خروش
آج فریاد میں تاثیر ہے للکاروں کی
آج ہر سانس میں جھنکار ہے تلوار کی

تہلکہ رات کی سرحد پہ مچا رکھا ہے
لشکرِ صبح میں شب خون کی تیاری ہے
یہ اُبلتے ہوئے نعرے ہیں کہ سیلابِ عظیم
جو در و بام سے ایوانوں کے ٹکراتے ہیں
خس و خاشاک بہا جاتا ہے جاگیروں کا
آہنی قدموں کی آہٹ سے دہلتی ہے زمین
ان کی رفتار کو دیتے ہیں بگولے بھی خراج
بجلیاں نقشِ قدم چوم کے رہ جاتی ہیں

(۲)

یہ مجاہد، یہ بہادر، یہ جیالے، یہ کسان،
برق و باراں کے حریف
جن کے چہروں پہ ہے دھرتی کا سکون اور وقار
اور ہتھیلی میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
کیاریاں اشکوں کی بوتے تھے، لہو کاٹتے تھے
آج ہر کھیت میں، ہر دشت میں، ہر میدان میں
سرخ سینوں سے چھڑکتے ہیں لہو کے قطرے
بجلیاں پھلتی ہیں، گل کھلتے ہیں بم اُگتے ہیں

بوڑھے ہونٹوں سے جوانوں کو دُعا ملتی ہے
اُنگلیاں پیار سے بندوقوں کو سہلاتی ہیں
گھر میں ڈھالے ہوئے بم گولوں کی پیشانی کو
عورتیں پھولوں سے، صندل سے سجا دیتی ہیں
مائیں بچوں سے یہ کہتی ہیں کہ تعظیم کرو
دیوتا آئے ہیں تسلیم کرو
روز و شب گاؤں میں کھیتوں میں بیابانوں میں

دیوتاؤں کا نکلتا ہے جلوس
نوجواں ہنستے ہوئے گاتے ہوئے
موت سے لڑنے کو میدان میں چلے جاتے ہیں
اور بغاوت سے سلگتی ہوئی دوشیزائیں
کانپتے ہاتھوں میں شربت کے کٹورے لے کر
اپنا دل اپنی نگاہوں میں اُٹھا لاتی ہیں

نیند آنکھوں کی چرا لیتے ہیں ہتھیاروں کے خواب

کھیتیاں خوش ہیں کہ اب ان کی بہاروں کی خزاں
چھد کے رہ جائے گی جمہور کی سنگینوں میں
راہیں رقصاں ہیں کہ ذروں کے دھڑکتے ہوئے دل
ظلم کی فوج کے قدموں سے نہ زخمی ہوں گے

پانی ہنستا ہے کہ اب اس کا چھلکتا ہوا خون
کھیت سینچے گا نہ بدکار زمینداروں کے
گنگناتی ہیں ہوائیں کہ کلیجہ اُن کا
دُکھ بھری چیخوں کے نشتر سے نہ چھلنی ہوگا
قہقہے ٹُوٹے ہوئے ساز کو کرتے ہیں درست

صبحیں خوش رنگ ہیں شاموں کی جبیں ہے روشن
ڈالیاں کرتی ہیں تیار شگوفوں کا لباس
فتح کا جشن منانے کے لئے

اب یہ ٹُوٹے ہوئے ٹھٹھرے ہوئے اکڑے ہوئے ہاتھ
بڑھ کے محلوں کو اٹھا لیں گے کھلونوں کی طرح

خواب کے سامنے تعبیر کا آئینہ ہے

(۳)

میں بہت دور سہی تجھ سے پرے ارضِ دکن
تیرے جذبات وخیالات سے نزدیک ہوں میں
میرے سینے میں ترے نقشِ قدم روشن ہیں
تیرے بچوں نے مری گود میں بوئے ہیں جو بیج
وہ مرے نغمہ و اشعار میں پھل آئے ہیں
آج کل تیرا تصور ہی ہے ہمدم میرا

"خبریں" جب آتی ہیں کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے لاش
گود میں جنگ کے ٹوٹے ہوئے ہتھیار لئے
بھر کے چلّو میں شہیدوں کے لہو کی بوندیں
وہ مری روح کے چہرے پہ چھڑک دیتی ہیں
اور مرے سینے میں اک آگ سی لگ جاتی ہیں
میرا ہر قطرۂ خوں مجھ سے یہ کرتا ہے سوال
بول ہم جنگ کے میدان میں کب اتریں گے ؟
اس بغاوت کی حسیں راہ سے کب گذریں گے ؟

منیب الرحمٰن

مہاتما گاندھی کی موت پر

کیا فقط گردشِ انفاس ہے انساں کی حیات ؟
کیا گرفتار ہے وہ وقت کی زنجیروں میں ؟
کیا وہ ظلمت گہِ تقدیر کا زندانی ہے ؟
اور کیا اُس کا وجود
ایک تنکے کی طرح ہے جو بہا جاتا ہو
سر ٹپکتے ہوئے، بپھرے ہوئے طوفانوں میں
بیکسی جس کی ہو بیگانہ ذوقِ منزل ؟
میں نے ہنگامِ سحر
ڈوبتے چاند ستاروں سے کیا ہے یہ سوال
سرد ہوتے ہوئے نمناک شراروں سے کیا ہے یہ سوال
اور وہ ہنس دئے جیسے انہیں معلوم نہ ہو
یہی بیباک تمسخر تھا مگر اُن کا جواب !

زندگی ایک حقیقت ہے، عیاں
ہم سے ممکن ہے تعین جس کا
ہم پرکھ سکتے ہیں احساس کے پتھر پہ صفاتِ ہستی
ڈال دیتی ہے مگر موت جب اِس پہ پردہ
تو ہمارے یہ حواس
عجز سے سر کو جھکا لیتے ہیں

ٹوٹنے لگتی ہیں اِنساں کی بنائی ہوئی قدریں اُسوقت ۔
کیا کہیں اِس کو! یہ ہے اپنی نگاہوں کا فریب.
ہے فقط وہم حقیقت کا فنا ہو جانا!

پھر بھی ہم درد سے چیخ اُٹھتے ہیں جب دیکھتے ہیں.
اپنی قدروں کے بکھرتے ہوئے تانے بانے.
اذنِ ماتم ہمیں دیتی ہے اجل
ڈبڈبا آتے ہیں آنکھوں میں ہماری آنسو
چاک دامانی بنا کرتی ہے اپنی ہمدم
اور ہم سوچتے ہیں
کیا یہی طرفہ تماشہ ہے مآلِ ہستی ؟

آج بھی جب غم و اندوہ کے کالے بادل
اپنے بوسیدہ مکانوں پہ ڈھلک آئے ہیں
زندگی خاک بسر پھرتی ہے
مائلِ گریہ ہیں اجداد کے آثارِ کہن
اور ہر شخص کے سینے میں ہے ہیجان بپا
سرسراتی ہو ہوا جیسے بیابانوں میں
دل میں آتا ہے خیال

کیا اجل ہستیٔ اِنساں کو مٹا سکتی ہے ؟

"شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے"
کون سی شمع تھی ایوانِ زمیں کو جس نے
سالہا سال منوّر رکھا
اور جو جل بجھی دم بھر میں شرارے کی طرح ؟
مادرِ گیتی، بتا کس لئے خاموش ہے تو ؟
مسجدو ! بہرِ خدا تم ہی زباں سے بولو'
اے کلیساؤ ! کھڑے تکتے رہو گے کب تک
اپنی کھوئی ہوئی آنکھوں سے فلک کی جانب ؟
مندرو ! اتنا بتا دو وہ صدائے ناقوس
آج کیوں ہو گئی خاموش تمہارے اندر ؟
تم نہیں بولو گے ؟ اچھا، نہ سہی !
مجھے معلوم نہ تھا
شعلۂ عشق سیہ پوش بھی ہو سکتا ہے !

اے وطن ! اے مرے اجداد کی عظمت کے نشاں !
آج تو سوگ میں ہے نا بہ کمر ڈوبا ہوا۔
اُٹھ گیا تجھ سے وہ درویشِ ملوکانہ صفات
جس کا ہر لفظ تھا تیرے لئے پیغامِ حیات'
اُس نے گایا تری وسعت میں وہ نغمہ جس کو
آبشاروں نے سُنا'
لہلہاتے ہوئے کھیتوں نے سُنا'
آسماں بوس پہاڑوں نے سُنا'
ساری دھرتی نے سُنا'
اور وہ سب بیک آواز یہ چلّا اُٹھے
یہ ہے فطرت کے دھڑکتے ہوئے دل کا نغمہ
جس کو اِک آدمِ خاکی نے زباں دیدی ہے !

اُس کا یہ نغمہ محبّت کا حسیں نغمہ تھا
اک ہمہ گیر محبّت جو نہیں ہو سکتی
فرقہ و مذہب و ملّت کی حدوں میں محصور
جلوہ گر ہے یہ ہر اِک شے میں' ہر اِک ذرّے میں
اِس کی طاقت نہیں محتاجِ سنان و شمشیر
آ نہیں سکتا زوال اس کی شہنشاہی کو !

مَیں نے دیکھے ہیں بلکتے ہوئے غمگیں چہرے
سُن کے یہ نغمہ جو ناگاہ چمک اُٹھتے ہیں'
مَیں نے دیکھا ہے گھسٹتے ہوئے اِنسانوں کو
شہر کی گو کچیّ' پُر پیچ گذر گاہوں پہ
جن کو یہ مژدۂ امید دیا کرتا ہے
میں نے دیکھی ہیں سیہ خانۂ غم میں محبوس
عورتیں' لاتا ہے جن تک یہ مسرّت کی کرن
اور ہر چند نہیں اب وہ مغنّی ہم میں
پھر بھی اِس گیت سے ہیں ساری فضائیں لبریز
گونجتے ہیں اِسی آواز سے یہ کون و مکاں
سنو' قائم ہے محبّت پہ نظامِ ہستی
اور دُنیا میں محبّت کے سوا کچھ بھی نہیں

(بہ اجازت بی۔ بی۔ سی۔ لنڈن)

سبط مطلبی

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کی یاد

ہیں زخم وہی انگور وہی رستا ہے ابھی ناسور وہی

برسات کی وہ گھنگھور گھٹائیں، جاڑوں کی تنہا راتیں
جیل کی جشی دیواریں، مایوس عزیزوں کی یادیں
اغیار کے وہ سب جور و ستم، وہ رنج و محن وہ فریادیں
اے یوم مقدس تیری قسم بھولا میں نہیں اُن یادوں کو
ہیں زخم وہی، انگور وہی، رستا ہے ابھی ناسور وہی

اور بھول سکے کوئی کیسے، وہ دردبھری بپتا ساری
کتنی جانیں بھینٹ چڑھیں؛ جب ملک نے آزادی پائی
آئی وہ کسی کی محفل میں پر ہم کو جھلک کب دکھلائی
آزادی ملی نوابوں کو راجاؤں شہزادوں کو
ہیں زخم وہی انگور وہی رستا ہے ابھی ناسور وہی

آزاد ہوئے ہیں مل مالک، آزاد ہوئے دھنوان سبھی
آزاد ہوئے سارے ٹوڈی؛ دکھیا ہیں مگر انسان سبھی
مزدور کی لوٹ ہے اتنی ہی، ہیں اسکے لئے حرمان سبھی
جب جیل وہی مقتل بھی وہی، پھر کوئی کیوں نہ جلادوں کو
ہیں زخم وہی، انگور وہی، رستا ہے ابھی ناسور وہی

اے راوی کے جل کی دھارا، ہو یاد تجھے وہ نظارا
وہ جوش سے جھنڈا لہرانا جنتا کی گرج اور جیکارا
وہ عہد، وہ پیماں، اور وہ قسم اپنا ہے ابھی وہ ہی نعرا
جب صید ابھی تک ہے جنتا تو بھولے کیوں صیادوں کو
ہیں زخم وہی، انگور وہی رستا ہے ابھی ناسور وہی

احمد ندیم قاسمی

مسافر

اونگھتی راہ میں شیشم کی خمیدہ شاخیں
جانے کس سوچ میں مبہوت، جھکی آتی ہیں
موج در موج۔ پر اسرار، گھنی تیرگیاں
اِن ہواؤں میں خلاؤں میں رچی جاتی ہیں

کوئی جگنو۔ کوئی تارہ۔ کوئی کرنوں کی رمق!
۔ کچھ نہیں ۔ کچھ بھی نہیں ۔ حشر کی تمہید ہے رات
ساتھیو، زرد و پتاور میں سمٹتے بھونرو
کچھ کہو، کچھ تو سناؤ ۔ کوئی قصہ کوئی بات

اور موٹر نے سلگتی ہوئی آنکھیں کھولیں
چاک در چاک شبِ تار کا پیراہن ہے
میرے پیکر سے اُچٹ کر مرا سایہ رینگا
اک مرا دل ہی نہیں سارا جہاں روشن ہے

روشنی ایک اُمڈتا ہوا سیلاب بنی
سَن سے احساس کے آئینے پہ کوندے لپکے
ڈولتی رہ گئیں شیشم کی خمیدہ شاخیں
نیند میں جیسے کوئی چونک کے آنکھیں جھپکے

ڈگئی شدت سے خلاؤں میں گھُلی تاریکی
اونگھتی راہ کا مبہم سا نشاں بھی نہ رہا
ساتھ چھوڑا تھا مرا جس نے تجلّی میں کبھی
وہ سہارا مری قسمت سے یہاں بھی نہ رہا

عبدالمجید بھٹی

عظمتِ آدم

ہم تمہیں قتل ہی کر دیں گے مگر آج کی رات،
مت کہو بیٹی بہو اور بہن!
سورماؤں سے ملو ان کی عظمت سمجھو،
محفلِ عیش کو ہاں اور منغّص نہ کرو،

تم تو ہو ایک حسین مشغلۂ عیش و نشاط،
آج تک دیکھی نہ تھی جس کی جھلک،
گورا گورا سا بھرا جسم گداز
جس نے ارمانوں میں اک آگ لگا رکھی ہے،
یہ نوازش نہیں کچھ کم کہ چُنا ہے ہم نے،
تمہیں اس محفلِ عشرت کو سجانے کے لئے،
دو گھڑی رنگ جمانے کے لئے
پونچھ لو آنسو بھرا لو آنکھیں،

سسکیاں بند کرو اور بلکنا چھوڑو،
اپنے واویلا سے محفل کو منغّص نہ کرو،
چھوڑ دو اپنے عزیزوں کا خیال،
جن میں ناموس پہ کٹ مرنے کی ہمت ہی نہ تھی،
بھاگ نکلے ہیں جو جینے کی تمنّا لے کر،
بھُول جاؤ کہ کبھی ان سے بھی نسبت تھی تمہیں،
لاش بچّے کی نہیں یہ تو ہے ذلّت کا نشاں،
کیسے اِنسانوں سے نسبت تھی تمہیں،
ہم نے تو رحم سے خاموش کیا ہے اس کو،
ورنہ ہم یہ بھی تو کر سکتے تھے،
ہاتھ اور پیر قلم کر کے اِسے تڑپاتے،

ایک اِک بوٹی اُڑاتے تمہیں دکھ پہنچاتے،
تم تو خوش بخت ہو آیا نہیں یوں طیش ہمیں،
یہ تو منظور نہ تھا خللِ عیش ہمیں

جام پر جام اُٹھاتی ہوئی دو ساتھ ابھی،
چھوڑ دو اب یہ تڑپ اور پھڑک،
اس طرح رُکتے بھی ہیں بڑھتے ہوئے ہاتھ کبھی:

آج کی رات فقط آج کی رات
ایک پل کا بھی تأمل ہمیں منظور نہیں،
ورنہ سنگت کو بلا لیں تمہیں کچھ دور نہیں،
سامنے چھت سے جو لٹکی ہیں تمہاری بہنیں،
چھاتیاں جن کی ہیں پیروں میں پڑی،
اور جسموں میں گُھبے ہیں بھالے
اپنے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو جھیلنے کی سزا،
یہ دہکتے ہوئے بھالے بھی ہیں انگارے بھی۔

اور رسّی کی جگہ یہ ہیں تمہاری زلفیں،

آج کی رات مگر آج کی رات،
ایک پل کا بھی تأمل ہمیں منظور نہیں،
مسکراؤ بڑھو اور جام اُٹھاؤ
شامِ غم کیسی ہے اب صبحِ مسرت بن جاؤ،
ہم تمہیں قتل ہی کر دیں گے تمہاری خاطر،
تاکہ نامرد ذلیل اور کمینے وہ عزیز،
بھاگ نکلے ہیں جو جینے کی تمنا لے کر،
دیکھ پائیں تو نہ یہ کہہ کے تمہیں شرمائیں،
اپنے ہاں بیٹی بہو کوئی نہ تھی کوئی نہ تھی،
ہاں جو اس نام کی لڑکی تھی وہ مر کھپ بھی گئی!
اور تمہارے وہ عزیز؟
اُن کی عزت بھی رہے آن بھی باقی رہ جائے،
جن کے حصے میں نہ غیرت ہے نہ موت،
ہم تمہیں قتل ہی کر دیں گے مگر آج کی رات!

انجم رومانی

قہوہ خانے میں

(۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے بعد)

یہ کیسا ماحول ہے یہاں کا!
نہ دل کو تسکیں نہ جاں کو راحت۔

یہ کیسا ماحول ہے یہاں کا!

چمکتی میزیں ہر ایک چہرے کی گرد آلودگی پہ حیران
ہو رہی ہیں
سلگتے سگرٹ سے اُٹھنے والے دھوئیں میں دو پیچ و خم
نہیں ہے
ہر اک صدا میں سسکتی سرگوشیوں کا انداز
آگیا ہے
کسی فسردہ، شکستہ پا راہرو کی صورت
ہر ایک شئے اک تھکی ہوئی سوچ میں مگن ہے
رُکے ہوئے وقت کی روانی میں بہہ رہی ہے

رُکے ہوئے وقت کی روانی سنا رہی ہے
فسانے واماندگی کے، بیچارگی کے، غم کے —

تم اپنا فسانہ کہہ رہے ہو،
مَیں اپنا افسانہ سن رہا ہوں!

قیوم نظر

ناچیز چیزیں

کتنے طوفان آئے کتنے زمانے گذرے
لیکن اِس دل کے نہاں خانے میں باقی ہیں ابھی
بعض ناچیز سی چیزوں سے لگن کے قصے

بعض ناچیز سی چیزوں میں بھی کیا ہوتا ہے
گھاس کے پتے پہ شبنم کا لرزتا قطرہ:
موسمِ گل سے خزاں میں بھی سوا ہوتا ہے

یونہی تنہائی میں جب یاد تم آجاتی ہو
اپنی بھرپور جوانی میں ڈبونے کے لئے
اَن گنت بیتے ہوئے لمحوں کو لے آتی ہو

اُن میں اک لمحہ، کوئی لمحہ چمک اٹھتا ہے
ایک مرکز پہ سمٹ آتی ہے ساری دُنیا
اندھی تاریکی میں اِک شعلہ بھڑک اٹھتا ہے

میرے پہلو میں ہو تم حسن ... رعنائی ہے
زندگی اونگھتی ہے اور سب سیر ہوا
بکھری خوشبو کے سمندر کو اٹھا لائی ہے

چاند کی کھیلتی کرنوں کے چمن میں چپ چاپ
ایک کانٹے کی طرح ایک کرن تم کو چبھی
اور تم مجھ سے اُلجھ ہی گئیں بس آپ سے آپ

ایک ناچیز سے جھونکے نے تمہیں سہلایا
جانے کس دنیا میں پہنچی ہوئی تم لوٹ آئیں
آؤ وہ جھونکا وہ لمحہ وہ کرن وہ کانٹا

وشوامتر عادل

زندگی کے دھارے پر

(ایک غنائیہ)

مانجھی (دیس سے دُور، ناؤ میں):

ہی ہو - ہی ہو - ہی ہو - ہی ہو -
ناؤ یہ جیون آشاؤں کی
کھائے جھکولے —— ڈگمگ ڈولے
ڈوب نہ جائے
آؤ —— آؤ —— زور لگاؤ -
ہی ہو - ہی ہو - ہی ہو - ہی ہو -

مانجھی کی بیوی کا پہلا خط:

او مانجھی! او جیون ناؤ کے پیارے مانجھی!
پاس نہیں تو اور یہ برف کے ٹھنڈے گالے
جیسے قدموں سے دلدل بن کر چمٹے ہیں
یہ نوکیلے پیڑ، یہ کٹیا کے رکھوالے
ایسے گھور رہے ہیں گویا بھوت کھڑے ہیں
یہ دو سمٹے سمٹے سکڑے سکڑے رستے
جانے کن کھوئے قدموں کو ڈھونڈ رہے ہیں!
کوئی نہیں کوئی بھی نہیں ہے:
ہاں —— دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ آیا تھا
اور چمکتے چاندی کے سکے لایا تھا
ان سکوں سے تیرے پیار کی یاد آتی ہے
رات مگر جب اپنا جادو پھیلاتی ہے
بالوں میں جنگل کی باس مچل جاتی ہے
گھبراتی ہوں، گھبراتی ہوں
جیتے جی ہی مر جاتی ہوں ——

مانجھی (دیس سے دور ناؤ میں):

ہی ہو، ہی ہو ری ہو، ہی ہو
چاروں اور اندھیرا چھائے
طوفانوں کا زور ڈرائے
ناؤ اکیلی ــــ اللہ بیلی
ایک کنارہ ہٹتا جائے
ایک کنارہ پاس بلائے
ہی ہو، ہی ہو، ہی ہو ہی ہو ــــ

مانجھی کی بیوی کا دوسرا خط:

او مانجھی! او جیون ناؤ کے پیارے مانجھی!
سورج کی چمکیلی کرنیں پھر دیواروں پہ چمکی ہیں
نیلی نیلی جھیل پہ ہر اک ناؤ سے لہریں کھیل رہی ہیں
لیکن ان میں اپنی تھی جو ناؤ وہ اپنی ناؤ نہیں ہے
دودھ سی گوری بطخیں بھی اب اور کے آنگن میں چہکی ہیں
ڈرتی ہوں یہ برسوں کی مٹیالی کٹیا بک جائے گی
گر کپڑے کچھ اور پھٹے تو لاج نہ کیا مجھ کو آئے گی؟
باقی سب کچھ ٹھیک ہے لیکن جانے کیوں یہ جی بھر آیا!
ہرکارہ بھی کوئی نہ پتہ تیری خیر خبر کا لایا
سوچ رہی ہوں، سوچ رہی ہوں
ہاں یاد آیا، جھیل کنارے اُس شیشوں والے بنگلے میں
دو دن سے اک تیکھی مونچھوں والے صاحب آن بسے ہیں
اُن کے پاپی دیدے جانے دور ہی دور سے کیا کہتے ہیں
گھبراتی ہوں، گھبراتی ہوں
جیتے جی ہی مر جاتی ہوں ــــ

مانجھی (دیس سے دور ناؤ میں):

ہی ہو، ہی ہو، ہی ہو، ہی ہو
کھینے والا کھیتا جائے
جا بے کنارہ پاس نہ آئے
جھلمل چمکے آس کا دیپک

ساگر ناچے، مانجھی گائے
جینے والے جی ہی لیں گے
جیون امرت پی ہی لیں گے
ہی ہو، ہی ہو۔ ہی ہو۔ ہی ہو ———

مانجھی کی بیوی کا تیسرا خط:

او مانجھی! او جیون ناؤ کے پیارے مانجھی
اپنی ہٹیالی کٹیا اب غیروں سے آباد ہوئی ہے
ننھی جورو شیشوں والے بنگلے میں اب آن بسی ہے
کھانا اچھا، پینا اچھا، رہنا اچھا، جینا اچھا
پر سیندھور بھری شرمیلی مانگ لٹوں سے روٹھ گئی ہے
ہاتھ وہی ہیں، پاؤں وہی ہیں، آنکھ وہی ہے، کان وہی ہیں
پھر کیوں میرے جیون پربت جھڑ کی ویرانی چھائی ہے
سوچ رہی ہوں، سوچ رہی ہوں
اور؟ — نہیں، کچھ اور نہیں کہنا ہے، بس اتنا کہنا تھا
تجھ کو میرا دکھ سہنا تھا، مجھ کو تیرا دکھ سہنا تھا

مانجھی (دیس سے دور، ناؤ میں):

ہی ہو، ہی ہو۔ ہی ہو، ہی ہو
دور گھٹا گھنگھور وہی ہے
طوفانوں کا زور وہی ہے
ٹوٹ گئی پتوار تو پھر کیا؟
ناؤ نہ پہنچی پار تو پھر کیا؟
آنے والی ناؤ کا رستہ
دیکھ رہا ہے لال سویرا
ایک نئے مانجھی کی خاطر
آخر چھٹ جائے گا اندھیرا
مٹتے مٹتے بننے والی
امیدوں کا شور وہی ہے
ان تھک بیں منہ زور تھپیڑے
ساگر جارُں اور وہی ہے
ہی ہو، ہی ہو، ہی ہو، ہی ہو!

شاد عارفی

عورت کا دل کِتنا؟

پہلے شہناز کے گھر ہو آؤں
پھر بتاؤں گا تجھے اے ہمدم
رات وہ جال بُنا ہے میں نے
پھنس کے رہ جائیگا آہوئے حرم

آپ کو میرا "پیامِ شرعی"
ایک دیوانے کی بڑ تھی گویا
یعنی "زر لعنت" میں "پونڈ پلاس"
اپنی جرأت پہ کئی دن رویا

•

شیطنت ابشت! یہ ہے عزم جواں
"پیش دستی" سے نہ چُوکے غالب
یاد کر برقِ ... فلاں ... اور ... فلاں
"وہ کوئی دھن ہے جو بدلے قالب"

کل بھی معذور "پسندِ خاطر"
آج ۔ مختار ہے مجبور نہیں
ابھی رستہ میں یہ سوچا میں نے
آپ سب کچھ ہیں ۔ یہ مشہور نہیں

•

تجکو "بے ۔ اے" سے نکلنا مشکل
عزم کی رٹ پہ ہے حیلہ سازی
سعیٔ پیہم کا نتیجہ معلوم
وہ جو گھوڑے نے بدی تھی بازی

ذوق اور نام کے اسباب ۔ بجا
"پُل کی تعمیر سے تالاب" تلک"
پیلا "تالاب[1] ۔ ہو یا "پل بنگش"[2]
یادگاروں کا عدو پیرِ فلک

•

[1] رام پور کا محلہ جہاں تالاب کا پتہ نہیں [2] دہلی کا محلہ جہاں پل نہیں

لاٹ - مینار - ابوالہول، ہَرم
نہ رہے یاد وہ اِنسان ہی کیا
نہ دے تاریخ گواہی جب تک
ذکر ہے! آپ پہ احسان ہی کیا

آپ کو بھی نہ بھُلا دے دُنیا
گھاس رہتی نہیں برسات کے بعد
نام اولاد سے کے پُشتوں تک؟
"اصل" اوجھل ہیں "فروعات" کے بعد

•

ساتھ ہے اُنکے مری ہمدردی
جن کو ماحول غلط ملتا ہے
طیش آتا ہے مجھے فطرت پہ
پھُول کانٹوں میں اگر کھِلتا ہے

"فلم لائن" پہ کبھی غور کیا
اُسمیں "شہرت" کی وہ رفتار... کہ آج
روشنی اپنی سبک سیری پر
سُست رَو پست قدم سر بمزاج

•

اپنے والد کی ہیں اکلوتی آپ
موت کا نام نہیں ہے گالی
وہ جو اللہ کو پیارے ہو جائیں
صاف میدان - اُفق تک خالی

تجھکو کرنا ہی پڑے گا ہمدم
میرے "اُس عزمِ جواں" کا اقرار
جو کتابوں میں نہ لے دلچسپی
جس کو اِک کھیل شکستِ پندار

•

مند گئی آنکھ تو ہر دولت مند
خاک کے ڈھیر میں تبدیل ہوا
گھاس رہتی نہیں برسات کے بعد
مقصدِ زیست نہ تکمیل ہوا

ابھی "جھاڑو پھری" "شہناز" کا تار
ڈپٹی صاحب نے پڑھا اور رو دیے
ممبئی کا کوئی زچہ خانہ
کنواریاں ہیں - اِنہیں اللہ رکھے

•

تابش دہلوی

بیوفائی

دل فروزاں ہے چراغِ تہہِ داماں کی طرح
یعنی طوفانِ حوادث میں ہوں سرگرمِ ستیز
نرم نرم آنچ میں ہر وقت جلے جاتا ہے
روشنی جس کی نہ مدھم کبھی ہوتی ہے نہ تیز
کچھ اجاگر نظر آنے لگے ہستی کے نقوش
راستے — منزلِ مقصود — فریب

زندگی میری بھٹکتی رہی — اِن راہوں میں
میری ہر شام نے کھوئے کئی نوخیز ہلال
میری راتوں سے ہوئے سینکڑوں خورشید طلوع
مُنتشر میں نے کئے ٹوٹتے تارے سے خیال
اِک نئے ماہ نئے سال نے یکسر بدلے
راستے — منزلِ مقصود — فریب

مشعلِ راہ بنی تیری محبت کی اُمنگ
خود ہی مقصودِ تمنا تھا تمنا کا گداز
شیوۂ حسن رہا خلوتِ نگاہی کی دلیل
عشق نے فاش کئے ارضِ خرابات کے راز
میں رہا گرمِ سفر — غیر معین نہ رہے
راستے — منزلِ مقصود — فریب

زندگی اپنی عناصر میں فسوں کار ہوئی
میں نے کھائے غمِ ہستی و غمِ دل کے فریب
پھر بھی دل شاد رہا — اور ہمیشہ کے لئے
زندگانی کو دئے میں نے مقابل کے فریب
میں نے ہر راہرَوِ شوق پہ روشن رکھے
راستے — منزلِ مقصود — فریب

دل چراغِ تہہِ داماں ہے مگر ڈرتا ہوں
کہیں شعلہ سے نہ میرا سرِ دامن جل جائے
اور پھر جادۂ ہستی ہو مرا آگ ہی آگ
اور پھر رُوح جلے، روح کا مسکن جل جائے
گُل کئے دیتا ہوں یہ شمع کہ اندھیر رہیں
راستے — منزلِ مقصود — فریب

قتیل شفائی

بہلاوے

یہی کفن اوڑھ لو! بدن پر سمور و سنجاب کو بھلا دو
بجھے چراغوں سے روشنی پاؤ مہر و مہتاب کو بھلا دو
جو تم نے مانگا تھا مل گیا ہے، ہر اک نئے خواب کو بھلا دو
اسی لمحہ میں جیو مرو گے لمحہ سے آگے محل نہیں ہے

یہ رہنماؤں کی تیز گامی جو ہاتھ مل مل کے رُو رہی ہے
یہ رہگذاروں کی دلفریبی جو خون کے بیج بو رہی ہے
یہ اپنی منزل جو منہ لپیٹے ہوا کے دامن میں سو رہی ہے
تمہیں بتاؤ ضمیرِ انساں انہیں سہاروں پہ جی رہا تھا؟

یہ زرد چہروں پہ ہانپتے کانپتے افق پار کے فسانے
یہ سرد آہوں میں کسمساتے ہوئے ندامت کے تازیانے
یہ گرم پیشانیوں کی آنچیں یہ نرم زلفوں کے شامیانے
افق کے اُس پار جاتے جاتے اک اور منزل پہ آ گئے ہیں

ہزار وعدہ بھی ہو تو کیا ہے بھلا کوئی یوں بہل سکا ہے؟
خلاؤں میں تیر مارنے سے کہیں بُرا وقت ٹل سکا ہے؟
نگاہ کی خود فریبیوں سے کبھی زمانہ بدل سکا ہے؟
اُفق کے اس پار جانے والو! مرے تجسس کے ہمنوا لو!

کمال احمد صدیقی

گونج

جو صدیوں سے سوئی ہوئی تھی تہِ برف، وہ زندگی جاگ اُٹھی !
وہ برفانی ساحل پگھلنے لگے،
سطح ہموار ہونے لگی،
مجمد سینۂ بحر میں سانس کی جنبشیں بھی ہویدا ہوئیں،
لہریں اُٹھنے لگیں !

اگرچہ خلا میں بلندی و پستی کا مفہوم ہی کچھ نہیں ہے
ستاروں نے فرسودہ محور کو چھوڑا !
ابھی تک تو محصور تھیں چاندنی کی دل آویزیاں آسماں تک
مگر چاند نے اپنے ہالے کو توڑا !

وہ لہریں اُٹھیں ——
چاند کو اپنی آغوش میں بھینچ لینے کی دیوانگی جاگ اُٹھی !
جنوں خیز ہنگامۂ جزر و مد میں ستاروں کی پرچھائیاں جاگ اُٹھیں !!

وہ ٹوٹا سکوتِ اُفق،
اور وفورِ خمارِ مۂ وسال سے چُور ہوتے ہوئے،
تختۂ نارجیلاں میں شب کی حسینہ کی انگڑائیاں جاگ اُٹھیں !
وہ حُسنِ تخیل کی خوابیدگی جاگ اُٹھی !
اُمیدیں ——
—— جو حُسنِ تخیل کی خوابیدگی تھیں،
—— نظاروں کی دوشیزگی بن گئیں،
اور نظاروں کی برنائیاں جاگ اُٹھیں !
تصور کی تابندگی جاگ اُٹھی !
نگاہوں کی تنہائیاں جاگ اُٹھیں !!
سحر کی فضاؤں کی رعنائیاں جاگ اُٹھیں —!!!

کیفی اعظمی

ترکِ رہنمائی

(عوام کے سامنے بورژوا رہنماؤں کا اعتراف)

تمہارے عزم پہ منزل کی پڑھ رہی تھی چھوٹ
ہمارے پیشِ نظر ایک آستانہ تھا
اسی طرف سے گزرنا تھا کاروانوں کو
جہاں پہونچ کے ہمیں آج بیٹھ جانا تھا
وہ رہبری وہ رفاقت تھی راستے کے لئے
تمہیں بھی لائے یہاں تک کہ ہم کو آنا تھا
اب آگے جتنے بھی ہیں مرحلے تمہارے ہیں!

•

خاطر غزنوی

الجھن

اپنے آپ کو دھوکہ دینے کو تو پریت سمجھتی ہے
ٹھنڈی آہیں بھر لینے کو پریت کی ریت سمجھتی ہے
کتنا بھولا ہے پروانہ، اس پر جاں دے دیتا ہے
جو اک ہلکے سے جھونکے کو اپنا میت سمجھتی ہے
میں تو اس کو ہار کہوں گا، ہار نہیں تو کیا ہے یہ؟
اپنی ہٹ پر قائم رہنے کو تو جیت سمجھتی ہے
اک وہ دنیا ہے جو گیتوں میں بھی چیخیں سنتی ہے
اک وہ دنیا ہے جو چیخوں کو بھی گیت سمجھتی ہے

میری آہیں ہو کے مجسّم کاغذ پر جم جاتی ہیں
لیکن اس کو ساری دنیا اپنا گیت سمجھتی ہے

جگر مرادآبادی

آج کل

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل — شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل
اِنسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی — اِنساں کے سائے سے بھی گریزاں ہے آج کل
دل کی جراحتوں سے کھلے ہیں چمن چمن — اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آج کل
جمہوریت کا نام ہے جمہوریّت کہاں — فسطائیت حقیقتِ عریاں ہے آج کل
کیسا خلوص کس کی محبّت کہاں کا درد — خود زندگی متاعِ گریزاں ہے آج کل
جو تھا زباں پر وہ ہوا بن کے اُڑ گیا — جو دل میں تھا حقیقتِ عریاں ہے آج کل
کانٹے کسی کے حق میں کسی کو گُل و ثمر — کیا خوب اہتمامِ گلستاں ہے آج کل
ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے اِن دنوں — ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آج کل
کہتے ہیں جس کو صورتِ آزادیٔ وطن — دراصل ایک پیکرِ ہیجاں ہے آج کل
کچھ رہبرانِ خاص جو مخلص ہیں واقعی — ان کا چراغ بھی تہِ داماں ہے آج کل

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے **جگر**
جو مصلحت کہ پیشۂ مرداں ہے آج کل

حفیظ ہوشیارپوری

کرنیں

شریکِ تہمتِ ہستی ہے الزامِ محبت بھی — مری رسوائیوں میں حسن پیدا کر دیا تو نے
قدم بڑھتے چلے جاتے ہیں سانسیں رکتی جاتی ہیں — یہ کس وادی میں مجھ کو راہ پیما کر دیا تو نے
مری قسمت میں کب تھی ابتدائے عشق کی لذت — نظر کی اور آغازِ تمنا کر دیا تو نے
کوئی تسکین کا پہلو نہیں تیری وفا میں بھی — یہ مجھ کو ہو گیا کیا آہ یہ کیا کر دیا تو نے
مری شمعِ وفا روشن ہے طوفانِ حوادث میں — محبت کو علاجِ فکرِ دنیا کر دیا تو نے

•

تری نظر کہ تغافل بھی التفات بھی ہے — پیامِ مرگ بھی ہے مژدۂ حیات بھی ہے
مرا وجود سہی ایک نقطۂ موہوم — مری نگاہ میں انجامِ کائنات بھی ہے
نمودِ زیست سے پہلے نمودِ حسن ہوئی — ترے ہی غم کا کرشمہ غمِ حیات بھی ہے

•

کوئی اس شخص کی محرومیٔ قسمت دیکھے — تم سے مل کر بھی رہی ہو جسے انساں کی تلاش

•

عشق کے درد کو بخشا گیا مفہوم نیا
اس میں شامل غمِ دل بھی غمِ ایام بھی ہے

ساحر لدھیانوی

غزل

طرب زاروں پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گذری
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گذری

زمیں نے خون اگلا، آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گذری

ہمیں یہ فکر ان کی انجمن کس حال میں ہوگی
انہیں یہ غم کہ اُن سے چھٹ کے دیوانوں پہ کیا گذری

مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گذری

یہ منظر کون سا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گذری

چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے، لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گذری

عبدالمتین عارف

غزل

غمِ محبت کی تیرہ راتوں میں چاند تاروں کو دیکھتا ہوں
خلوص شامل ہے جن کی رگ رگ میں اُن سہاروں کو دیکھتا ہوں

جنہیں خود اپنی ہی آتشِ احمریں نے پل بھر میں پھونک ڈالا
میں دُکھ بھرے دل سے اُن المناک لالہ زاروں کو دیکھتا ہوں

یہ کیسی تجدیدِ رنگ و بو ہے، یہ کیسی تکمیلِ آرزو ہے
کہ اپنے ہی خون میں نہائی ہوئی بہاروں کو دیکھتا ہوں

گلوں کے بدلے دہکتے انگارے جن پہ پیہم برس رہے ہیں
قیادتِ پُرفریب کے اُن وفا شعاروں کو دیکھتا ہوں

مری نگاہوں میں سست رو ندیاں کہو کیسے جچ سکیں گی
کہ میں ہر اک لحظہ برق رفتار آبشاروں کو دیکھتا ہوں

یہ آبلہ پائی میرے عزمِ سفر کو ہرگز نہ ڈس سکے گی
کہ دُور تک، ماورائے حدِ نگاہ خاروں کو دیکھتا ہوں

یہ منہدم شہر، اجڑے گاؤں، یہ ادھ کٹے جسم، جھلسی لاشیں
وطن کی آزادیِ حسیں کے ہیں شاہکاروں کو دیکھتا ہوں

اُلٹ کے رکھ دیں گے جو ابھی میکدہ کا نظامِ کہنہ
میں اُن خمار آشنا تہی دست بادہ خواروں کو دیکھتا ہوں

مری ہنسی کو تبسّمِ بے محل نہ کہہ دینا عارفؔ
جو سیل کی زد میں آنے والے ہیں اُن کناروں کو دیکھتا ہوں

روشن صدیقی

غزل

ہیں گذرگاہِ شب و روز فلک ہو کہ زمیں ۔ دُور تک منزلِ مقصود کے آثار نہیں

اب بتوں سے بھی ہے مایوس دلِ دیر نشیں ۔ کوئی غارت گرِ دُنیا ہے نہ غارت گرِ دیں

واعظِ شہر سے یہ نکتۂ نازک ہے نہاں ۔ دل میں ہو آگ محبت کی تو روشن ہو جبیں

مجھ کو اے دانشِ حاضر تری ہمت معلوم ۔ تو سزاوارِ گماں ہے نہ سزاوارِ یقیں

آسماں خود ہے تغافل زدۂ شیوۂ دوست ۔ ذوقِ فریاد کو رسوا نہ کریں اہلِ زمیں

یہ محبت کا دھندلکا سا بہت کافی ہے ۔ ڈھونڈ لے گا مجھے خود ہی مرا خورشیدِ مبیں

غمِ الفت میں ہے اِک عشرتِ پنہاں شامل ۔ عشق اتنا ہی ہے مسرور کہ جتنا ہے حزیں

جانِ بیتاب کو تسکین یہاں ہے نہ وہاں ۔ خوابِ مستی تری تعبیر نہ دُنیا ہے نہ دیں

مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے تری تقدیر کا راز ۔ جو ترے دل میں نہیں وہ تری قسمت میں نہیں

موت کو عشق میں کہتے تو ہیں پیغامِ وصال ۔ زندگی! اُن کے تغافل سے یہ اُمید نہیں

ہے ہر اک شعلۂ نَو، پیرہنِ سوزِ کہن ۔ ہر تغیر ہے یہاں رازِ قدامت کا امیں

میں نہ گل چیں ہوں نہ دریوزہ گرِ گلشن ہوں ۔ میرا دامن ہے مرے دل کے لہو سے رنگیں

تلخیِ مے بھی نہیں زہرِ حوادث کا علاج ۔ آج کہتا تھا یہ اِک رندِ خرابات نشیں

اِک تصوّر ہے جو کھینچے لئے جاتا ہے مجھے ۔ نہ بہت دُور ہے مجھ سے نہ بظاہر ہے قریں

خاک آلودۂ فرقت مرا دامن ہے مگر ۔ ہے یہی خاکِ محبت کے لئے نورِ جبیں

کھول آنکھیں تو ذرا جاگ تو اے کشتۂ ناز ۔ دیکھ تو کون گل افشاں ہے قریبِ بالیں

ضبط جب حد سے گذرتا ہے محبت میں روشؔ ۔ دیکھتا ہوں کہ لرزتا ہے دلِ عرشِ بریں

انجم رومانی

غزل

کاروبارِ حسرت ہو یا رودادِ عبرت ہو　　میرے ہر افسانے میں تیرا نام نمایاں ہے

میں نامحرم، تو مستور، تیرا عالم مجھ سے دور　　پھر بھی اک ہنگامۂ نورِ نظر میں رقصاں ہے

حسرت ہو، ناکامی ہو، غم ہو، بے آرامی ہو　　دل پہ سایہ افگن ہے، جانے کس کا داماں ہے

آزادِ غم آئے تھے پابندِ رم جائیں گے　　وہ بھی تیرا احساں تھا، یہ بھی تیرا احساں ہے

تیری ادھوری دنیا کا رہ رہ کر آتا ہے خیال　　ورنہ مستقبل یا حال، اپنے لئے سب یکساں ہے

شاخ شاخ پہ پتے ہیں، پھول پھول میں خوشبو ہے　　پھر بھی باغ کے دامن کا گوشہ گوشہ ویراں ہے

ہنگامہ ہو تو جانیں، کچھ شورش ہو تو مانیں　　ہونے کو تو دریا میں جو قطرہ ہے طوفاں ہے

آؤ سحر کی بات کریں، فکرِ امکانات کریں　　تاریکی کی بساط ہی کیا، یہ تو رات کی مہماں ہے

عالم پر انجم کے سوا کون نظر دوڑائے گا

انساں محوِ دنیا ہے، دنیا محوِ انساں ہے

سیف الدین سیف

غزل

بیگانۂ غم کیا تجھے افسوس نہ ہوگا
مر جائیں گے ہم کیا تجھے افسوس نہ ہوگا

ننھا سا مرے دل کا یہ کمزور سفینہ
طوفانِ الم کیا تجھے افسوس نہ ہوگا

تو لاکھ ستم گر ہے مگر مرگِ وفا کا
دنیا کو ہے غم کیا تجھے افسوس نہ ہوگا

مرتا ہے مریضِ شبِ ہجراں ترے ہوتے
کھلتا ہے بھرم کیا تجھے افسوس نہ ہوگا

تا دیر نہ اب زندگی رہ دیکھ سکے گی
آ وقت ہے کم کیا تجھے افسوس نہ ہوگا

اس پھیر میں ہم لطفِ سفر بھول گئے ہیں
اے نقشِ قدم کیا تجھے افسوس نہ ہوگا

اب تیری گلی غیر کا گھر ہو گئی ہم کو
رکتے ہیں قدم کیا تجھے افسوس نہ ہوگا

سیفؔ ان سے غمِ ہجر کی روداد نہ کہنا
وہ چشم ہو نم کیا تجھے افسوس نہ ہوگا

یوسف ظفر

غزل

کس اُمید کے ٹوٹتے ہی وہ گرمیٔ احساسات گئی
ڈوبتے تارے تُوہی بتا دے رات گئی کہ حیات گئی

دل شکنی پر غور کریں یا اس کا علاج کچھ اور کریں
آخر یوں چُپ چُپ رہنے سے کتنی دُور یہ بات گئی

اپنے دل کا جو عالم ہے — ہے اس کا کس کو غم ہے
وجہِ ہستی ایک تمنا تھی جو اُن کے سات گئی

اُن کے تغافل سے بھی خوش ہیں اُن کی نوازش پر بھی خوش
ہم ایسے متوالوں پر جو بیت گئی سو بات گئی

وقت کے ساتھ ہر ایک تغیّر کی رنگینی ختم ہوئی
اب ہم کو ایسی ہیں بہاریں جیسے یہ برسات گئی

ہم سے کہے تو کون کہے ہم کس کی آس پہ جیتے ہیں
اب تو اُن کی یاد بھی دل سے مجبورِ حالات گئی

دریا دریا کھینے والے ملاّحو یہ جانتے ہو
ڈوب کے غم کی تہہ تک بھی یہ کشتی بعض اوقات گئی

مانا تلخ غمِ ہجراں ہے اور حدیثِ حیات ظفرؔ
اب تو سو اللہ کے بندے دیکھ تو کتنی رات گئی

مختار صدیقی

غزل

آخر دل کی پرانی لگن کر کے ہی رہے گی فقیر ہمیں
ہر رُت آتے جاتے پلائے ایک ہی شے کا اسیر ہمیں

دُھوم مچائے بہار کبھی اور پات ہرے کبھی پیلے ہوں
ہر نیرنگیٔ قدرت دیکھے یکساں ہی دلگیر ہمیں

کیا کیا پکاریں سسکتی دبی ہیں لفظوں کے زندانوں میں
چُپ ہی کی تلقین کرے ہے غیرت مند ضمیر ہمیں

جن کی ہلکی گہری تلخی خون میں رچ رچ جاتی ہے
جزوِ حیات بنانے پڑے ہیں وہ اشعارِ میر ہمیں

•

عبدالحمید عدم

غزل

ہوش کا جو بھی خار تھا برگِ گلاب ہو گیا
جس پہ تیری نظر پڑی غرقِ شراب ہو گیا

دو ہی تو لفظ تھے فقط دفترِ کائنات میں
عقل سوال بن گئی عشق جواب ہو گیا

طور پہ بھی گئے تھے ہم آپ کو ڈھونڈنے مگر
کثرتِ احتیاط سے کام خراب ہو گیا

چشمِ کرم تو ایک تھی ظرف کے اختلاف سے
کوئی درست ہو گیا کوئی خراب ہو گیا

میکدۂ عدم میں ہی چل کے رہیں گے اب فقیر
میکدۂ حیات میں قحطِ شراب ہو گیا

اثر لکھنوی

غزل

شوریدہ سری آپ کا در ڈھونڈ رہی ہے
انجام ہے معلوم، مگر ڈھونڈ رہی ہے

تاثیر میں ڈوبی ہوئی جو آہِ سحر تھی
تاثیر وہ اب وقتِ سحر ڈھونڈ رہی ہے

یہ کس کے لئے آہ لبِ ایک جہاں ہے
یہ کس کو زمانے کی نظر ڈھونڈ رہی ہے

اے بیخبری ہوش کی باتیں نہیں اچھی
پہلو میں کسے پچھلے پہر ڈھونڈ رہی ہے

یہ شوق کا عالم ہے کہ ہر صبحِ تمنّا
اک شام بعنوانِ دگر ڈھونڈ رہی ہے

اے جلوۂ جاناں تری شوخی کے تصدق
دل محوِ تماشا ہے، نظر ڈھونڈ رہی ہے

میرے بھی سیہ خانے میں دم بھر کو چلا آ
میری بھی شبِ تار سحر ڈھونڈ رہی ہے

آنکھیں ہیں تو عبرت کدۂ دہر کی ہر شے
اِک دیدۂ انجام نگر ڈھونڈ رہی ہے

دُنیا عجب آئینہ ہے، آئینے میں دُنیا
خود اپنی ہی تمثال اثر ڈھونڈ رہی ہے

مضطر اکبر آبادی

ناصر کاظمی

دو غزلیں

مضطر اکبر آبادی

ہر چند تیرے غم کا نگہباں رہا ہوں میں
پھر بھی نشانۂ غمِ دوراں رہا ہوں میں

اکثر ترے بغیر ملا ہے مجھے سکوں
اکثر ترے حضور پریشاں رہا ہوں میں

دامن میں تیرے درد کی دولت سمیٹ کر
دُنیا کی نعمتوں سے گریزاں رہا ہوں میں

آلامِ روزگار سبھی ہیں مرے رفیق
آلامِ روزگار کا خواہاں رہا ہوں میں

پروردۂ چمن ہوں مگر اس کے باوجود
محرومِ التفاتِ بہاراں رہا ہوں میں

دنیا میں جتنے تیرے اطاعت گزار ہیں
اُن سب میں ابتدا سے نمایاں رہا ہوں میں

مضطرؔ یہ مختصر سی مری داستان ہے
برسوں امینِ جلوۂ جاناں رہا ہوں میں

ناصر کاظمی

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

اے دل کسے نصیب یہ توفیقِ اضطراب!
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی

تیرے کرم سے اے المِ حسن آفریں
خود بن گیا ہوں دوست کی خلوت کبھی کبھی

جوشِ جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ
اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی

تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گذری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمہارا خیال تھا
یوں بھی گذر گئی شبِ فرقت کبھی کبھی

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی۔

لاہور ریڈیو سٹیشن

حافظ لدھیانوی

غزل

ردائے گل سے پھر آئی ہے بوئے یار مجھے
یہیں ملے گا مرا ماہِ نو بہار مجھے

ہے پھول پھول پریشاں، کلی کلی حیراں
خزاں کے رنگ میں بخشی گئی بہار مجھے

نہ یہ چمن ہو نہ یہ پھول اور نہ یہ کلیاں
اگر ہو نظمِ چمن پہ کچھ اختیار مجھے

وفا کے بعد ہے طرزِ وفا پہ حیرانی
نشہ نہیں تھا باندازۂ خمار مجھے

وہ حسن میرے تحیّر میں ہو گیا تحلیل
رکھا تھا جس نے شب و روز بیقرار مجھے

سبک ہوا ہوں چمن میں کہ اب گزرتا ہے
خرامِ بادِ بہاری نظر پہ بار مجھے

میں سوچتا ہوں کہ صحرا میں کیوں کا حافظ
اٹھا کے لائی تھی رنگینیٔ بہار مجھے

مقبول حسین احمدپوری

گیت

پریمی ٹھنڈی سانس بھری کیوں تھرائی سی آہ لئے؟!

کون سُنے گا مَونؔ کہانی
کہتی ہے جو آہ کی بانیؔ
اُس کو کان کہاں پا سکتے
دل کی لگی دل ہی نے جانی

لیکن دل تو ہوئے ویران نہیں کسی میں گہرائیاں
کہنے کو دُنیا کہتی ہے دل ہے دل ہے راہ لئے
پریمی ٹھنڈی سانس بھری کیوں تھرائی سی آہ لئے؟

یہ آنکھوں کا کھارا پانی
کھول رہا دل کی حیرانی
دیکھ سکیں جسکو سب آنکھیں
اب نہ رہی ایسی نورانی

مٹ گئی آنکھوں سے پہچان آنکھیں بھی ہیں اب ویران
بہ گئیں آشائیں آنسو میں، من کی منوہر چاہ لئے
پریمی ٹھنڈی سانس بھری کیوں تھرائی سی آہ لئے؟

لہ مَون۔ خاموش گہ زبان



★ عبد الحمید عدم

★ ساحر لدھیانوی

★ عبدالمتین عارف



فکر تونسوی







قتیل شفائی

ہمارے شاعر



حافظ ا

غلام حسین



طفیل احمد



ممتاز مفتی



عبادت بریلوی

★

ہمارے ادیب

افسانے اور خاکے

کرشن چندر

احمد عباس

سعادت حسن منٹو

اپندر ناتھ اشک

احمد ندیم قاسمی

مدھوسودن

مہندر ناتھ

اے حمید

احمد بشیر رومانی

ہمارے ساتھی

مدھوسودن

مدھوسودن ہمارے پرانے ساتھی ہیں

ادبی محفل میں وہ ایسی شمع ہیں جو اپنی روپہلی روشنی میں مگن ٹمٹماتے جاتی ہے۔ بھڑک کر نہیں جلتی۔ انہیں لوگوں کی نگاہوں کو چکا چوند کرنے کا شوق نہیں۔ ان کی شخصیت اور تحریر میں بھڑک اور دکھاوے کا عنصر نہیں۔ بلکہ اس کی جگہ خلوص سادگی اور حقیقت پسندی کی جھلک غیاں ہے۔

ان کا موضوع نفسیات ہے اور ان کا ہر مطالعہ وسعت نگاہ اور ہمدردی کا حامل ہے۔

مدھوسودن مدت سے بمبئی میں فلمی کام کر رہے ہیں۔

احمد بشیر (رومانی)

احمد بشیر کو ہماری محفل میں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی لیکن ان کی شخصیت اور تحریر میں اس قدر خلوص بے ساختگی اور بے تکلفی ہے کہ ہم محسوس کرنے لگے ہیں گویا وہ مدتوں سے ہمارے ساتھی ہیں۔

وہ اپنے ساتھ شگفتہ انداز تحریر ہی نہیں بلکہ انوکھا موضوع بھی لائے ہیں — کیریکٹر اسکیچ، جس کی ادب میں کمی تھی۔

ان کا تجزیہ بے لاگ اور بے جھجک ہوتا ہے اور انداز میں لطیف مزاح کی چاشنی۔ آج کل وہ امروز لاہور میں اسٹاف رپورٹر کا کام کر رہے ہیں!

کرشن چندر

امرتسر

(آزادی سے پہلے)

جلیانوالا باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ اس مجمع میں ہندو بھی تھے، سکھ بھی اور مسلمان بھی۔ ہندو مسلمانوں سے، اور مسلمان سکھوں سے الگ صاف پہچانے جا سکتے تھے۔ صورتیں الگ تھیں، مزاج الگ تھے، تہذیبیں الگ تھیں، مذہب الگ تھے، لیکن آج یہ سب لوگ جلیانوالہ باغ میں ایک ہی دل لے کے آئے تھے۔ اس دل میں ایک ہی جذبہ تھا، اور اس جذبے کی تیز اور تند آنچ نے مختلف تمدن، اودار اور سماج ایک کر دئے تھے۔ دلوں میں انقلاب کی ایسی پیہم رو تھی کہ جس نے آس پاس کے ماحول کو بھی برقا دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس شہر کے بازاروں کا ہر پتھر اور اس کے مکانوں کی ہر ایک اینٹ اس خاموش جذبے کی گونج سے آشنا ہے۔ اور اُس لرزتی ہوئی دھڑکن سے نغمہ ریز ہے جو ہر لمحے کے ساتھ گویا کہتی جاتی ہے آزادی!

آزادی!! آزادی!!!

جلیانوالہ باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا، اور سبھی نہتے تھے۔ اور سب ہی آزادی کے پرستار تھے۔ ہاتوں میں نہ تو لاٹھیاں تھیں اور نہ ریوالور، نہ برین گن نہ مشین گن۔ ہینڈ گرینیڈ نہ تھے۔ دیسی یا ولایتی ساخت کے بم بھی نہ تھے۔ مگر پاس کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی نگاہوں کی گرمی بھونچال کے قیامت خیز لاوے کی طغیانیوں کا پتہ دیتی تھی۔ سامراجی فوجوں کے پاس لوہے کے ہتھیار تھے، یہاں دل فولاد کے بن گئے تھے۔ اور روحوں میں ایسی پاکیزگی سما گئی تھی جو صرف اعلیٰ اور ارفع قربانی سے حاصل ہوتی ہے۔ پنجاب کے پانچوں دریاؤں کا پانی اور ان کے رومان اور انکا سچا عشق اور ان کی تاریخی بہادری آج ہر فرد بشر بچے بوڑھے کے تمتمائے ہوئے رخساروں میں تھی۔ ایک ایسا اُجلا اُجلا غرور جو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب قوم جوان ہو جاتی ہے۔ اور سویا ہوا ملک بیدار ہو جاتا ہے۔ جنہوں نے امرتسر کے یہ تیور دیکھے ہیں وہ ان گوروؤں کے اس مقدس شہر کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔

جلیانوالہ باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ اور گولی بھی ہزاروں پر چلی۔ تینوں طرف سے راستہ بند تھا، اور چوتھی طرف ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ جو زندگی سے موت کو جاتا تھا، ہزاروں نے خوشی خوشی جام شہادت پیا، آزادی کی خاطر۔ ہزاروں مسلمانوں اور سکھوں نے مل کر اپنے سینوں کے خزانے لٹا دیے تھے۔ اور پانچ دریاؤں کی سرزمین میں ایک چھٹے دریا کا اضافہ کیا تھا۔ یہ ان کے ملے جلے خون کا دریا تھا۔ یہ ان کے لہو کی طوفانی ندی تھی جو اپنی امڈتی ہوئی لہروں کو لئے ہوئے اٹھی اور سامراجی قوتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گئی۔ پنجاب نے سارے ملک کے لئے اپنے خون کی قربانی دی تھی، اور اس وسیع آسمان تلے کسی نے آج تک مختلف تہذیبوں، اور مختلف مزاجوں کو ایک ہی جذبے کی خاطر یوں مدغم ہوتے نہ دیکھا تھا۔ جذبہ شہیدوں کے خون سے استوار ہو گیا۔ حسن، رعنائی اور تخلیق کی چمک سے جگمگا اٹھا۔

آزادی! آزادی!! آزادی!!!

۲

صدیق کٹڑہ فتح خاں میں رہتا تھا۔ کٹڑہ فتح خاں میں ادم پرکاش بھی رہتا تھا جو امرتسر کے ایک مشہور بیوپاری کا بیٹا تھا۔ صدیق اسے اور ادم پرکاش کو بچپن سے جانتا تھا۔ وہ دونوں دوست نہ تھے، کیونکہ صدیق کا باپ کچا چمڑا بیچتا تھا اور غریب تھا، اور ادم پرکاش کا باپ بینکر تھا، اور امیر تھا۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ دونوں ہمسائے تھے۔ اور آج دونوں جلیانوالہ باغ میں اکٹھے ہو کر ایک ہی جگہ پر اپنے رہنماؤں کے خیالات اور ان کے تاثرات کو اپنے دل میں جگہ دے رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتے اور یوں مسکرا دیتے جیسے وہ سدا سے بچپن کے ساتھی ہیں، اور ایک دوسرے کا بھید جانتے ہیں۔ دل کی بات نگاہوں میں نکھر آتی تھی۔ آزادی! آزادی!! آزادی!!!

اور جب گولی چلی تو پہلے ادم پرکاش کو لگی، کندھے کے پاس، اور وہ زمین پر گر گیا۔ صدیق اسے دیکھنے کے لئے جھکا تو گولی اس کی ٹانگ کو چھیدتی ہوئی پار ہو گئی۔ پھر دوسری گولی آئی، پھر تیسری، پھر جیسے بارش ہوتی ہے۔ بس اسی طرح گولیاں برسنے لگیں، اور خون بہنے لگا۔ اور سکھوں کا خون مسلمانوں میں اور مسلمانوں کا خون ہندوؤں میں مدغم ہوتا گیا۔ ایک ہی گولی تھی، ایک ہی موت تھی، ایک ہی نگاہ تھی جو سب دلوں کو چھیدتی چلی جا رہی تھی۔ صدیق ادم پرکاش پر اور بھی جھک گیا۔ اس نے اپنے جسم کو ادم پرکاش کے لئے ڈھال بنا لیا۔ اور پھر وہ اور ادم پرکاش دونوں گولیوں کی بارش میں گھٹنوں کے بل گھسٹتے گھسٹتے اس دیوار کے پاس پہنچے جو اتنی اونچی نہ تھی کہ اسے کوئی پھلانگ نہ سکتا۔ لیکن اتنی اونچی ضرور تھی کہ اسے پھلانگتے ہوئے کسی سپاہی کی گولی کا خطرناک نشانہ بننا زیادہ مشکل نہ تھا۔

صدیق نے اپنے آپ کو دیوار کے ساتھ لگا دیا اور جانور کی طرح چاروں پنجے زمین پر ٹیک کر کہا: "ادم پرکاش جی خدا کا نام لے کر دیوار پھلانگ جاؤ۔"

گولیاں برس رہی تھیں۔

پرکاش نے بڑی مشکل سے صدیق کی پیٹھ کا سہارا لیا اور پھر اونچا ہو کر اس نے دیوار پھلانگنے کی کوشش کی۔

ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی۔

"جلدی کرو" صدیق نے نیچے سے کہا۔

لیکن اس سے پہلے پرکاش دوسری طرف جا چکا تھا۔ صدیق نے اسی طرح اکڑوں رہ کر ادھر ادھر دیکھا۔ اور پھر یک لخت سیدھے ہو کر جو جست لگائی تو دیوار کی دوسری طرف۔ لیکن دوسری طرف جاتے جاتے سنسناتی ہوئی گولی اس کی دوسری ٹانگ کے پار بھی ہو گئی۔

صدیق پرکاش کے اوپر جا گرا۔ پھر جلدی سے الگ ہو کر اسے اٹھانے لگا۔

"تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی پرکاش؟"

لیکن پرکاش مرا پڑا تھا۔ اس کے ہات میں ہیرے کی انگوٹھی ابھی زندہ تھی۔ اس کی جیب میں دو ہزار کے نوٹ ابھی کلبلا رہے تھے۔ اس کا گرم خون ابھی تک زمین کو سیراب کئے جا رہا تھا۔ حرکت تھی، زندگی تھی، اضطراب تھا، لیکن وہ خود مر چکا تھا۔ صدیق نے اسے اٹھایا اور اسے گھر لے چلا۔ اس کی دونوں ٹانگوں میں درد شدت کا تھا۔ لہو بہہ رہا تھا۔ ہیرے کی انگوٹھی نے بہت کچھ کہا سنا نوٹوں نے بہتیرا سمجھایا۔ وہ تہذیب جو مختلف تھی، وہ مذہب جو الگ تھا، وہ سماج جو بیگانہ تھا اسنے طنز و تشنیع سے بھی کام لیا

لیکن صدیق نے کسی کی نہ سُنی۔ اس نے اپنے بہتے ہوئے لہو اور اپنی نکلتی ہوئی زندگی کی فریاد بھی نہ سُنی۔ اور اپنے رستے پر چلتا گیا۔ یہ رستہ بالکل نیا تھا۔ گو کٹڑہ فتح خاں ہی کو جاتا تھا۔ آج فرشتے اس کے ہمراہ تھے گو وہ ایک کافر کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے تھا۔ آج اس کی روح اس قدر امیر تھی کہ کٹڑہ فتح خاں پہنچ کر اس نے سب سے کہا "یہ لو ہیرے کی انگوٹھی، اور یہ لو دو ہزار کے نوٹ، اور یہ ہے شہید کی لاش۔" اتنا کہہ کر صدیق بھی وہیں گر گیا۔ اور شہر والوں نے دونوں کا جنازہ اس دھوم دھام سے اٹھایا گویا وہ سگے بھائی تھے۔

۳

ابھی کرفیو نہ ہوا تھا۔ کوچہ رامداس کی دو مسلمان عورتیں، ایک سکھ عورت اور ایک ہندو عورت سبزی خریدنے آئیں وہ مقدس گوردوارے کے سامنے سے گذریں، ہر ایک نے تعظیم دی۔ اور پھر منہ پھیر کر سبزی خریدنے میں مصروف ہوگئیں۔ انہیں بہت جلد لوٹنا تھا۔ کرفیو ہونے والا تھا اور فضا میں شہیدوں کے خون کی پکار گونج رہی تھی۔ پھر بھی باتیں کرتے اور سودا خریدتے انہیں دیر ہوگئی۔ اور جب وہ واپس چلنے لگیں تو کرفیو میں چند منٹ ہی باقی تھے۔

بیگم نے کہا: "آؤ اس گلی سے نکل چلیں وقت سے پہنچ جائیں گی۔"

پارو نے کہا: "پر وہاں تو پہرہ ہے، گوروں کا۔"

شام کور بولی: "اور گوروں کا کوئی بھروسہ نہیں۔"

زینب نے کہا: "وہ عورتوں کو کچھ نہ کہیں گے۔ ہم گھونگھٹ کاڑھے نکل جائیں گی جلدی سے۔ چلو۔"

وہ پانچوں دوسری گلی سے ہولیں۔ فوجیوں نے کہا "اس جھنڈے کو سلام کرو، یہ یونین جیک ہے۔"

عورتوں نے گھبرا کر اور بوکھلا کر سلام کیا۔

"اب یہاں سے وہاں تک" — فوجی نے گلی کی لمبائی بتاتے ہوئے کہا— "گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی فی الفور یہاں سے نکل جاؤ۔"

"گھٹنوں کے بل؟ یہ تو ہم سے نہ ہوگا۔" زینب نے چمک کر کہا۔

"او، جھک کر چلو، سرکار کا حکم ہے، گھٹنوں کے بل گھسٹ کر چلو۔"

"ہم تو یوں جائیں گے۔" شام کور نے تن کر کہا۔ "دیکھیں کون روکتا ہے ہمیں۔" یہ کہہ کر وہ چلی۔

"ٹھیرو ٹھیرو۔" پارو نے ڈر کر کہا۔

شام کور سیدھی جا رہی تھی۔

ٹھائیں۔

شام کور گر گئی۔

زینب اور بیگم نے ایک دوسری کی طرف دیکھا، اور پھر وہ دونوں گھٹنوں کے بل گر گئیں۔ گورا خوش ہو گیا۔ اس نے سمجھا سرکار کا حکم بجا لا رہی ہیں۔

زینب اور بیگم نے گھٹنوں کے بل گر کر اپنے دونوں ہات اوپر اٹھائے۔ اور چند لمحوں کے سکوت کے بعد وہ دونوں سیدھی کھڑی ہوگئیں اور گلی کو پار کرنے لگیں۔

گورا ہکّا بکّا رہ گیا۔ پھر غصے سے اس کے گال تمتما اٹھے اور اس نے رائفل سیدھی کی۔

ٹھاٹھیں تھا میں۔

پارو رونے لگی۔ اب مجھے بھی مرنا ہوگا۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ میرے پتی دیو! میرے بچو! میری ماں جی! میرے پتا جی! میرے ویرو مجھے شما کرنا۔ آج مجھے بھی مرنا ہے۔ میں مرنا نہیں چاہتی پر مجھے مرنا ہوگا! میں اپنی بہنوں کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔

پارو روتے روتے آگے بڑھی۔

گورے نے اسے نرمی سے سمجھایا: "رونے کی ضرورت نہیں۔ سرکار کا حکم مانو، اور اس گلی سے یوں گھٹنوں کے بل گر کر چلتی جاؤ۔ پھر تمہیں کوئی کچھ نہ کہے گا۔" گورے نے خود گھٹنے پر گر کر اسے چلنے کا انداز سمجھایا۔

پارو روتے روتے گورے کے قریب آئی۔ گورا اب سیدھا تن کر کھڑا تھا۔

پارو نے زور سے اس کے منہ پر تھوک دیا اور پھر پلٹ کر گلی کو پار کرنے لگی۔ وہ گلی کے بیچوں بیچ سیدھی تن کر چلی جا رہی تھی، اور گورا اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنی بندوق سیدھی کی، اور پارو جو اپنی سہیلیوں میں سب سے زیادہ کمزور اور بزدل تھی سب سے آگے جا کر مر گئی۔

پارو، زینب، شام کور، بیگم۔

گھر کی عورتیں، پردہ دار خواتین، عفت مآب بیبیاں، اپنے سینوں میں اپنے خاوند کا پیار اور اپنے بچوں کی ممتا کا دودھ لئے ظلم کی اندھیری گلی سے گذر گئیں۔ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی ہوگئے، لیکن ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ اس وقت کسی کی محبت نے پکارا ہوگا۔ کسی کے ننھے بازوؤں کا بلاوا آیا ہوگا۔ کسی کی سہانی مسکراہٹ دکھائی دی ہوگی، لیکن ان کی روحوں نے کہا — نہیں! آج تمہیں جھکنا نہیں ہے۔ آج صدیوں کے بعد وہ لمحہ آیا ہے جب سارا ہندوستان جاگ اٹھا ہے۔ اور سیدھا تن کر اس گلی سے گذر رہا ہے سر اٹھائے آگے بڑھ رہا ہے۔ زینب، بیگم، پارو، شام کور...... کس نے کہا اس ملک سے سیتا مر گئی؟ کس نے کہا اب اس دیس میں ستی ساوتری پیدا نہیں ہوتی؟..... آج اس گلی کا ذرہ ذرہ کسی کے مقدس لہو سے روشن ہے۔ شام کور، زینب، پارو، بیگم...... آج تم خود اس گلی سے سر او نچا کر کے نہیں گذر رہی ہو! آج تمہارا دیس فخر سے سر اٹھائے اس گلی سے گذر رہا ہے۔ آج آزادی کا اونچا جھنڈا اس گلی سے گذر رہا ہے۔ آج تمہارے دیس، تمہاری تہذیب، تمہارے مذہب کی قابلِ احترام روایتیں زندہ ہوگئی ہیں، آج انسانیت کا سر غرور سے بلند ہے۔ تمہاری روحوں پر ہزاروں سلام!......

امرتسر

(آزادی کے بعد)

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔ پاکستان آزاد ہوا۔ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان بھر میں جشنِ آزادی منایا جا رہا تھا اور کراچی میں آزاد پاکستان کے فرحناک نعرے بلند ہو رہے تھے۔ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور جل رہا تھا اور امرتسر میں ہندو مسلم سکھ عوام فرقہ وارانہ فساد کی ہولناک لپیٹ میں آچکے تھے۔ کیونکہ کسی نے پنجاب کے عوام سے نہیں پوچھا تھا کہ تم بٹوارہ چاہتے ہو یا مل جل کے رہنا، جیسا کہ تم صدیوں سے رہتے چلے آئے ہو۔ صدیوں پہلے تغلق العنانی کا دور دورہ تھا۔ اور کسی نے عوام سے کبھی کچھ نہ پوچھا تھا پھر انگریزوں نے اپنے سامراج کی بنیاد ڈالی۔ اور انہوں نے پنجاب سے سپاہی اور گھوڑے اپنی فوج میں بھرتی کئے اور اس کے عوض پنجاب کو نہریں اور پنشنیں عطا فرمائیں۔ لیکن انہوں نے بھی عوام سے یہ سب کچھ پوچھ کے تھوڑی کیا تھا۔ اس کے بعد سیاسی شعور آیا۔ اور سیاسی شعور کے ساتھ جمہوریت آئی۔ اور جمہوریت کے ساتھ جمہوری سیاستداں آئے، اور سیاسی جماعتیں بنیں

لیکن فیصلہ کرتے وقت انہوں نے بھی پنجابی عوام سے کچھ نہ پوچھا۔ ایک نقشہ سامنے رکھ کے پنجاب کی سرزمین کے نوک قلم سے دو ٹکڑے کر دئے۔ فیصلہ کرنیوالے سیاستداں گجراتی تھے، کشمیری تھے، اس لئے پنجاب کے نقشے کو سامنے رکھ کے اس پر قلم سے ایک لکیر، ایک حد فاصل قائم کر دینا ان کے لئے زیادہ مشکل نہ تھا۔ نقشہ ایک نہایت ہی معمولی سی چیز ہے۔ آٹھ آنے دو پیسے میں پنجاب کا نقشہ ملتا ہے، اس پر لکیر کھینچ دینا بھی آسان ہے۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا، ایک روشنائی کی لکیر، وہ کیسے پنجاب کے دکھ کو سمجھ سکتے تھے اس لکیر کی ماہیت کو جو اس نقشے کو نہیں، پنجاب کے دل کو چیرتی چلی جا رہی تھی؟ پنجاب کے تین مذہب تھے لیکن اس کا دل ایک تھا اس کا لباس ایک تھا، اس کی زبان ایک تھی اس کے گیت ایک تھے اس کے کھیت ایک تھے، اور اس کے کھیتوں کی رومانی فضا اور اس کے کسانوں کے پنچائتی ولولے ایک تھے۔ پنجاب میں وہ سب باتیں موجود تھیں جو ایک تہذیب، ایک دیس ایک قومیت کے وجود کا احاطہ کرتی ہیں۔ پھر کس لئے اس کے گلے پر چھری چلائی گئی؟ کس لئے اس کی رگوں میں سالہا سال کی نفرت کا بیج بو دیا گیا؟ کس لئے اس کے کھلیانوں کو شیطنت اور ظلم اور مذہبی بہیمیت کی آگ سے جلایا گیا؟ "ہمیں معلوم نہ تھا۔ ہمیں بڑا افسوس ہے!" "ہم اس ظلم کی مذمت کرتے ہیں" "ظلم اور نفرت اور مذہبی جنون کو بھڑکانے والے" پنجاب کی وحدت کو مٹا دینے والے آج مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہیں۔ اور آج پنجاب کے بیٹے دلی کی گلیوں میں اور کراچی کے بازاروں میں بھیک مانگ رہے ہیں۔ اور ان کی عورتوں کی عصمت لٹ چکی ہے، اور ان کے کھیت ویران پڑے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے آج تک پنجابی پناہ گزینوں کے لئے بیس کروڑ روپیہ صرف کیا ہے یعنی ایک کروڑ پناہ گزینوں کے لئے بیس کروڑ روپے، فی کس بیس روپے۔ بڑا احسان کیا ہے ہماری سات پشتوں پر۔ ارے ہم تو مہینے میں بیس روپے کی لسی ہی پی جاتے تھے۔ اور آج تم ان لوگوں کو خیرات دینے چلے ہو جو کل تک ہندوستان کے سب کسانوں میں سب سے زیادہ خوشحال تھے۔ جمہوریت کے پرستارو، ذرا پنجاب کے کسانوں سے، اس کے طالب علموں سے، اس کے کھیت کے مزدوروں سے، اس کے دوکانداروں سے، اس کی ماؤں، بیٹیوں، بہوؤں ہی سے پوچھ تو لیا ہوتا کہ اس نقشے پر جو کالی لکیر لگ رہی ہے اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ مگر وہاں دکھ کس کو ہوتا کسی کا اپنا دیس ہوتا، کسی کا اپنا وطن ہوتا، کسی کی اپنی زبان ہوتی، کسی کے اپنے کھیت ہوتے تو وہ سمجھ سکتا کہ یہ غلطی کیا ہے اور اس کا خمیازہ کسے بھگتنا پڑیگا۔ یہ دکھ وہی سمجھ سکتا ہے جو ہیر کو رانجھے سے جدا ہوتے ہوئے دیکھے، جو سوہنی کو مہینوال کے فراق میں تڑپتے دیکھے، جس نے پنجاب کے کھیتوں میں اپنے ہاتھوں سے گیہوں کی سنہری بالیاں کاٹی ہوں اور اس کے کپاس کے پھولوں کے ننھے چاندوں کو جھکتا ہوا دیکھا ہو۔ یہ سیاستداں کیا سمجھ سکتے ہیں اس دکھ کو۔ جمہوریت کے سیاستداں تھے نا۔

خیر یہ رونا مرنا ہوتا رہتا ہے۔ انسان کو ابھی انسان ہونے میں بہت دیر ہے۔ اور پھر ایک سمجھدار افسانہ نگار کو ان باتوں سے کیا۔ اسے زندگی سے، سیاست سے، علم و فن سے، سائنس سے، تاریخ و فلسفے سے کیا لگاؤ۔ اسے کیا غرض کہ پنجاب مرتا ہے یا جیتا ہے، عورتوں کی عصمتیں برباد ہوتی ہیں یا محفوظ رہتی ہیں، بچوں کے گلے پر چھری پھیری جاتی ہے یا ان پر مہربان ہونٹوں کے بوسے ثبت ہوتے ہیں۔ اسے ان سب باتوں سے الگ ہو کر اپنی کہانی سنانی چاہئے۔ اپنی چھوٹی موٹی کہانی جو لوگوں کے دلوں کو خوش کر سکے۔ یہ بڑے بول اسے زیب نہیں دیتے۔

ٹھیک تو کہتے ہیں آپ۔ اس لئے اب امرتسر کی کہانی سنئے۔ اس شہر کی کہانی جہاں جلیانوالہ باغ ہے جہاں شمالی ہند کی سب سے بڑی تجارتی منڈی ہے، جہاں سکھوں کا سب سے بڑا مقدس ترین گوردوارہ ہے۔ جہاں کی قومی تحریکوں میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لاہور اگر فرقہ داری کا قلعہ ہے تو امرتسر قومیت کا

کامرکز ہے۔ اسی قومیت کے بڑے مرکز کی داستان سنئیے۔

پندرہ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو امرتسر آزاد ہوا۔ پڑوس میں لاہور جل رہا تھا، مگر امرتسر آزاد تھا اور اس کے مکانوں، دوکانوں، بازاروں پر ترنگے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ امرتسر کے قوم پرست مسلمان اس جشنِ آزادی میں سب سے آگے تھے۔ کیونکہ وہ آزادی کی تحریک میں سب سے آگے رہے تھے۔ یہ امرتسر اکالی تحریک ہی کا امرتسر نہ تھا۔ یہ احراری تحریک کا بھی امرتسر تھا۔ یہ ڈاکٹر ستیہ پال کا امرتسر نہ تھا، یہ کچلو اور حسام الدین کا امرتسر تھا۔ اور آج امرتسر آزاد تھا اور اس کی قوم پرور فضا میں آزاد ہندوستان کے نعرے گونج رہے تھے۔ اور امرتسر کے مسلمان اور ہندو اور سکھ یکجا خوش تھے۔ جلیانوالہ باغ کے شہید زندہ ہو گئے تھے۔

شام کو جب سٹیشن پر چراغاں ہوا تو آزاد ہندوستان اور آزاد پاکستان سے دو سپیشل گاڑیاں آئیں۔ پاکستان سے آنے والی گاڑی میں ہندو اور سکھ لوگ تھے۔ ہندوستان سے جانے والی گاڑی میں مسلمان تھے۔ تین چار ہزار افراد اس گاڑی میں اور اتنے ہی دوسری گاڑی میں۔ کل چھ سات ہزار افراد میں بمشکل دو ہزار زندہ ہوں گے۔ باقی لوگ مرے پڑے تھے۔ اور ان کی لاشیں سر بریدہ تھیں، اور ان کے سر نیزوں پر اگا کے گاڑیوں کی کھڑکیوں میں سجائے گئے تھے۔ ہندوستان سپیشل پر لکھا تھا ہندی میں "تلوار چلانا ہندوستان سے سیکھو"۔ پاکستان سپیشل پر اردو میں موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا "انتقام لینا پاکستان سے سیکھو"۔ اس پر ہندوؤں اور سکھوں کو بڑا طیش آیا۔ ظالموں نے ہمارے بھائیوں کے ساتھ کتنا برا سلوک کیا ہے۔ ہائے یہ ہمارے ہندو اور سکھ پناہ گزین۔ اور واقعی ان کی حالت بھی قابلِ رحم تھی۔ انہیں فوراً گاڑی سے نکال کر پناہ گزینوں کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ اور سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی گاڑی پر دھاوا بول دیا۔ یعنی اگر نہتے نیم مردہ مہاجرین پر حملہ کرنے کو "دھاوا" کہہ سکتے ہیں تو واقعی یہ دھاوا تھا۔ آدھے سے زیادہ لوگ مار ڈالے گئے۔ جب کہیں جا کر ملٹری نے "حالات" پر قابو پا لیا۔

گاڑی میں ایک بڑھیا عورت بیٹھی تھی۔ اور اس کی گود میں اس کا ننھا پوتا تھا۔ راستے میں اس کا بیٹا مارا گیا تھا۔ اس کی بہو کو جاٹ اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس کے خاوند کو لوگوں نے بھالوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ اب وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کے لبوں پر آہیں نہ تھیں، اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ اس کے دل میں دعا نہ تھی، اس کے ایمان میں قوت نہ تھی۔ وہ پتھر کا بت بنی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ جیسے وہ کچھ سوچ نہ سکتی تھی، کچھ دیکھ نہ سکتی تھی، کچھ محسوس نہ کر سکتی تھی۔

بچے نے کہا "دادی اماں پانی"۔

دادی چپ رہی۔

بچہ چیخا "دادی اماں پانی"۔

دادی نے کہا "بیٹا پاکستان آئے گا تو پانی ملے گا"۔

بچے نے کہا "دادی اماں کیا ہندوستان میں پانی نہیں ہے؟"

دادی نے کہا "بیٹا اب ہمارے لئے اس دیس میں پانی نہیں ہے"۔

بچے نے کہا "کیوں نہیں ہے؟ مجھے پیاس لگی ہے۔ میں تو پانی پیوں گا۔ پانی، پانی، پانی، دادی اماں پانی پیونگا، میں پانی پیونگا۔"

"پانی پیو گے؟" ایک اکالی رضاکار وہاں سے گذر رہا تھا۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے بچے کی طرف دیکھ کے کہا "پانی پیو گے نا؟"

"ہاں"۔ بچے نے سر ہلایا۔

"نہیں نہیں" دادی نے خوف زدہ ہو کر کہا "یہ کچھ نہیں کہتا آپ کو، یہ کچھ نہیں مانگتا آپ سے۔ خدا کے لئے سردار صاحب

اسے چھوڑ دیجئے۔ میرے پاس اب اور کچھ نہیں ہے"۔

اکالی رضاکار ہنسا۔ اس نے پائیدان سے رستے ہوئے خون کو اپنی اوک میں جمع کیا اور اسے بچے کے قریب لیجا کے کہنے لگا "لو پیاس لگی ہے تو یہ پی لو۔ بڑا اچھا خون ہے۔ مسلمانوں کا خون ہے"۔

دادی پیچھے ہٹ گئی۔ بچہ رونے لگا۔ دادی نے بچے کو اپنے میلے دوپٹے سے ڈھک لیا۔ اور اکالی رضاکار ہنستا ہوا آگے چلا گیا۔

دادی سوچنے لگی کب یہ گاڑی چلے گی۔ میرے اللہ پاکستان کب آئے گا؟

ایک ہندو پانی کا گلاس لیکر آیا۔ "لو پانی پلا دو اسے"۔

لڑکے نے اپنی باہیں آگے بڑھائیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی پڑتی تھیں۔ اس کے جسم کا رواں رواں پانی مانگ رہا تھا۔

ہندو نے گلاس ذرا پیچھے سرکا لیا۔ بولا "اس پانی کی قیمت ہے۔ مسلمان کے بچے کو پانی مفت نہیں ملتا۔ اس گلاس کی قیمت پچاس روپے ہے"۔

"پچاس روپے"! دادی نے عاجزی سے کہا "بیٹا میرے پاس تو چاندی کا ایک چھلا بھی نہیں ہے۔ میں پچاس روپے کہاں سے دوں گی"؟

"پانی۔ پانی۔ دو۔ پانی مجھے دو۔ پانی کا گلاس مجھے دیدو۔ دادی اماں دیکھو یہ ہمیں پانی نہیں پینے دیتا"!

"مجھے دو، مجھے دو"۔ ایک دوسرے مسافر نے کہا۔ "یہ لو میرے پاس پچاس روپے ہیں"۔

ہندو ہنسنے لگا "یہ پچاس روپے تو بچے کے لئے تھے۔ تمہارے لئے اس گلاس کی قیمت سو روپیہ ہے۔ سو روپے دو اور یہ پانی کا گلاس پی لو"۔

"اچھا! یہ سو روپیہ ہی لے لو۔ یہ لو"۔

دوسرے مسلمان مسافر نے سو روپیہ ادا کر کے گلاس لے لیا۔ اور اسے غٹا غٹ پینے لگا۔

بچہ اسے دیکھ کے اور بھی چلانے لگا "پانی، پانی پانی۔ دادی اماں پانی"۔

"ایک گھونٹ اسے بھی دیدو۔ خدا اور رسول کے لئے"!

مسلمان مسافر نے گلاس خالی کر کے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا، اور پانی کی چند بوندیں فرش پر بکھر گئیں۔

بچہ گود سے اتر کر فرش پر چلا گیا۔ پہلے اس نے خالی گلاس کو چاٹنے کی کوشش کی، پھر فرش پر گری ہوئی چند بوندوں کو۔ پھر زور زور سے چلانے لگا "پانی پانی۔ دادی اماں پانی پانی"!

پانی موجود تھا اور پانی نہیں تھا۔ ہندو پناہ گزین پانی پی رہے تھے اور مسلمان پناہ گزین پیاسے تھے۔ پانی موجود تھا۔ اور مٹکوں کی قطاریں سٹیشن کے پلیٹ فارم پر سجی ہوئی تھیں۔ اور پانی کے نل کھلے تھے اور ننگی آبدست کے لئے پانی ہندو مسافروں کو دے رہے تھے۔ لیکن پانی نہیں تھا تو مسلمان مہاجرین کے لئے۔ کیونکہ پنجاب کے نقشے پر ایک کالی موت کی لکیر کھینچ گئی تھی۔ اور کل کا بھائی آج کا دشمن ہو گیا تھا۔ اور کل جس کو ہم نے بہن کہا تھا وہ آج ہمارے لئے طوائف سے بھی بدتر تھی۔ اور کل جو ماں تھی آج

بیٹے نے اس کو ڈائن سمجھ کر اس کے گلے پر چھری پھیر دی تھی۔ پانی ہندوستان میں تھا اور پانی پاکستان میں بھی تھا، لیکن پانی کہیں نہیں تھا کیونکہ آنکھوں کا پانی مر گیا تھا۔ اور یہ دونوں ملک نفرت کے صحرا بن گئے تھے۔ اور ان کی تپتی ہوئی ریت پر چلتے ہوئے کارواں بادِ سموم کی بربادیوں کا شکار ہو گئے تھے۔ پانی تھا مگر سراب تھا۔ جس دیس میں لسی اور دودھ پانی کی طرح بہتے تھے ہاں آج پانی نہیں تھا! اور اس کے بیٹے پیاس سے بلک بلک کر مر رہے تھے۔ کیونکہ پانی تھا اور نہیں تھا! پنجاب کے پانچوں دریا بہہ رہے تھے لیکن دل کے دریا سوکھ گئے تھے۔ اس لئے پانی تھا اور نہیں بھی تھا!

پھر آزادی کی رات آئی۔ دیوالی پر بھی ایسا چراغاں نہیں ہوتا کیونکہ دیوالی پر تو صرف دیئے جلتے ہیں یہاں گھروں کے گھر جل رہے تھے۔ دیوالی پر آتش بازی ہوتی ہے، پٹاخے چھوٹتے ہیں، یہاں بم پھٹ رہے تھے اور مشین گنیں چل رہی تھیں۔ انگریزوں کے راج میں ایک پستول بھی بھولے سے کہیں نہیں ملتا تھا، اور آزادی کی پہلی رات نجانے کہاں سے یہ اتنے سارے بم، ہینڈ گرینیڈ، مشین گن، اسٹین گن، برین گن ٹپک پڑے، یہ اسلحہ جات برطانوی اور امریکی کمپنیوں کے بنائے ہوئے تھے۔ اور آج آزادی کی رات ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے دل چھید رہے تھے۔ لڑتے جاؤ بہادرو، مرتے جاؤ بہادرو۔ ہم لوگ اسلحہ جات تیار کرینگے۔ تم لوگ لڑو گے۔ شاباش بہادرو۔ دیکھنا کہیں ہمارے گولے بارود کے کارخانوں کا منافع کم نہ ہو جائے۔ گھمسان کا رن مچے تو مزا ہے۔ چین والے لڑتے ہیں تو ہندوستان اور پاکستان والے کیوں نہ لڑیں؟ وہ بھی ایشیائی ہیں۔ تم بھی ایشیائی ہو۔ ایشیا کی عزت برقرار رکھو۔ لڑتے جاؤ بہادرو، تم نے لڑنا بند کر دیا تو ایشیا کا رخ دوسری طرف پلٹ جائے گا۔ اور پھر ہمارے کارخانوں کے منافعے اور حصے اور ہماری سامراجی خوشحالی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لڑتے جاؤ بہادرو۔ پہلے تم ہمارے ملکوں سے کپڑا اور شیشے کا سامان اور عطریات منگاتے تھے، اب ہم تمہیں اسلحہ جات بھیجیں گے۔ اور بم اور ہوائی جہاز اور کارتوس، کیونکہ اب تم آزاد ہو گئے ہو۔

مسلح ہندو اور سکھ رضاکار مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا رہے تھے۔ اور جے ہند کے نعرے گونج رہے تھے۔ بقیہ مسلمان اپنے گھروں کی کمین گاہوں میں چھپ کر حملہ آوروں پر مشین گنوں سے حملہ کر رہے تھے۔ اور ہینڈ گرینیڈ پھینکتے تھے۔ آزادی کی رات اور اس کے تین چار روز بعد تک اسی طرح مقابلہ رہا۔ پھر سکھوں اور ہندوؤں کی مدد کے لئے آس پاس کی ریاستوں سے رضاکار پہنچ گئے۔ اور مسلمانوں نے اپنے گھر خالی کرنے شروع کئے۔ گھر، محلے، بازار جل رہے تھے۔ ہندوؤں کے گھر اور مسلمانوں کے گھر اور سکھوں کے گھر، لیکن آخر میں مسلمانوں کے گھر سب سے زیادہ جلے۔ اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان اکٹھے ہو کر شہر سے بھاگنے لگے۔

اس موقعے پر جو کچھ ہوا اسے تاریخ میں "امرتسر کا قتلِ عام" کہا جائے گا۔

لیکن ملٹری نے "حالات" پر جلد قابو پا لیا۔ قتلِ عام بند ہوا۔ اور ہندو اور مسلمان دو مختلف کیمپوں میں بند ہو کر پناہ گزین کہلانے لگے۔ ہندو پناہ گزین "شرنارتھی" کہلاتے تھے اور مسلمان پناہ گزین "مہاجرین"۔ گو مصیبت دونوں پر ایک ہی تھی، لیکن ان کے نام الگ الگ کر دئے تھے تاکہ مصیبت میں بھی یہ لوگ اکٹھے نہ ہوں۔ دونوں کیمپوں پر نہ چھت تھی نہ روشنی کا انتظام تھا نہ سونے کے لئے بستر تھے نہ پاخانے۔ لیکن ایک کیمپ ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کا کیمپ کہلاتا تھا اور دوسرا مسلمان مہاجرین کا۔

ہندو شرنارتھیوں کے کیمپ میں آزادی کی رات میں شدید بخار میں لرزتی ہوئی ایک ماں اپنے بیمار بیٹے کے سامنے دم توڑ رہی تھی۔ یہ لوگ مغربی پنجاب سے آئے تھے۔ پندرہ آدمیوں کا خاندان تھا۔ پاکستان سے ہندوستان آتے آتے صرف دو افراد رہ گئے تھے۔ اور اب ان میں سے بھی ایک ہی رہا تھا۔ دوسرا دم توڑ رہا تھا۔ جب یہ پندرہ افراد کا قافلہ گھر سے چلا تھا تو اُنکے

پاس بستر تھے، سامان خورو نوش تھا، کپڑوں سے بھرے ہوئے ٹرنک تھے، روپے کی پوٹلیاں تھیں اور عورتوں کے جسموں پر زیور تھے اور لڑکے کے پاس ایک بائیسکل تھی، اور یہ سب پندرہ آدمی تھے۔

گوجرانوالے تک پہنچنے میں دس آدمی رہ گئے۔ پہلے روپیہ گیا، پھر زیور، پھر عورتوں کے جسم۔

لاہور آتے آتے چھ آدمی رہ گئے۔ کپڑوں کے ٹرنک گئے۔ اور بستر بھی۔ اور لڑکے کو اپنی بائیسکل کے چھن جانے کا بڑا افسوس تھا۔

اور جب مغلپورہ سے آگے بڑھے تو صرف دو رہ گئے تھے۔ ماں اور ایک بیٹا اور ایک لحاف، جو دم توڑتی ہوئی عورت لرزنے کے بخار میں اس وقت اوڑھے ہوئے تھی۔ اس وقت، آدھی رات کے وقت، آزادی کی پہلی رات کو وہ عورت مر رہی تھی اور اس کا بیٹا چپ چاپ اس کے سرہانے بیٹھا ہوا بخار سے کانپ رہا تھا، اور اس کی ٹکٹکی بندھی ہوئی تھی۔

اور آنسو ایک عرصہ ہوا ختم ہو چکے تھے۔

اور جب اس کی ماں مر گئی تو اس نے آہستہ سے لحاف کو اس کے جسم سے الگ کیا اور اسے اوڑھ کر کیمپ کے دوسرے کونے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک رضاکار اس کے پاس آیا، اور اس سے کہنے لگا۔ "وہ - - ادھر - - تمہاری ماں تھی جو مر گئی ہے؟"

"نہیں، نہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں وہ کون تھی" لڑکے نے خوفزدہ ہو کر کہا، اور زور سے لحاف کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے بولا "وہ میری ماں نہیں تھی، یہ لحاف میرا ہے۔ یہ لحاف میرا ہے۔ میں یہ لحاف نہیں دونگا۔ یہ لحاف میرا ہے"۔ وہ زور زور سے چیخنے لگا "وہ میری ماں نہیں تھی، یہ لحاف میرا ہے۔ میں اسے کسی کو نہ دوں گا۔ یہ لحاف میں ساتھ لایا ہوں۔ نہیں دونگا تمہیں!"

ایک لحاف، ایک ماں، ایک مردہ انسانیت۔ کیسے معلوم تھا کہ ایک دن اس نئی تثلیث کی کہانی بھی مجھے آپ کو سنانی پڑیگی!

جب مسلمان بھاگے تو ان کے گھر لٹنے شروع ہوئے۔ شاید ہی کوئی شریف آدمی رہا ہو جس نے اس لوٹ میں حصہ نہ لیا ہو۔ آزادی کے تیسرے دن کا ذکر ہے میں اپنی گائے کو گلی کے باہر نل پر پانی پلانے لے جا رہا تھا۔ بالٹی میرے ہاتھ میں تھی۔ دوسرے ہاتھ میں گائے کے گلے سے بندھی ہوئی رسی تھی۔ گلی کے موڑ پر پہنچ کر میں نے میونسپلٹی کے لیمپ والے کھمبے سے گائے کو باندھ دیا اور نل کی جانب بالٹی لئے مڑ گیا کہ بالٹی میں پانی بھر لاؤں۔ تھوڑی دیر کے بعد بالٹی بھر کے لایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گائے غائب ہے! ادھر ادھر بہتیرا دیکھا لیکن گائے کہیں نظر نہیں آئی۔ یکایک میری نگاہ ساتھ والے مکان کے آنگن میں گئی۔ دیکھتا ہوں تو گائے آنگن میں بندھی کھڑی ہے! میں گھر میں گھسا۔

"کیا ہے جی، کون ہو تم؟" ایک سردار صاحب نے نہایت خشونت سے کہا۔

میں نے کہا: "میں ابھی اپنی گائے کو رسی سے باندھ کر نل پر پانی لانے گیا تھا۔ یہ گائے تو میری ہے سردار جی"!

سردار جی مسکرائے: "ہلا! ہلا! کوئی گل نہیں۔ میں نے سمجھا کسی مسلمان کی گائے ہے۔ یہ آپ کی گائے ہے تو پھر لیجائیے"۔ اتنا کہہ کر انہوں نے گائے کی رسی کھول کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔

"معاف کرنا" میرے چلتے چلتے انہوں نے پھر کہا: "آپاں سمجھیا کسی مسلمان دی گائے ہے"!

میں نے یہ واقعہ اپنے دوست سردار سندر سنگھ سے بیان کیا تو وہ بہت ہنسا۔

"بھلا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

تو وہ اور بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ سندر سنگھ، "میں آپ کو بتا دوں، اشتراکی ہے۔ اس لئے فرقہ وارانہ فساد سے بہت

دور رہتا ہے۔ وہ میرے ان چند احباب میں سے ہے جنہوں نے اس لوٹ مار میں بالکل کوئی حصہ نہیں لیا۔

میں نے کہا: "تم اسے اچھا سمجھتے ہو؟"

وہ بولا: "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میں ہنس رہا تھا کیونکہ آج صبح ایک ایسا ہی واقعہ خود مجھے پیش آیا۔ میں ہال بازار سے گذر رہا تھا کہ میں نے سوچا سامنے کٹڑے میں سردار سوہن سنگھ جی کو دیکھتا چلوں۔ پرانے غدر پارٹی کے لیڈر ہیں نا وہ۔ انہوں نے اپنے گاؤں میں تین چار سو مسلمانوں کو پناہ دے رکھی ہے۔ سوچا پوچھتا چلوں ان کا کیا ہوا، انہیں وہاں سے نکال کر مہاجرین کیمپ پہنچانے کی کیا سبیل کی جائے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی گاڑی محمد رزاق جوتے والے کی دوکان جو اب لٹ چکی ہے اس کے آگے کھڑی کی۔ اور کٹڑے میں گھس گیا۔ چند منٹ کے بعد میں لوٹ کر آگیا کیونکہ باباجی گھر پر نہیں ملے۔ آکے دیکھتا ہوں تو گاڑی غائب ہے۔ ابھی تو یہیں چھوڑی تھی! پوچھنے پر بھی کوئی نہیں بتاتا۔ اتنے میں میری نظر ہال بازار کے آخری کونے پر پڑی۔ وہاں میری گاڑی کھڑی تھی، لیکن ایک جیپ کے پیچھے بندھی ہوئی! میں بھاگا بھاگا وہاں گیا۔ جیپ میں سردار ..... سنگھ مشہور قومی کارکن بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

"اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔"

"اور یہ میری موٹر بھی کیا تمہارے گاؤں جائے گی؟"

"کونسی موٹر؟ ---- وہ جو پیچھے بندھی ہوئی ہے؟ یہ تمہاری موٹر ہے؟ معاف کرنا پیارے۔ میں نے پہچانی نہیں۔ وہ محمد رزاق کی دوکان کے آگے کھڑی تھی نا، میں نے سوچا کسی مسلمان کی ہوگی۔ میں نے جیپ کے پیچھے باندھ لیا۔ ہا ہا ہا! میں تو اسے اپنے گھر لے جا رہا تھا۔ اچھا ہوا تم وقت پر آگئے۔"

"اور اب کہاں جاؤ گے؟" میں نے اپنی موٹر کھول کر اس میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اب؟ ---- اب میں کہیں اور جاؤنگا۔ کہیں نہ کہیں سے کوئی مال مل ہی جائے گا۔"

سردار ---- سنگھ قومی کارکن ہیں، جیل جا چکے ہیں، جرمانے ادا کر چکے ہیں، سیاسی آزادی کے حصول کے لئے قربانیاں دے چکے ہیں۔

یہ واقعہ سنا کر سندر سنگھ نے کہا DEMORALISATION اس حد تک پھیل چکی ہے کہ ہمارے اچھے اچھے قومی کارکن بھی اس سے محفوظ نہیں رہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں میں کام کرنے والے طبقے کا ایک جزو خود اس لوٹ مار قتل و غارتگری میں شریک ہے۔ اس رَو کو اگر اسی وقت روکا نہ گیا تو دونوں جماعتیں فسطائی ہو جائیں گی۔ یہی کوئی دو چار سال ہی ہیں۔"

سندر سنگھ کا چہرہ متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کے چلا آیا۔ راستے میں خالصہ کالج روڈ پر ایک مسلمان امیر کی کوٹھی لوٹی جا رہی تھی۔ اسباب کے لدے ہوئے چھکڑے مختلف گروہ لے جا رہے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے چند منٹوں میں سب معاملہ ختم ہوگیا۔ سڑک پر چلنے والے ہندو اور سکھ راہگیر بھی کوٹھی کی طرف بھاگے۔ لیکن پولیس کے سپاہیوں کو وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

پولیس کے سپاہیوں کے ہاتھوں میں چند جرابیں تھیں اور ریشمی ٹائیاں، ایک کوٹ ہینگر پر معلق پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے

مسکرا کر لوگوں سے کہا "اب کہاں جاتے ہوں، وہاں تو سب کچھ پہلے ہی ختم ہو چکا ہے"۔

ایک مہاشے جو شکل و صورت سے آریہ سماجی معلوم ہوتے تھے اور میرے سامنے ہی کوٹھی کی طرف بھاگے تھے، اب مڑ کر میری طرف دیکھ کر کہنے لگے "دیکھیے صاحب، دنیا کیسی پاگل ہو گئی ہے"۔

میرے قریب سے ایک دودھ بیچنے والا بھیا گزرا۔ بجالے کے حصے میں چند کتابیں آئی تھیں۔ وہ انہیں اٹھائے لے جا رہا تھا۔

میں نے پوچھا "ان کتابوں کا کیا کرو گے، پڑھ سکتے ہو؟"

"نا بابو جی"

"پھر؟"

اس نے کتابوں کی طرف غصے سے دیکھا۔ بولا "ہم کا کریں بابو، جدھر جاتے ہیں یہ لوگ پہلے ہی اچھا اچھا سامان اٹھا لیجاتے ہیں۔ ہماری تو قسمت کھراب ہے بابو"۔

اس نے پھر کتابوں کو غصے سے دیکھا۔ اس کا ارادہ تھا انہیں وہیں سڑک پر پھینک دے۔ پھر اس کا ارادہ بدل گیا۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا "کوئی بات نہیں۔ یہ موٹی موٹی کتابیں چولہے میں خوب جلیں گی۔ رات کے بھوجن کیلئے لکڑیوں کی جرورت نا ہیں"!

بڑی اچھی کتابیں تھیں۔ سب چولہے میں گئیں۔ ارسطو، سقراط، افلاطون، روسو، شکسپیر سب چولہے میں گئے۔

سہ پہر کے قریب بازار سنسان پڑنے لگے۔ کرفیو ہونے والا تھا۔ میں جلدی جلدی کوچہ رام داس سے نکلا اور مقدس گوردوارے کو تعظیم دیتا ہوا اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ راستے میں اندھیری گلی پڑتی تھی، جہاں جلیانوالے باغ کے روز لوگوں کو گھٹنوں کے بل چلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا میں اس گلی سے کیوں نہ نکل جاؤں، یہ راستہ ٹھیک رہے گا۔ میں اسی گلی کی طرف گھوم گیا۔ یہ گلی تنگ ہے اور یہاں دن کو بھی اندھیرا سا رہتا ہے۔ یہاں مسلمانوں کے آٹھ دس گھر تھے۔ وہ سب کے سب جلائے گئے تھے یا ڈھائے گئے تھے۔ دروازے کھلے تھے۔ کھڑکیاں ٹوٹی ہوئیں۔ گلی میں سناٹا تھا۔ گلی کے فرش پر عورتوں کی لاشیں پڑی تھیں۔

میں پلٹنے لگا۔ اتنے میں کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ گلی کے بیچ میں لاشوں کے درمیان ایک بڑھیا رینگنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے اسے سہارا دیا۔

"پانی، بیٹا"

میں اوک میں پانی لایا۔ مقدس گوردوارے کے سامنے پانی کا نل تھا۔

میں نے اپنی اوک اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔

"تم پر خدا کی رحمت ہو بیٹا۔ تم کون ہو؟ خیر تم جو کوئی بھی ہو۔ تم پر خدا کی رحمت ہو بیٹا۔ یہ ایک مرنے والی کے الفاظ ہیں۔ انہیں یاد رکھنا"۔

میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تمہیں کہاں چوٹ آئی ہے ماں؟"

بڑھیا نے کہا "مجھے مت اٹھاؤ۔ میں یہیں مرونگی، اپنی بہو بیٹیوں کے درمیان۔ کیا کہا تم نے، چوٹ؟ ارے بیٹا یہ چوٹ بہت گہری ہے۔ یہ گھاؤ دل کے اندر ہے۔ بہت گہرا گھاؤ ہے۔ تم لوگ اس سے کیسے پنپ سکوگے؟ تمہیں خدا کیسے معاف کریگا؟

"ہمیں معاف کر دو ماں"

مگر بڑھیا نے کچھ نہیں سُنا۔ وہ آپ ہی آپ کہتی جا رہی تھی: "پہلے، انہوں نے ہمارے مردوں کو مارا، پھر ہمارے گھر لوٹے، پھر ہمیں گھسیٹ کر گلی میں لے آئے اور اس گلی میں، اس فرش پر، اس مقدس گوردوارے کے سامنے جسے ہم ہر روز تعظیم دیا کرتی تھیں انہوں نے ہماری عصمت دری کی، اور پھر ہمیں گولی سے مار دیا۔ میں تو ان کی دادیوں کی ہم عمر تھی۔ انہوں نے مجھے بھی معاف نہیں کیا۔"

یکایک اس نے مجھے آستین سے پکڑ لیا: "تو جانتا ہے یہ امرتسر کا شہر ہے۔ یہ میرا شہر ہے، اس مقدس گوردوارے کو میں روز سلام کرتی تھی جیسے اپنی مسجد کو روز سلام کرتی ہوں۔ میری گلی میں ہندو، مسلمان، سکھ سبھی بستے تھے۔ اور کئی پشتوں سے ہم لوگ یہاں بستے چلے آئے ہیں۔ اور ہم ہمیشہ ہمیشہ محبت سے اور پیار سے اور صلح سے رہے ہیں۔ اور کبھی کچھ نہیں ہوا۔"

"میرے ہم مذہبوں کو معاف کر دو اماں۔"

"تو جانتا ہے میں کون ہوں؟ میں زینب کی ماں ہوں۔ تو جانتا ہے زینب کون تھی؟ زینب وہ لڑکی تھی جس نے جلیانوالے روز اس گلی میں گوروں کے آگے سر نہیں جھکایا تھا۔ جو اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے سر اونچا کئے اس گلی میں سے گذر گئی۔ یہی وہ گلی ہے، یہی وہ جگہ ہے، جہاں زینب شہید ہوئی تھی۔

"میں اسی زینب کی ماں ہوں۔ میں ایسی آسانی سے تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہوں۔ مجھے سہارا دو، مجھے کھڑا کر دو۔ میں اپنی لٹی ہوئی آبرو اور اپنی بہو بیٹیوں کی برباد عصمتیں لے کر سیاستدانوں کے پاس جاؤں گی۔ مجھے سہارا دو۔ میں ان سے کہوں گی میں زینب کی ماں ہوں، میں امرتسر کی ماں ہوں، میں پنجاب کی ماں ہوں۔ تم نے میری گود اجاڑی ہے، تم نے بڑھاپے میں میرا منہ کالا کیا ہے۔ میری جوان جہان بہوؤں اور بیٹیوں کی پاک و صاف روحوں کو جہنم کی آگ میں جھونکا ہے۔ میں ان سے پوچھوں گی کیا زینب اس آزادی کے لئے قربان ہوئی تھی؟ میں ۔۔۔ زینب کی ماں! ۔۔۔"

یکایک وہ میری گود میں جھک گئی، اس کے منہ سے خون اُبل پڑا۔ دوسرے لمحے میں اس نے جان دے دی۔

زینب کی ماں میری گود میں مری پڑی ہے۔ اور اس کا لہو میری قمیص پر ہے۔ اور میں زندگی سے موت کے دروازے تک جھانک رہا ہوں اور تخیل میں صدیق اور ادم پرکاش ابھرتے چلے آتے ہیں اور زینب کا سر غرور فضا میں بڑھتا چلا آتا ہے۔ اور شہید مجھ سے کہتے ہیں کہ ہم پھر آئیں گے۔ صدیق، ادم پرکاش۔ ہم پھر آئیں گے۔ شام کور، زینب، پارو، بیگم ۔۔۔ ہم پھر آئیں گے۔ اپنی عصمتوں کا تقدس لئے ہوئے، اپنی بے داغ روحوں کا عزم لئے ہوئے، کیونکہ ہم انسان ہیں، ہم ساری کائنات میں تخلیق کے علمبردار ہیں، اور کوئی تخلیق کو مار نہیں سکتا۔ کوئی اس کی عصمت دری نہیں کر سکتا۔ کوئی اسے لوٹ نہیں سکتا۔ کیونکہ ہم تخلیق ہیں اور تم تخریب ہو۔ تم وحشی ہو، تم درندے ہو، تم مر جاؤ گے لیکن ہم نہیں مریں گے۔ کیونکہ انسان کبھی نہیں مرتا۔ وہ درندہ نہیں ہے، وہ نیکی کی روح ہے، خدائی کا ماحصل ہے، کائنات کا غرور ہے!

خواجہ احمد عباس

سردارجی

جب دہلی اور نئی دہلی میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم ہوا اور مسلمان کا خون سستا ہو گیا تو میں نے سوچا۔ واہ ری قسمت۔ پڑوسی بھی ملا تو سکھ۔ حق ہمسائگی ادا کرنا اور جان بچانا تو کجا، نہ جانے کب کرپان بھونک دے۔ بات یہ ہے کہ میں سکھوں سے کسی قدر ڈرتا ہوں۔ کافی نفرت کرتا ہوں اور ان کو عجیب الخلقت قسم کے جانور سمجھتا ہوں۔ آج سے نہیں بچپن سے۔ میں شاید چھ برس کا تھا جب پہلی بار میں نے ایک سکھ کو دیکھا تھا جو دھوپ میں بیٹھا اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ میں چلا پڑا "ارے وہ دیکھو! وہ دیکھو! عورت کے منہ پر کتنی لمبی داڑھی۔" جیسے جیسے عمر گذرتی گئی یہ استعجاب ایک نسلی نفرت میں تبدیل ہو گیا۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں جب کسی بچے کے بارے میں نامبارک بات کا ذکر کرتیں مثلاً یہ کہ "اسے نمونیا ہو گیا تھا" یا "اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی" تو کہتیں "اب سے دور کسی سکھ فرنگی کو نمونیہ ہو گیا تھا" یا "اب سے دور کسی سکھ فرنگی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی"۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کوسنا ۱۸۵۷ء کی یادگار تھا جب ہندو مسلمانوں کی جنگ آزادی کو دبانے میں پنجاب کے سکھ راجوں اور ان کی فوجوں نے فرنگیوں کا ساتھ دیا تھا۔ مگر اس وقت تاریخی حقائق پر نظر نہیں تھی۔ صرف ایک مبہم سا خوف، ایک عجیب سی نفرت اور ایک عمیق تعصب۔ ڈر انگریز سے بھی لگتا تھا اور سکھ سے بھی۔ مگر انگریز سے زیادہ۔ مثلاً جب میں کوئی دس برس کا تھا۔ ایک روز دہلی سے علی گڑھ جا رہا تھا۔ ہمیشہ تھرڈ یا انٹر میں سفر ہوتا تھا۔ سوچا اب کی بار سیکنڈ کلاس میں سفر کر کے دیکھا جائے۔ ٹکٹ خرید لیا اور ایک خالی ڈبے میں بیٹھ کر گدوں پر خوب کودا۔ باتھ روم کے آئینے میں اچک اچک کر اپنا عکس دیکھا۔ سب پنکھوں کو ایک ساتھ چلا دیا۔ روشنیوں کو کبھی جلایا کبھی بجھایا۔ مگر ابھی گاڑی کے چلنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ لال لال منہ والے چار فوجی گورے آپس میں ڈیم بلیڈی قسم کی گفتگو کرتے ہوئے درجے میں گھس آئے۔ ان کو دیکھنا تھا کہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا شوق رفوچکر ہو گیا۔ اور اپنا سوٹ کیس گھسیٹتا میں بھاگا اور ایک نہایت کھچا کھچ بھرے ہوئے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں آ کر دم لیا۔ یہاں دیکھا تو کئی سکھ داڑھیاں کھولے کچھے پہنے بیٹھے تھے۔ مگر میں ان سے ڈر کر درجہ چھوڑ نہیں بھاگا۔ صرف ان سے ذرا فاصلہ پر بیٹھ گیا۔

ہاں تو ڈر تو سکھوں سے بھی لگتا تھا اور انگریزوں سے ان سے بھی زیادہ۔ مگر انگریز انگریز تھے اور کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ جو میں بھی پہننا چاہتا تھا۔ اور ڈیم بلیڈی فول والی زبان بولتے تھے۔ جو میں بھی سیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ حاکم تھے۔ اور میں بھی چھوٹا موٹا حاکم بننا چاہتا تھا۔ وہ کانٹے چھری سے کھانا کھاتے تھے اور میں بھی کانٹے چھری سے کھانا کھانے کا خواہاں تھا۔ تاکہ دنیا مجھے بھی مہذب اور متمدن سمجھے۔ مگر سکھوں سے جو ڈر لگتا تھا وہ حقارت آمیز تھا۔ کتنے عجیب الخلقت تھے یہ سکھ جو مرد ہو کر بھی سر کے بال عورتوں کی طرح لمبے لمبے رکھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انگریزی فیشن کی نقل میں سر کے بال منڈانا کچھ مجھے بھی پسند نہیں تھا۔ اور ابا کے اس حکم کے باوجود کہ ہر جمعہ کو سر کے بال خشخشی کرائے جائیں میں نے بال خوب بڑھا رکھے تھے تاکہ ہاکی اور فٹ بال کھیلتے وقت بال ہوا میں اڑیں . . . . جیسے انگریزی کھلاڑیوں کے۔ ابا کہتے یہ کیا عورتوں کی طرح پٹے بڑھا رکھے ہیں۔ مگر ابا تو تھے ہی پرانے دقیانوسی خیالات کے۔ ان کی بات کون سنتا تھا۔ ان کا بس چلتا تو سر پر استرا چلوا کر بچپن میں بھی ہمارے چہروں پر داڑھیاں بندھوا دیتے

. . . . ہاں اس پر یاد آیا کہ سکھوں کے عجیب الخلقت ہونے کی دوسری نشانی ان کی داڑھیاں تھیں۔ اور پھر داڑھی داڑھی میں بھی فرق ہوتا ہے جیسا ابا کی داڑھی جس کو نائی نہایت اہتمام سے فرینچ کٹ بنایا کرتا تھا یا نانا ابا کی داڑھی جو نوکیلی اور چوپخ دار تھی۔ مگر یہ بھی کیا کہ داڑھی کو کبھی قینچی لگے ہی نہیں۔ جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھتی رہے۔ بلکہ تیل اور دہی اور نہ جانے کیا کیا مل کر بڑھائی جائے۔ اور جب کئی فٹ لمبی ہو جائے تو اس میں کنگھی کی جائے۔ جیسے عورتیں سر کے بالوں میں کرتی ہیں . . . . عورتیں یا مجھ جیسے سکول کے فیشن ایبل لڑکے! اس کے علاوہ دادا جان کی داڑھی بھی کئی فٹ لمبی تھی۔ اور وہ بھی اس میں کنگھی کرتے تھے۔ مگر دادا جان کی بات اور تھی۔ آخر وہ . . . میرے دادا جان ٹھیرے۔ اور سکھ پھر سکھ تھے۔

میٹرک کرنے کے بعد مجھے پڑھنے کے لئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیجا گیا۔ کالج میں جو پنجابی لڑکے پڑھتے تھے اُن کو ہم دہلی اور یو۔ پی والے بیچ۔ جاہل اور اُجڈ سمجھتے تھے۔ نہ بات کرنے کا سلیقہ، نہ کھانے پینے کی تمیز۔ تہذیب و تمدن چھو نہیں گئے تھے گنوار کے لٹھ۔ یہ بڑے بڑے لسّی کے گلاس پینے والے بھلا کیوڑے دار فالودے اور لسٹن کی چینی کی لذت کیا جانیں۔ زبان نہایت ناشائستہ۔ بات کریں تو معلوم ہو لڑ رہے ہیں۔ اسی تُسی۔ ساڈے تُہاڈے . . . . لاحول ولا قوۃ۔ میں تو ہمیشہ ان پنجابیوں سے کتراتا تھا۔ مگر خدا بھلا کرے ہمارے وارڈن صاحب کا کہ انہوں نے ایک پنجابی کو میرے کمرہ میں جگہ دیدی۔ میں نے سوچا چلو جب ساتھ رہنا ہی ہے تو تھوڑی بہت حد تک دوستی ہی کر لی جائے۔ کچھ دنوں میں کافی گاڑھی چھننے لگی۔ اُس کا نام غلام رسول تھا۔ راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ کافی مزیدار آدمی تھا۔ اور لطیفے خوب سناتا تھا۔

اب آپ کہیں گے کہ ذکر شروع ہوا تھا سردار صاحب کا یہ غلام رسول کہاں سے ٹپک پڑا۔ مگر اصل میں غلام رسول کا اس قصے سے قریبی تعلق ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ جو لطیفے سناتا تھا۔ وہ عام طور سے سکھوں کے بارے میں ہوتے تھے۔ جن کو سن سن کر مجھے پوری سکھ قوم کی عادات وخصائل اُن کی نسلی خصوصیات اور اجتماعی کیریکٹر کا بخوبی علم ہو گیا تھا۔ بقول غلام رسول کے ——

سکھ تمام بیوقوف اور بدھو ہوتے ہیں۔ بارہ بجے تو ان کی عقل بالکل خبط ہو جاتی ہے۔ اس کے ثبوت میں کتنے ہی واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں مثلاً ایک سردار جی دن کے بارہ بجے سائیکل پر سوار امرتسر کے ہال بازار سے گذر رہے تھے چوراہے پر ایک سکھ کانسٹیبل نے روکا اور پوچھا "تمہاری سائیکل کی لائٹ کہاں ہے"۔ سائیکل سوار سردار جی گڑبڑا کر بولے "جمعدار صاحب ابھی ابھی بجھ گئی ہے۔ گھر سے جلا کر تو چلا تھا۔" اس پر سپاہی نے چالان کرنے کی دھمکی دی۔ ایک راہ چلتے سفید داڑھی والے سردار جی نے بیچ بچاؤ کرایا۔ "چلو بھئی کوئی بات نہیں۔ لائٹ بجھ گئی ہے تو اب جلا لو۔" اور اسی قسم کے سینکڑوں قصے غلام رسول کو یاد تھے۔ اور انہیں جب وہ پنجابی مکالموں کے ساتھ سناتا تھا تو سننے والوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ اصل میں اُن کو سننے کا مزا پنجابی میں ہی تھا۔ کیونکہ اجڈ سکھوں کی عجیب وغریب حرکتوں کو بیان کرنے کا حق کچھ پنجابی جیسی اجڈ زبان ہی میں ہو سکتا ہے۔ سکھ نہ صرف بیوقوف اور بدھو تھے بلکہ گندے بھی تھے۔ جیسا ایک ثبوت تو بقول غلام رسول (جس نے سینکڑوں سکھوں کو دیکھا تھا) یہ تھا کہ وہ بال نہیں منڈاتے تھے۔ اس کے علاوہ برخلاف ہم صاف ستھرے غازی مسلمانوں کے جو برا تھوڑے جمعے کے جمعے غسل کرتے ہیں یہ سکھ کچھا باندھ سب کے سامنے نل کے نیچے بیٹھ کر نہاتے تو روز ہیں مگر اپنے بالوں اور داڑھی میں نا جانے کیا کیا گندی اور غلیظ چیزیں ملتے ہیں مثلاً دہی۔ ویسے سر میں مَیں بھی لائم جوس گلسرین لگاتا ہوں۔ جو کسی قدر گاڑھے گاڑھے دودھ سے مشابہ ہوتی ہے مگر اس کی بات اور ہے وہ ولایت کی نہایت مشہور پرفیوم فیکٹری سے نہایت خوبصورت شیشی میں آتی ہے اور دہی لسی گندے سندے حلوائی کی دوکان سے۔

خیر جی ہمیں دوسروں کے رہنے سہنے کے طریقوں سے کیا لینا۔ مگر سکھوں کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ لوگ اکھڑ پن، بدتمیزی اور مار دھاڑ میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت کرتے تھے۔ اب دُنیا جانتی ہے کہ ایک اکیلا مسلمان دس ہندوؤں یا سکھوں پر بھاری ہوتا ہے۔ مگر پھر یہ سکھ مسلمانوں کے رعب کو نہیں مانتے تھے۔ کرپانیں لٹکائے اکڑ اکڑ کر مونچھوں پر تاؤ، داڑھی پر بھی تاؤ دیتے چلتے تھے۔ غلام رسول اکثر کہتا: ان کی ہیکڑی ایک دن ہم ایسی نکالیں گے کہ خالصہ جی یاد ہی تو کریں گے۔

کالج چھوڑے کتنے ہی سال گذر گئے۔ طالب علم سے میں کلرک، اور کلرک سے ہیڈ کلرک بن گیا۔ علی گڑھ کا ہوسٹل چھوڑ کر دہلی میں ایک سرکاری کوارٹر میں رہنا سہنا اختیار کر لیا۔ شادی ہوگئی۔ بچے ہوگئے۔ مگر کتنی ہی مدت کے بعد مجھے غلام رسول کا وہ کہنا یاد آیا۔ جب ایک سردار صاحب میرے برابر کے کوارٹر میں رہنے کو آئے۔ یہ راولپنڈی سے بدلی کرا کر آئے تھے۔ کیونکہ راولپنڈی کے ضلع میں غلام رسول کی پیشین گوئی کے موجب سرداروں کی ہیکڑی اچھی طرح سے نکالی گئی تھی۔ مجاہدوں نے اُن کا صفایا کر دیا تھا جیسے سور مارتے تھے۔ کرپانیں لئے پھرتے تھے۔ بہادر مسلمانوں کے سامنے ان کی ایک نہ بنی۔ اُن کی داڑھیاں مونڈ کر اُن کو مسلمان بنایا گیا تھا۔ زبردستی اُن کا ختنہ کیا گیا تھا۔ ہندو پریس حسبِ عادت مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے یہ لکھ رہا تھا کہ سکھ عورتوں اور بچوں کو بھی مسلمانوں نے قتل کیا ہے۔ حالانکہ یہ اسلامی روایات کے خلاف ہے۔ کوئی مسلمان مجاہد کبھی عورت یا بچے پہ ہاتھ نہیں اُٹھاتا۔ رہیں عورتوں اور بچوں کی لاشوں کی تصویریں جو چھاپی جا رہی تھیں وہ یا تو جعلی تھیں اور یا سکھوں نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کیلئے خود اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہوگا۔ راولپنڈی اور مغربی پنجاب کے مسلمانوں پر یہ بھی الزام لگایا گیا تھا۔ کہ انہوں نے ہندو اور سکھ لڑکیوں کو بھگایا تھا۔ حالانکہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کی جوانمردی کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ اور اگر نوجوان مسلمانوں پر ہندو اور سکھ لڑکیاں خود ہی لٹو ہو جائیں۔ تو ان کا کیا قصور ہے کہ وہ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں اُن لڑکیوں کو اپنی پناہ میں لے لیں۔ ہاں تو سکھوں کی نام نہاد بہادری کا بھانڈہ پھوٹ گیا تھا۔ بھلا اب تو ماسٹر تارا سنگھ لاہور میں کرپان نکال کر مسلمانوں کو دھمکیاں دے! پنڈی سے بھاگے ہوئے سردار اور اس کی خستہ حالی کو دیکھ کر میرا سینہ عظمتِ اسلام کی روح سے بھر گیا۔

ہمارے پڑوسی سردار جی کی عمر کوئی ساٹھ برس کی ہوگی۔ داڑھی بالکل سفید ہو چکی تھی۔ حالانکہ موت کے منہ سے بچ کر آئے تھے مگر یہ حضرت ہر وقت دانت نکالے ہنستے رہتے تھے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دراصل کتنا بیوقوف اور بے حس ہے۔ شروع شروع میں انہوں نے مجھے اپنی دوستی کے جال میں پھنسانا چاہا۔ آتے جاتے زبردستی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ نہ جانے سکھوں کا کون سا تہوار تھا۔ اس دن پرشاد کی مٹھائی بھی بھیجی (جو میری بیوی نے فوراً مہترانی کو دیدی)، پر میں نے زیادہ منہ نہ لگایا۔ کوئی بات ہوتی سو کھا سا جواب دیدیا اور بس۔ میں جانتا تھا کہ سیدھے منہ دو چار باتیں کر لیں تو یہ پیچھے ہی پڑ جائے گا۔ آج باتیں تو کل گالم گفتار۔ گالیاں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ سکھوں کی دال روٹی ہوتی ہے۔ کون اپنی زبان گندی کرے۔ ایسے لوگوں سے تعلقات بڑھا کر۔ ہاں ایک اتوار کی دوپہر کو میں اپنی بیوی کو سکھوں کی حماقت کے قصے سنا رہا تھا۔ اس کا عملی ثبوت دینے کے لئے عین بارہ بجے میں نے اپنے نوکر کو سردار جی کے ہاں بھیجا کہ پوچھ کر آئے کیا بجا ہے۔ انہوں نے کہلوا دیا بارہ بج کر دو منٹ ہوئے ہیں۔ میں نے کہا بارہ بجے کا نام لیتے گھبراتے ہیں یہ۔ اور ہم خوب ہنسے۔ اس کے بعد کئی بار میں نے بے وقوف بنانے کے لئے سردار جی سے پوچھا: کیوں سردار جی بارہ بج گئے؟ اور وہ بے شرمی سے دانت نکال کر جواب دیتے: ”جی اساں دے ہاں چوبیس گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں۔“ اور یہ کہہ کر خوب ہنستے۔ گویا یہ بڑا مذاق ہوا۔

مجھے سب سے زیادہ ڈر بچوں کی طرف سے تھا۔ اول تو کسی سکھ کا اعتبار نہیں کب بچے ہی کے گلے پر کرپان چلا دے۔ پھر یہ لوگ

راولپنڈی سے آئے تھے۔ ضرور دل میں مسلمانوں کے لئے کینہ رکھتے ہوں گے۔ اور انتقام لینے کی تاک میں ہوں گے۔ میں نے بیوی کو تاکید کر دی تھی کہ بچے ہرگز سردار جی کے کوارٹر کی طرف نہ جانے دئے جائیں۔ پر بچے تو پھر بچے ہی ہوتے ہیں۔ چند روز کے بعد میں نے دیکھا کہ سردار کی چھوٹی لڑکی موہنی اور اُن کے پوتوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ یہ بچی جس کی عمر مشکل سے دس برس کی ہوگی سچ مچ موہنی ہی تھی۔ گوری چٹی۔ اچھا ناک نقشہ۔ بڑی خوبصورت۔ کمبختوں کی عورتیں کافی خوبصورت ہوتی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ غلام رسول کہا کرتا تھا۔ کہ اگر پنجاب سے سکھ مرد چلے جائیں اور اپنی عورتوں کو چھوڑ جائیں تو پھر حوروں کی تلاش میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں تو جب میں نے بچوں کو سردار جی کے بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو میں اُن کو گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ اور خوب پٹائی کی۔ پھر میرے سامنے کم سے کم اُن کی ہمت نہ ہوئی کہ اُدھر کا رُخ کریں۔

بہت جلد سکھوں کی اصلیت پوری طرح ظاہر ہو گئی۔ راولپنڈی سے تو ڈرپوکوں کی طرح پٹ کر بھاگ کر آئے تھے۔ پر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو اقلیت میں پاکر۔ اُن پر ظلم ڈھانا شروع کر دیا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو جام شہادت پینا پڑا۔ اسلامی خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ہزاروں عورتوں کو برہنہ کر کے جلوس نکالا گیا۔ جب سے مغربی پنجاب سے بھاگے ہوئے سکھ اتنی بڑی تعداد میں دہلی میں آنے شروع ہوئے تھے۔ اس وبا کا یہاں تک پہنچنا یقینی ہو گیا تھا۔ میرے پاکستان جانے میں ابھی چند ہفتے کی دیر تھی۔ اس لئے میں نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کو تو ہوائی جہاز سے کراچی بھیج دیا۔ اور خود خدا پر بھروسہ کر کے ٹھہرا رہا۔ ہوائی جہاز میں سامان تو زیادہ نہیں جا سکتا تھا۔ اس لئے میں نے ایک پوری ویگن بک کرا لی۔ مگر جس دن سامان چڑھانے والے تھے اُس دن سُنا کہ پاکستان جانے والی گاڑیوں پر حملے ہو رہے ہیں۔ اس لئے سامان گھر میں ہی پڑا رہا۔

پندرہ اگست کو آزادی کا جشن منایا گیا۔ مگر مجھے اس آزادی میں کیا دلچسپی تھی میں نے چھٹی منائی اور دن بھر لیٹا ڈان اور پاکستان ٹائمز کا مطالعہ کرتا رہا۔ دونوں میں ہندوستان کی اس نام نہاد آزادی کے چیتھڑے اڑائے گئے تھے۔ اور ثابت کیا گیا تھا کہ کس طرح ہندوؤں اور انگریزوں نے مل کر مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کی سازش کی تھی۔ وہ تو ہمارے قائدِ اعظم کا اعجاز تھا کہ پاکستان لے کر ہی رہے اگرچہ انگریزوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے دباؤ میں آکر امرتسر کو ہندوستان کے حوالے کر دیا۔ حالانکہ دُنیا جانتی ہے کہ امرتسر خالص اسلامی شہر ہے اور یہاں کی سنہری مسجد جو GOLDEN MOSQUE کے نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ . . . نہیں وہ تو گوردوارہ ہے اور GOLDEN TEMPLE کہلاتا ہے۔ سنہری مسجد تو دہلی میں ہے۔ سنہری مسجد ہی نہیں جامع مسجد بھی۔ لال قلعہ ہے۔ نظام الدین اولیا کا مزار۔ ہمایوں کا مقبرہ، صفدر جنگؒ کا مدرسہ۔ غرض چپے چپے پر اسلامی حکومت کے نشان پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی آج اُسی دہلی بلکہ کہنا چاہئے شاہجہان آباد پر ہندو سامراج کا جھنڈا بلند کیا جا رہا تھا۔ روئے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونناب بار . . . . اور یہ سوچ کر میرا دل بھر آیا کہ دہلی جو کبھی مسلمانوں کا پایۂ تخت تھا۔ تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ ہم سے چھین لیا گیا تھا۔ اور ہمیں مغربی پنجاب اور سندھ بلوچستان وغیرہ جیسے اُجڈ اور غیر متمدن علاقوں میں زبردستی بھیجا جا رہا ہے۔ جہاں کسی کو شُستہ اُردو زبان بھی بولنی نہیں آتی۔ جہاں شلوار جیسا مضحکہ خیز لباس پہنا جاتا ہے۔ جہاں ہلکی پھلکی پاؤ بھر میں چپاتیوں کی بجائے دو دو سیر کی نانیں کھائی جاتی ہیں۔ پھر میں نے اپنے دل کو مضبوط کر کے سمجھایا کہ قائدِ اعظم اور پاکستان کی خاطر یہ قربانی تو ہمیں دینی ہو گی۔ مگر پھر بھی دلّی کو چھوڑنے کے خیال سے دل مرجھایا ہی رہا . . . . شام کو جب میں باہر نکلا اور سردار جی نے دانت نکال کر کہا: کیوں بابو جی تم نے آج کچھ خوشی نہیں منائی۔ تو میرے جی میں آئی کہ اس کی داڑھی میں آگ لگا دوں۔ ہندوستان کی آزادی اور دل میں سکھ شاہی آخر رنگ لا کر ہی رہی۔ اب

مغربی پنجاب سے آئے ہوئے REEUGFS کی تعداد ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔ یہ لوگ دراصل پاکستان کو بدنام کرنے کے لئے اپنے گھر بار چھوڑ کر وہاں سے بھاگے تھے۔ یہاں آکر گلی کوچوں میں اپنا رونا روتے پھرتے تھے۔ کانگرسی پراپگینڈا مسلمانوں کے خلاف زوروں پر چل رہا تھا۔ اور اِس بار کانگرسیوں نے چال یہ چلی کہ بجائے کانگرس کا نام لینے کے راشٹریہ سیوک سنگھ اور شہیدی دل کے نام سے کام کر رہے تھے۔ حالانکہ دُنیا جانتی ہے کہ یہ ہندو چاہے کانگرسی ہوں یا مہا سبھائی۔ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ چاہے دنیا کو دھوکا دینے کی خاطر وہ بظاہر گاندھی اور جواہر لال نہرو کو گالیاں ہی کیوں نہ دیتے ہوں۔

ایک دن صبح کو خبر آئی کہ دہلی میں قتلِ عام شروع ہو گیا۔ قرول باغ میں مسلمانوں کے سینکڑوں گھر پھونک دیئے گئے۔ چاندنی چوک میں مسلمانوں کی دکانیں لٹ گئیں۔ اور ہزاروں کا صفایا ہو گیا۔ یہ تھا کانگرس کے ہندو راج کا نمونہ۔ خیر میں نے سوچا نئی دہلی تو مدت سے انگریزوں کا شہر رہا ہے۔ لارڈ مونٹ بیٹن یہاں رہتے ہیں۔ کمانڈر انچیف یہاں رہتا ہے۔ کم سے کم یہاں وہ مسلمانوں کے ساتھ ایسا ظلم نہ ہونے دیں گے۔ یہ سوچ کر میں دفتر کی طرف چلا۔ کیونکہ اُس دن مجھے پروڈینٹ فنڈ کا حساب کرنا تھا اور دراصل اسی لئے میں نے پاکستان جانے میں دیر کی تھی۔ ابھی گول مارکٹ کے پاس ہی پہنچا تھا کہ دفتر کا ایک ہندو بابو ملا۔ اُس نے کہا: "یہ کیا کر رہے ہو۔ جاؤ واپس جاؤ۔ باہر نہ نکلنا۔ کناٹ پلیس میں ہندو مسلمانوں کو مار رہے ہیں"۔ میں واپس بھاگ آیا۔

اپنے سکویر میں پہنچا ہی تھا کہ سردار جی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ کہنے لگے "شیخ جی! فکر نہ کرنا۔ جب تک ہم سلامت ہیں تمہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا"۔ میں نے سوچا اس کی داڑھی کے پیچھے کتنا مکر چھپا ہوا ہے۔ دل میں تو خوش ہے چلو اچھا ہوا مسلمانوں کا صفایا ہو رہا ہے.........................

.. مگر زبانی ہمدردی جتا کر مجھ پر احسان کر رہا ہے۔ بلکہ شاید مجھے چڑانے کے لئے یہ کہہ رہا ہے۔ کیونکہ سارے سکویر میں بلکہ اِس تمام سٹرک پر میں ہی تنہا مسلمان تھا۔

"پر مجھے اِن کافروں کا رحم و کرم نہیں چاہیئے" میں سوچتا اپنے کوارٹر میں آ گیا: "میں مارا بھی جاؤں گا تو دس بیس کو مار کر" سیدھا اپنے کمرے میں گیا جہاں پلنگ کے نیچے میری دونالی شکاری بندوق رکھی تھی۔ جب سے فساد شروع ہوئے تھے میں نے کارتوس اور گولیوں کا بھی کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ پر وہاں بندوق نہ ملی۔ سارا گھر چھان مارا۔ اُس کا کہیں پتہ نہ چلا۔

"کیوں حضور کیا ڈھونڈھ رہے ہیں آپ؟" یہ میرا وفادار ملازم محمد دین تھا۔

"میری بندوق کیا ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اُس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اُسے معلوم ہے۔ شاید اُس نے کہیں چھپائی ہے یا چرائی ہے۔

"بولتا کیوں نہیں؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

تب حقیقت معلوم ہوئی کہ محمد دین نے میری بندوق چرا کر اپنے چند دوستوں کو دیدی تھی۔ جو دریا گنج میں مسلمانوں کی حفاظت کے لئے ہتھیاروں کا ذخیرہ جمع کر رہے تھے۔

"کئی سو بندوقیں ہیں سرکار ہمارے پاس۔ سات مشین گنیں۔ دس ریوالور۔ اور ایک توپ۔ کافروں کو بھنگ کر رکھ دیں بھون کر"

میں نے کہا "دریا گنج میں میری بندوق سے کافروں کو بھون دیا گیا تو اِس میں میری حفاظت کیسے ہو گی۔ میں تو یہاں نہتا

کافروں کے نرغے میں پھنسا ہوا ہوں۔ یہاں مجھے بھون دیا گیا تو کون ذمے دار ہو گا؟ میں نے محمدو سے کہا وہ کسی طرح چھپتا چھپاتا دریا گنج تک جائے اور وہاں سے میری بندوق اور سو دو سو کارتوس لے کر آئے۔ وہ چلا تو گیا مگر مجھے یقین تھا کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

اب میں گھر میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ سامنے کارنس پر میری بیوی اور بچوں کی تصویریں خاموشی سے مجھے گھور رہی تھیں۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہ اب ان سے کبھی ملاقات ہو گی بھی یا نہیں لیکن پھر یہ خیال کر کے اطمینان بھی ہوا کہ کم سے کم وہ تو خیریت سے پاکستان پہنچ گئے تھے۔ کاش میں نے پروڈینٹ فنڈ کا لالچ نہ کیا ہوتا۔ اور پہلے ہی چلا گیا ہوتا۔ پر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ . . . . .

'ست سری اکال' . . . 'ہر ہر مہادیو'

دور سے آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ یہ بلوائی تھے۔ یہ میری موت کے ہرکارے تھے میں نے زخمی ہرن کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا جو گولی کھا چکا ہو اور جس کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوں۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ کوارٹر کے کواڑ پتلی لکڑی کے تھے۔ اور ان میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ اگر میں بند ہو کر بیٹھ بھی رہا تو دو منٹ میں بلوائی کواڑ توڑ کر اندر آ سکتے تھے۔ 'ست سری اکال' 'ہر ہر مہادیو'

آوازیں اور قریب آ رہی تھیں۔ میری موت قریب آ رہی تھی۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سردار جی داخل ہوئے۔ 'شیخ جی تم ہمارے کوارٹر میں آ جاؤ۔ جلدی کرو' بغیر سوچے سمجھے اگلے لمحے میں سردار جی کے برامدے کی چِقوں کے پیچھے تھا۔ موت کی گولی سَن سے میرے سر پر سے گذر گئی۔ کیونکہ میں وہاں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک لاری آ کر رُکی اور اُس میں سے دس پندرہ نوجوان اُترے۔ اُن کے لیڈر کے ہاتھ میں ایک ٹائپ کی ہوئی فہرست تھی۔ 'کوارٹر نمبر ۸ شیخ برہان الدین' اُس نے کاغذ پر نظر ڈالتے ہوئے حکم دیا۔ اور یہ غول کا غول میرے کوارٹر پر ٹوٹ پڑا۔ میری گرہستی کی دنیا میری آنکھوں کے سامنے اُجڑ گئی۔ لُٹ گئی۔ کرسیاں، میزیں۔ صندوق، تصویریں۔ کتابیں۔ دریاں۔ قالین، یہاں تک کہ میلے کپڑے۔ ہر چیز لاری پر پہنچا دی گئی۔

ڈاکو!

لٹیرے!!

قزاق!!!

اور یہ سردار جی جو بظاہر ہمدردی جتا کر مجھے یہاں لے آئے تھے۔ یہ کون سے کم لٹیرے تھے۔

باہر جا کر بلوائیوں سے کہنے لگے 'ٹھہریئے صاحب اس گھر پر ہمارا حق زیادہ ہے ہمیں بھی اِس لوٹ میں سے حصّہ ملنا چاہیئے' اور یہ کہہ کر انہوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو اِشارہ کیا۔ اور وہ بھی لوٹ میں شامل ہو گئے۔ کوئی میری پتلون اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ کوئی سوٹ کیس۔ کوئی میری بیوی اور بچوں کی تصویریں ہی لا رہا تھا۔ اور یہ سب مالِ غنیمت سیدھا اندر کے کمرے میں جا رہا تھا۔

اچھا رے سردار! زندہ رہا تو تجھ سے بھی سمجھوں گا۔ پر اِس وقت تو میں چوں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ فسادی جو سب کے سب مسلح تھے مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھے۔ اگر انہیں کہیں معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں . . . . .

'ادھر اندر آؤ جی تسی'

دفعتاً میں نے دیکھا کہ سردار جی ہاتھ میں ننگی کرپان لئے مجھے اندر بلا رہے ہیں میں نے ایک بار اُس ڈھیل چہرے کو دیکھا

جو لوٹ مار کی بھاگ دوڑ سے اور بھی خوفناک ہو گیا تھا۔ اور پھر کرپان کو جس کی چمکیلی دھار مجھے دعوتِ موت دے رہی تھی۔ بحث کرنے کا موقعہ نہیں تھا۔ اگر میں کچھ بھی بولا اور بلوائیوں نے سن لیا تو ایک گولی میرے سینے کے پار ہو گی۔ کرپان اور بندوق میں سے ایک کو پسند کرنا تھا۔ میں نے سوچا ان وحشی بندوق باز بلوائیوں سے کرپان والا بڈھا بہتر ہے۔ میں کمرے میں چلا گیا۔ جھجکتا ہوا۔ خاموش۔

'اچھے نہیں جی اوس اندر آؤ'

میں اور اندر کے کمرے میں چلا گیا۔ جیسے بکرا قصائی کے ساتھ ذبح خانے میں داخل ہوتا ہے۔ میری آنکھیں کرپان کی دھار سے چندھیاتی جا رہی تھیں۔

'یہ لو جی اپنی چیزیں سنبھال لو' یہ کہہ کر سردار جی نے وہ تمام سامان میرے سامنے رکھ دیا جو انہوں نے اور ان کے بچوں نے جھوٹ موٹ کی لوٹ میں حاصل کیا تھا۔ سردارنی بولیں۔ 'بیٹا ہم تو تیرا کچھ بھی سامان نہ بچا سکے ہیں' کوئی جواب نہ دے سکا۔

اتنے میں باہر سے کچھ اونچی آوازیں سنائی دیں۔ بلوائی میری لوہے کی الماری کو باہر نکال رہے تھے۔ اور اس کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

'اس کی چابیاں مل جائیں تو سب معاملہ آسان ہو جاتا'

'چابیاں تو اس کی پاکستان میں ملیں گی۔ بھاگ گیا نا ڈرپوک کہیں کا۔ مسلمان کا بچہ تھا تو مقابلہ کرتا' ننھی موہنی میری بیوی کے چند ریشمی قمیض اور غرارے نہ جانے کس سے چھین کر لا رہی تھی کہ اس نے پہنا۔ وہ بولی 'تم بڑے بہادر ہو! شیخ جی ڈرپوک کیوں ہونے لگے۔ وہ تو کوئی بھی پاکستان نہیں گئے'

'نہیں گیا تو یہاں سے کہیں منہ کالا کر گیا'

'منہ کالا کیوں کرتے۔ وہ تو ہمارے ہاں' . . . میرے دل کی حرکت ایک لمحے کے لئے بند ہو گئی۔ بچی اپنی غلطی کا احساس کرتے ہی خاموش ہو گئی۔ مگر ان بلوائیوں کے لئے یہی کافی تھا۔

سردار جی پر جیسے خون سوار ہو گیا۔ انہوں نے مجھے اندر کے کمرے میں بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اپنے بیٹے کے ہاتھ میں کرپان دی۔ اور خود باہر نکل گئے۔ باہر کیا ہوا یہ مجھے ٹھیک طرح معلوم نہ ہوا۔ تھپڑوں کی آواز۔ پھر موہنی کے رونے کی آواز۔ اور اس کے بعد سردار جی کی اونچی آواز پنجابی گالیاں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کسے گالیاں دے رہے ہیں اور کیوں۔ میں چاروں طرف سے بند تھا۔ اس لئے ٹھیک سنائی نہیں دیتا تھا۔

اور پھر ——— گولی چلنے کی آواز ——— سردارنی کی چیخ۔

لاری روانہ ہونے کی گڑگڑاہٹ۔ اور پھر تمام سکویر پر جیسے سناٹا چھا گیا۔ جب مجھے کمرے کی قید سے نکالا گیا تو سردار جی پلنگ پر پڑے تھے۔ اور ان کے سینے کے قریب سفید قمیض خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ ان کا لڑکا ہمسائے کے گھر سے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر رہا تھا۔

'سردار جی! یہ تم نے کیا کیا؟' میری زبان سے نا جانے یہ الفاظ کیسے نکلے۔ میں مبہوت تھا۔ میری برسوں کی دنیا، خیالات، محسوسات، تعصبات کی دنیا کھنڈر ہو گئی تھی۔

'سردار جی! یہ تم نے کیا کیا؟'

'مجھے قرضہ اتارنا تھا بیٹا!'

'قرضہ؟'

'ہاں، راولپنڈی میں تمہارے جیسے ہی ایک مسلمان نے اپنی جان دے کر میری اور میرے گھر والوں کی جان اور عزت بچائی تھی۔'

'اپنی جان دے کر؟ میرے جیسے مسلمان نوجوان نے؟'

'کیا نام تھا اُس کا سردار جی؟'

'غلام رسول'

'غلام رسول' اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے ساتھ قسمت نے دھوکا کیا ہو۔ دیوار پر لٹکے ہوئے گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کئے۔ ایک ...... دو ...... تین ..... چار ..... پانچ۔

سردار جی کی نگاہیں گھنٹے کی طرف پھر گئیں۔ جیسے مسکرا رہے ہوں۔ اور مجھے اپنے دادا یاد آ گئے جن کی کئی فٹ لمبی داڑھی تھی۔ سردار جی کی شکل اُن سے کتنی ملتی تھی۔ چھ .... سات .... آٹھ ...... نو ......

جیسے وہ ہنس رہے ہوں۔ اُن کی سفید داڑھی اور سر کے کھلے ہوئے بالوں نے چہرے کے گرد ایک نورانی ہالہ سا بنایا ہوا تھا دس ...... گیارہ ...... بارہ۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں 'جی اساں دے ہاں تو چوبیس گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں۔'

پھر وہ نگاہیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

اور میرے کانوں میں غلام رسول کی آواز دور سے بہت دور سے آئی 'میں کہتا نہ تھا کہ بارہ بجے ان سکھوں کی عقل غائب ہو جاتی ہے۔ اور یہ کوئی نہ کوئی حماقت کر بیٹھتے ہیں۔ اب ان سردار جی ہی کو دیکھو نا ——— ایک مسلمان کی خاطر اپنی جان دیدی۔'

پر یہ سردار جی نہیں مرے تھے۔ میں مرا تھا۔ پُرانا میں!

ایک لڑکی

خواجہ احمد عباس کی دس کہانیوں کا مجموعہ

احمد عباس کے افسانوں میں آپ کو نہ تکلف ملے گا اور نہ تخیّل پرستی

بلکہ

عمیق خلوص، اور ٹھوس حقیقت پسندی

تازہ ایڈیشن۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

مکتبہ اردو لاہور

سعادت حسن منٹو

بابو گوپی ناتھ

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دنوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار اخبار ایڈٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا۔ میں اس وقت لیڈ لکھ رہا تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باآواز بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا۔

”منٹو صاحب! بابو گوپی ناتھ سے ملیے۔“

میں نے اُٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ ”بابو گوپی ناتھ تم ہندوستان کے نمبر وَن رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے لوگوں کا۔ ایسی ایسی کنٹی نیوٹی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلہ لکھا تھا آپ نے منٹو صاحب مس خورشید نے کار خریدی — اللہ بڑا کارساز ہے۔ کیوں بابو گوپی ناتھ ہے نا اینٹی کی پینٹی پو؟“

عبدالرحیم سینڈو کا باتیں کرنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ کنٹی نیوٹی، دھڑن تختہ، اور اینٹی کی پینٹی پو ایسے الفاظ اس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا جو بہت مرعوب نظر آرہا تھا۔ ”آپ ہیں گوپی ناتھ — بڑے خانہ خراب — لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبئی تشریف لائے ہیں۔ ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے۔“

بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے اپنے تعارف کو ناکافی سمجھ کر کہا۔ ”نمبر وَن بیوقوف ہو سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ انہیں مسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں۔ میں صرف باتیں کرکے ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں۔ بس منٹو صاحب یہ سمجھ لیجئے کہ بڑے اینٹی فلوجسٹین قسم کے آدمی ہیں — آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر تشریف لایئے۔“

بابو گوپی ناتھ نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا چونک کر کہا۔ ”ہاں ہاں ضرور تشریف لایئے منٹو صاحب۔“ پھر سینڈو سے پوچھا۔ ”کیوں سینڈو کیا آپ کچھ اس کا شغل کرتے ہیں؟“

عبدالرحیم سینڈو نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ”اجی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں — تو منٹو صاحب آج شام کو ضرور آیئے گا — میں نے بھی پینی شروع کر دی ہے۔ اس لئے کہ مفت ملتی ہے۔“

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتہ بتا دیا۔ جہاں میں حسب وعدہ شام کو چھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔ تین کمروں کا صاف ستھرا فلیٹ تھا۔ جس میں بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں۔ جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔

ایک تھا غفار سائیں۔ تہمد پوش۔ پنجاب کا ٹھیٹ سائیں۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا۔ سینڈو نے اُس کے بارے میں کہا

"آپ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوائزر ہیں — میرا مطلب سمجھ جائیے آپ۔ ہر آدمی جسکی ناک بہتی ہو یا مُنہ میں سے لعاب نکلتا ہو۔ پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے۔ یہ بھی بس پہنچے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہوئے ہیں کیونکہ انہیں وہاں کوئی اور بے وقوف ملنے کی امید نہ تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور سکاچ وسکی پی کر دعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو......"

غفار سائیں یہ سُنکر مسکراتا رہا۔

دُوسرے مرد کا نام تھا غلام علی۔ لمبا تڑنگا جوان، کسرتی بدن، منہ پر چیچک کے داغ۔ اس کے متعلق سینڈو نے کہا "یہ میرا شاگرد ہے۔ اپنے اُستاد کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور کی ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہوگئی۔ بڑی بڑی کنٹی نیوٹیاں ملائی گئیں اس کو پھانسنے کے لئے مگر اس نے کہا ڈو آر ڈائی۔ میں لنگوٹ کا پکّار ہونگا۔ ایک تکیئے میں پیتے ہوئے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہوگئی۔ بس اُسی دن سے یہ اُس کے ساتھ چپٹا ہوا ہے۔ ہر روز کریون اے کا ایک ڈبہ اور کھانا پینا مقرّر ہے"۔

یہ سُنکر غلام علی بھی مُسکراتا رہا۔

گول چہرے والی ایک سُرخ و سفید تندرست عورت تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی کشمیری کبوتری ہے جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا۔ بہُت صاف ستھری عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے ایسا لگتا تھا کٹے ہوئے ہیں مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں، چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد الّڑ اور ناتجربہ کار ہے۔ سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا "زینت بیگم — بابو صاحب پیار سے زینو کہتے ہیں۔ ایک بڑی خرانٹ نائکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لاہور لے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اڑے۔ مقدمہ بازی ہوئی۔ تقریباً دو مہینے تک عیش کرتی رہی۔ آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اُسے یہاں لے آئے — دھڑن تختہ!"

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سگرٹ پی رہی تھی آنکھیں سُرخ تھیں جن سے کافی بے حیائی مترشح تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اسکی طرف اشارہ کیا اور سینڈو سے کہا "ان کے متعلق بھی کچھ ہو جائے"۔

سینڈو نے اس عورت کی ران پر زور سے ہاتھ مارا اور کہا "جناب یہ ہے ٹین پٹوٹی۔ فل فل فوٹی۔ مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم — آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں۔ سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہُوا دو برس میں ہی میرا دھڑن تختہ کر کے رکھ دیا۔ میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوا لیا ہے تاکہ میرا دل لگا رہے اس کو بھی ایک ڈبہ کریون اے کا راشن میں ملتا ہے۔ ہر روز شام کو ڈھائی روپے کا مورفیا کا انجکشن لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے مگر ویسے ٹِٹ فار ٹیٹ قسم کی عورت ہے"۔

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا "بکواس نہ کر" اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی۔ سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیئے۔ میں نے کہا "چھوڑو یار آؤ کچھ اور باتیں کریں"۔

سینڈو چلایا "وسکی اینڈ سوڈا بوائے — وسکی اینڈ سوڈا — بابو گوپی ناتھ لگاؤ ہاتھ سبز سے کو"۔ بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک پلندہ نکالا اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لے کر اسکی طرف دیکھا اور اُسے کھڑکھڑا کر کہا "او گاڈ — او میرے رب العالمین وہ دن کب آئیگا جب میں لب لگا کر سو سو کے نوٹ یوں نکالا کروں گا — جاؤ بھئی غلام علی دو بوتل جانی واکر سٹل گوئنگ سٹرانگ لے آؤ"۔

بوتلیں آئیں تو سب نے پینا شروع کی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے جاری رہا۔ اس دوران میں سب سے زیادہ باتیں حسب معمول عبدالرحیم

سینڈو نے کہیں۔ پہلا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے چلایا!
"دھڑن تختہ۔ منٹو صاحب وسکی ہو تو ایسی ہو۔ حلق سے اُتر کر پیٹ میں انقلاب زندہ باد لکھتی چلی گئی ہے ——— جیو بابو گوپی ناتھ۔ جیو ——"

بابو گوپی ناتھ بیچارہ خاموش رہا کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کے ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی کوئی رائے نہیں۔ دوسرا جو بھی کہے مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا۔ جسے وہ بقول سینڈو کے اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ لاہور میں اسکا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ کہ وہ کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہے چنانچہ میں نے اُسے ایک بار کہا۔ "بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

وہ چونک پڑا "جی ۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔ نہیں تو"۔ یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی "ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں ——— اور ہمیں سوچ کیا ہو گی"۔

سینڈو نے کہا "بڑے خانہ خراب ہیں یہ منٹو صاحب بڑے خانہ خراب ہیں ——— لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جس کے ساتھ بابو صاحب کی کشتی نیوٹنی نہ رہ چکی ہو ۔۔۔۔۔"

بابو گوپی ناتھ نے یہ سنکر بڑے بھونڈے انکسار کے ساتھ کہا "اب کمر میں وہ دم نہیں رہا منٹو صاحب"۔ اس کے بعد واہیات گفتگو شروع ہو گئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی۔ کون نٹنی تھی۔ کون کس کی نوچی تھی۔ نتھنی اتارنے پر بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار سینڈو۔ غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی، بحیثیت لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں۔ مطالب تو میں سمجھتا رہا مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اُسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وسکی کا اس نے ایک گلاس بھی پیا۔ بغیر کسی دلچسپی کے سگرٹ پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ اُسے تمباکو اور اس کے دھوئیں سے کوئی رغبت نہیں لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سگرٹ اسی نے پئے۔ بابو گوپی ناتھ سے اُسے محبت تھی۔ اس کا پتہ مجھے کسی بات سے بھی نہیں ملا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا۔ کیونکہ صرف زینت کی آسایش کے لئے ہر سامان مہیا تھا۔ لیکن ایک بات مجھے بہت محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا کھچاؤ تھا۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کی بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار ڈاکٹر مجید کے ہاں چلی گئی۔ کیونکہ اُسے مورفیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین پگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اُٹھا کر قالین پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لئے بھیج دیا گیا سینڈو نے جب اپنی دلچسپ بکواس کچھ عرصہ کے لئے بند کی تو بابو گوپی ناتھ نے جو اب نشے میں تھا۔ زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا "منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا "بڑا نیک خیال ہے"۔ بابو گوپی ناتھ خوش ہو گیا "منٹو صاحب ہے بھی بڑی نیک لوگ۔ خدا کی قسم نہ زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا جانِ من مکان بنوا دوں ——— جواب کیا دیا معلوم ہے آپ کو؟ ——— کیا کرونگی مکان لے کر ۔۔۔۔۔ میرا اور کون ہے؟ ۔۔۔۔۔ منٹو صاحب موٹر

کتنے میں آجائیگی؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم نہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا۔ "کیا بات کرتے ہیں آپ منٹو صاحب۔ آپ کو اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو۔ کل چلئے میرے ساتھ۔ زینو کے لئے موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبئی میں موٹر ہونی ہی چاہیئے۔"

زینت کا چہرہ ردِ عمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ ہمہ تن جذبات ہو کر اس نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں ۔۔۔ لیکن آپ مجھے بتایئے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس ۔۔۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی تو معاف کر دیجیئگا ۔۔۔ بہت گنہگار آدمی ہوں ۔۔۔ وسکی منگاؤں آپ کے لئے اور؟"

میں نے کہا "نہیں نہیں بہت پی چکے ہیں۔"

وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا "اور پیجیئے منٹو صاحب" یہ کہہ کر اس نے جیب سے سو سو کے نوٹوں کا پلندہ نکالا۔ ایک نوٹ جدا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اس کے ہاتھ سے لے لئے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دیئے "سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا اس کا کیا ہوا؟" مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی بابو گوپی ناتھ سے کتنے آدمی جونک کی طرح اس غریب سے چمٹے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا۔ "منٹو صاحب اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ یا تو غلام علی کی جیب میں سے گر پڑیگا یا ......" بابو گوپی ناتھ نے پورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دکھ کے ساتھ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی حرامزادے نے اس کی جیب میں سے سو روپے نکال لئے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ سو روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکالا اور غلام علی کو دے کر کہا "لو۔ جلدی کھانا لے کر آؤ۔" پانچ چھ ملاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا۔ پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ تھے۔

پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چغد ہے۔ غلط ثابت ہوا۔ اس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو، غفار سائیں، غلام علی اور سردار وغیرہ جو اس کے مصاحب بنے ہوئے تھے مطلبی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھڑکیاں گالیاں سب سنتا تھا لیکن کبھی غصے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب میں نے آج تک کسی کا مشورہ رد نہیں کیا۔ جب بھی مجھے کوئی رائے دیتا ہے میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں لیکن میں انہیں عقلمند سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو انہوں نے میری ایسی بیوقوفی کو شناخت کر لیا جس سے ان کا الو سیدھا ہو سکے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے۔ جب میری دولت ختم ہو جائیگی تو میں کسی تکیے میں جا بیٹھونگا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار یہی دو جگہیں ہیں۔ یہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائیگا۔ اس لئے کہ جیب خالی ہونے والی ہے لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں کسی ایک کے مزار پر چلا جاؤنگا۔"

میں نے ان سے پوچھا "رنڈی کے کوٹھے اور تکیے آپ کو کیوں پسند ہیں؟"

کچھ دیر سوچ کر اس نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اس کے لئے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے؟"

میں نے ایک اور سوال کیا۔ "آپ کو طوائفوں کا گانا سننے کا شوق ہے۔ کیا آپ موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں؟" اس نے جواب دیا۔ "بالکل نہیں، اور یہ اچھا ہے۔ کیونکہ میں کن سری سے کن سری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں۔ منٹو صاحب گانے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن جیب میں سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزہ آتا ہے۔ نوٹ نکالا اسکو دکھایا۔ وہ اسے لینے کے لئے ایک ادا کے ساتھ اُٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ اپنی جراب میں اڑس لیا۔ اس نے جھک کر باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو بہت پسند ہیں۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں۔"

بابو گوپی ناتھ کا میں شجرۂ نسب تو نہیں جانتا۔ لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بنئے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اسے دس لاکھ روپے کی جائداد ملی۔ جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اُڑانا شروع کر دی۔ بمبئی آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا۔ اس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو سوا سو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔ زینو کے لئے اس نے فیئٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا۔ لیکن شاید تین ہزار میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا۔ لیکن وہ بھی لنگڑے ٹائپ کا۔ بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی تھی لیکن اسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دوسروں کی نسبت میرا زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ جائیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے کچھ اپنی جدت طراز گائکی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت۔ لیکن اسکی زندگی کا ایک حصہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ تین باہم سگی بہنوں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے پہلے اس کا تعلق انکی ماں سے تھا۔ یہ بھی بہت کم مشہور ہے کہ اسکو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصہ میں مر گئی تھی اس لئے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں کے سے غمزے اور عشوے نہیں تھے۔ لیکن یہ تو خیر ہر شخص جو محمد شفیق طوسی سے واقفیت رکھتا ہے، جانتا ہے چالیس برس کی عمر میں یہ اس زمانے کی عمر ہے، سینکڑوں طوائفوں نے اُسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا اس نے پہنا۔ عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا، نفیس سے نفیس موٹر رکھی۔ مگر اس نے اپنی گرہ سے کسی طوائف پر ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی۔

عورتوں کے لئے خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں محمد شفیق کے گانے میں، اسکی بذلہ سنج طبیعت میں جس میں میراثیوں کے مزاج کی جھلک تھی بہت ہی کشش تھی وہ کوشش کے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ میں نے جب اُسے ہنس ہنس کر زینت سے باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اس لئے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتہً یہاں پہنچا کیسے صرف سینڈو اسے جانتا تھا۔ مگر اُسکی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اُسے لایا تھا۔ دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی۔

بابو گوپی ناتھ ایک کرسی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا وہ سگرٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔

محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سُنا رہا تھا جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا "بسم اللہ... بسم اللہ... بسم اللہ... آپ کا گذر بھی اس وادی میں ہوتا ہے؟" سینڈو نے کہا "تشریف لائیے یہاں عزرائیل صاحب ——— دھڑن تختہ!"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

.. تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکرا کر کچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اِس فن میں بالکل کوری تھی لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار اس نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے کھلنے اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں مَیں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسار طبیعت کی عورت تھی۔ کم گو، سادہ لوح، صاف ستھری

شفیق کے ساتھ مجھے اسکی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اصل تو اس میں بھونڈا پن تھا۔ اس کے علاوہ کچھ یوں کہیے کہ اس بات کا اس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی شفیق، اور سینڈو ٹھاکر یا ہر گئے تو میں نے بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا کیونکہ فوراً اُسکی آنکھوں پہ موٹے موٹے آنسو آ گئے اور روتی روتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اُٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے چلا گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے کچھ کہا۔ لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا۔ "آئیے منٹو صاحب" کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

زینت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہُوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ دونوں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بابو گوپی ناتھ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا "منٹو صاحب مجھے اِس عورت کے ساتھ بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے۔ میں حضرت غوثِ اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اسکی دوسری بہنیں، میرا مطلب ہے اسی پیشے کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لوٹ کر کھاتی رہیں۔ لیکن اس نے ایک زائد پیسہ کبھی مجھ سے نہ لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے پاس ہفتوں پڑا رہا۔ تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گرو رکھ کر گذارہ کیا.... میں جیسا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں۔ بہت جلد اس دُنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسکی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اسکو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کو دیکھو جو کچھ وہ کرتی ہیں سیکھو۔ میں آج دولتمند ہوں کل مجھے بھکاری ہونا ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولتمند کافی نہیں میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسو گی تو کام نہیں چلیگا۔ لیکن منٹو صاحب اس نے میری ایک نہ سُنی۔ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا بمبے لے جاؤ اسے۔ مجھے معلوم تھا اس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبے میں اسکی دو جاننے والی طوائفیں ایکٹرس بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا نہیں ٹھیک ہے ——— دو مہینے ہو گئے ہیں۔ اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بلایا ہے کہ اسے سب گُن سکھائے۔ غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کو یہ خیال تھا کہ بابو کی بے عزتی ہو گی۔ میں نے کہا تم چھوڑو اسکو۔ بمبے بہت بڑا شہر ہے لاکھوں رئیس ہیں۔ میں نے تمھیں موٹر بھی لے دی ہے۔ کوئی اچھا سا آدمی تلاش کر لو..... منٹو صاحب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میری دلی خواہش یہ ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ اچھی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی دس ہزار روپیہ جمع کرانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم

ہے کہ دس دنوں کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہوئی سردار اسکی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لے گی ۔۔۔ آپ بھی اسے بہو بیٹے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے۔ سردار اسے ہر روز اپولو بندر لے جاتی ہے لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی سینڈو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کے متعلق؟

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن بابو گوپی ناتھ نے خود ہی کہا "اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہے خوبصورت بھی ہے ۔۔ کیوں زینو جانی ۔۔ پسند ہے تمہیں؟"

زینو خاموش رہی۔

بابو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بمبے لانے کی غرض و غایت معلوم ہوئی تو میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دور کر دی۔ بابو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت بمبے میں کسی اچھے مالدار آدمی کی داشتہ بن جائے۔ یا ایسے طریقے سیکھ جائے جن سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو جائے۔ زینت سے اگر چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہوتا تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی۔ بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا لیکن چونکہ اسکی نیک نیت تھی اس لئے اس نے زینت کے مستقبل کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کو سٹار بنانے کے لئے اس نے کئی جعلی ڈائرکٹروں کی دعوتیں کیں گھر میں ٹیلیفون لگوا دیا مگر اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوسی قریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں۔ لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا "یہ شفیق صاحب تو خالی خولی جنٹلمین ہی نکلے ۔۔۔ ٹھسہ دیکھئے لیکن بیچاری زینت سے چار چادریں چھ تکئے کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر کے لے گئے۔ سنا ہے آج کل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں"۔

یہ درست تھا۔ الماس نذیر جان پٹیالے والے کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی۔ اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لئے تھے مجھے معلوم ہے۔ الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑ کر اس نے زہر کھا لیا تھا۔

محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلیفون کیا کہ اسے ڈھونڈ کر لائیے۔ میں نے اسکی تلاش کیا لیکن کسی کو کچھ پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جب میں نے اس سے کہا زینت بلاتی ہے تو اس نے جواب دیا "مجھے یہ پیغام اور ذریعے سے بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے آج کل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے لیکن افسوس کہ وہ بے حد شریف ہے۔ ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں"

شفیق سے جب مایوسی ہوئی تو زینت نے سردار کے ساتھ پھر اپولو بندر جانا شروع کر دیا۔ پندرہ دنوں میں بڑی مشکلوں سے کئی گیلن پٹرول پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو گوپی ناتھ نے سمجھا حالات امید افزا ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک آدمی نے جو ریشمی کپڑوں کی مل کا مالک تھا۔ زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کرونگا۔ ایک مہینہ گذر گیا لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز جانے کس کام سے میں مال روڈ سے جا رہا تھا کہ مجھے نسٹ ہاتھ کے پاس زینت کی کار کھڑی دکھائی دی۔ پچھلی نشست

یہ محمد یٰسین بیٹھا تھا۔ نگینہ ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟"

یٰسین مسکرایا۔ "تم جانتے ہو موٹر والی کو؟"

میں نے کہا "جانتا ہوں"۔

"تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی ——— اچھی لڑکی ہے"۔ یٰسین نے مجھے آنکھ ماری۔ میں مسکرا دیا۔

اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ زینت سے یٰسین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام کو اپولو بندر سے ایک آدمی لے کر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں وہ آدمی تو کسی بات پر جھگڑ کر نگینہ ہوٹل سے چلا گیا لیکن ہوٹل کے مالک کے ساتھ زینت کی دوستی ہو گئی۔ بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا۔ کیونکہ اس پندرہ دن کی دوستی میں یٰسین نے زینت کو بہت سی قیمتی ساڑھیاں لے دی تھیں بابو گوپی ناتھ اب یہ سوچ رہا تھا کہ کچھ دن اور گذر جائیں زینت اور یٰسین کی دوستی پکی ہو جائے تو وہ لاہور واپس چلا جائے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کمرہ کرایہ پر لیا۔ اسکی جوان لڑکی موریل سے یٰسین کی آنکھ لڑ گئی۔ چنانچہ زینت بیچاری ہوٹل میں بیٹھی رہتی اور یٰسین اُسکی موٹر میں صبح شام موریل کو گھماتا رہتا۔ بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر بہت دکھ ہوا اس نے مجھ سے کہا۔ "منٹو صاحب یہ لوگ کیسے ہیں۔ بھئی دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو۔ لیکن زینت بھی عجیب ہے۔ اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر منہ سے اتنا بھی نہیں کہتی ——— میاں تمہیں اگر اس کرسچین لڑکی سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موٹر کا بندوبست کرو۔ میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو؟ میاں کیا کروں منٹو صاحب؛ بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیے اُسے"۔

یٰسین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔

بہت دنوں تک کوئی نئی بات ظہور پذیر نہ ہوئی۔ ایک دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپی ناتھ غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے روپے کا بندوبست کرنے کیونکہ پچاس ہزار ختم ہو چکے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اُسے چند مکان بیچنے ہیں۔

سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی سینڈو کو پاسن کی۔ دونوں نے متحدہ کوشش کی اور ہر روز دو تین آدمی پھانس کر لے آتے۔ زینت سے کہا گیا کہ بابو گوپی ناتھ واپس نہیں آئے گا اس لئے اسے اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ سو سوا سو روپے روز کے ہو جاتے جن میں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار دبا لیتے۔ میں نے ایک دن زینت سے کہا "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

اُس نے بڑے الہڑپن سے کہا "مجھے کچھ معلوم نہیں بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں"۔ جی چاہا کہ دیر تک پاس بیٹھ کر اسے سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو ٹھیک نہیں۔ سینڈو اور سردار اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے تمہیں بیچ بھی ڈالیں گے مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت اُکتا دینے والی حد تک بے سمجھ، بے امنگ اور بے جان عورت تھی۔ اس کم بخت کو اپنی زندگی کی قدر و قیمت ہی معلوم نہیں تھی۔ جسم بیچتی مگر اس میں بیچنے والیوں کا سا کوئی انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اُسے دیکھ کر۔ سگریٹ سے۔ شراب سے۔ کھانے سے۔ گھر سے ٹیلی فون سے۔ حتیٰ کہ اس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ ماہم گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈو اور سردار کے مشورے سے

زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اُسے پورا پتہ بتا دیا۔ اس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے بتا دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کروا رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ ابکی دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور میں چھوڑ آیا تھا۔ ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا کہ میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔

قریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ پالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا "سینڈو!"

سینڈو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ "دھڑن تختہ!"

بابو گوپی ناتھ نے اس سے کہا "آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو۔" لیکن سینڈو نے کہا۔ "آپ ٹیکسی کو ایک طرف کھڑا کیجئے مجھے آپ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں۔"

ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اُسے کچھ دُور لے گیا۔ دیر تک ان میں باتیں ہوتی رہیں۔ بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اُس نے کہا "واپس چلو۔"

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ جب ہم دادر کے پاس پہنچے تو اس نے کہا "منٹو صاحب زینو کی شادی ہونے والی ہے۔" میں نے حیرت سے پوچھا "کس سے؟"

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا "حیدر آباد سندھ کا ایک دولتمند زمیندار ہے خدا کرے وہ خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہے۔ جو میں وقت پر آ پہنچا جو روپے میرے پاس ہیں ان سے زینو کا جہیز بن جائیگا —— کیوں کیا خیال ہے آپ کا؟" میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ حیدر آباد سندھ کا متمول زمیندار ہے جو حیدر آباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز یہ اپنے پرانے مربی غلام حسین (یہ اس زمیندار کا نام تھا) کو ساتھ لے کر آیا۔ زینت نے خوب خاطر مدارت کی۔ غلام حسین کی پُرزور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل ——— "نکتہ چیں ہے غمِ دل اسکو سنائے نہ بنے" گا کر سنائی۔ غلام حسین سو جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ پکا کر دیا۔ شادی طے ہو گئی ——

بابو گوپی ناتھ بہت خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ وہاں غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کی خوشی دوبالا ہو گئی۔ مجھ سے اس نے کہا "منٹو صاحب خوبصورت جوان اور بڑا لائق آدمی ہے میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخش کے حضور میں دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی۔ بھگوان کرے دونوں خوش رہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کا زیور اور دو ہزار کے کپڑے بنوا دیئے پانچ ہزار نقد دیئے۔

شادی باندرہ کے بنگلے میں ہوئی مندرجہ ذیل آدمی شریک ہوئے۔

محمد شفیق طوسی۔ محمد یٰسین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل۔ سینڈو۔ میوزک ٹیچر۔ میں اور بابو گوپی ناتھ۔ دلہن کی طرف سے سینڈو وکیل تھا۔

ایجاب و قبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا۔ "دھڑن تختہ!"

غلام حسین سرج کا نیلا سوٹ پہنے تھا۔ میں نے اسکو مبارکباد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ میں نے اُسے پہلی دفعہ دیکھا۔ کافی وجیہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اُس کے مقابلے میں چھوٹی سی بٹیر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں میں خوردونوش کا جو سامان ہوتا ہے وہ بھی بابو گوپی ناتھ نے کیا۔ دعوت سے جب سب لوگ فارغ ہوئے تو بابو گوپی ناتھ نے ہاتھ دھلوائے۔ جب میں ہاتھ دھلانے کے لئے آیا تو اس نے مجھے بچوں کے انداز میں کہا۔ "منٹو صاحب آپ ذرا اندر آیئے اور دیکھئے زینو دلہن کے لباس میں کیسی لگتی ہے؟"

میں پردہ ہٹا کر کمرہ کے اندر داخل ہوا۔ زینت سرخ زربفت کی شلوار اور کرتا پہنے تھی۔ دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا۔ حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک بہت بُری لگتی ہے۔ مگر زینو کے ہونٹ سجے ہوئے تھے۔ اُس نے شرما کر مجھے آداب کیا تو بہت پیاری لگی۔ لیکن جب میں نے دوسرے کونے میں مسہری دیکھی جس پر پھول ہی پھول تھے تو بے اختیار مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے زینت سے کہا "یہ کیا مسخرہ پن ہے؟"

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا۔ "آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان"۔ اُس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

مجھے غلطی کا احساس بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر آیا۔ بڑے پیار کے ساتھ اُس نے زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دُکھ کے ساتھ کہا۔ "منٹو صاحب میں سمجھا تھا آپ بڑے سمجھدار اور لائق آدمی ہیں۔ زینو کا مذاق اُڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ تو لیا ہوتا"۔

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اُسے مجھ سے تھی زخمی نظر آئی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں۔ اُس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔ "خدا تمہیں خوش رکھے زینو۔ خدا تمہیں خوش رکھے"۔

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی۔ بہت ہی دُکھ بھری ملامت — اور چلا گیا۔

منٹو کے افسانے

سماج کے چہرے کی چھائیاں اور اس کے مہاسے دُور کرنے کیلئے اِن میں آپ کوئی نسخہ نہیں پائیں گے۔ منٹو فسٹ ایڈ کا ڈاکٹر نہیں۔ منٹو کے افسانے منٹو کا دماغی عکس پیش کرتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کا ہاضمہ درست کرنے کے لئے چورن کی پڑیاں پیش نہیں کرتے۔ نیا ایڈیشن ۔ چار روپے

مکتبہ اردو لاہور

اوپندر ناتھ اشک

بچے

باہر زور زور سے بارش ہونے لگی تھی۔ اور ننھا تلسی داس اپنی ماں کا پلّو پکڑے ساتھ جانے کی ضد کر رہا تھا جب ریشن افسر مسٹر بالا کرشن ڈھن داس کولارکر اپنے بنگلے میں داخل ہوئے۔

"نکو نکو بسا تکڑے"[1] مسز کولارکر نے ایک بار پھر اپنا پلّو چھڑاتے ہوئے کہا۔

لیکن بچہ بدستور "ہم ممی ساتھ جائیں گا۔ ہم کچن میں جائیں گا" چلاتا رہا۔

مسز کولارکر نے بچے کا دھیان بدلنے کے خیال سے کہا "دیکھو تمہارے پاپا جی آئے ہیں۔ گڈ ایوننگ بلاؤ"

بچے نے ممی کا پلّو پکڑے پکڑے وہیں سے "گڈ ایوننگ" بلائی۔

لیکن پاپا جی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"پاپا جی نہیں بولتا۔ پاپا جی ایک دم ڈرٹی ہے" بچے نے آیا سے سیکھی ہوئی انگریزی ہندوستانی میں کہا۔

"چھی چھی! ایسا بھی بولتا ہے؟ اتنا گڈ بوائے! کشما مانگو پاپا جی سے"

بچے نے وہاں کھڑے کھڑے کشما مانگی۔ لیکن اس کے پاپا جی ہاتھ کا سامان میز پر رکھ کر خاموشی سے برساتی اتار کر کھونٹی پر ٹانگنے لگے۔

ماں نے سمجھا بچے کا دھیان بٹ گیا ہے۔ بولی "ویری گڈ بوائے! اب بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں چائے لے کر"

لیکن بچے نے پھر ممی کا پلّو پکڑ لیا۔

اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر مسز کولارکر نے کہا "ذرا اسے ادھر رکھیئے۔ میں چائے لے آؤں باہر بارش ہو رہی ہے"

مسٹر کولارکر نے برساتی ٹانگ کر کھونٹی سے چھاتا اتارا۔ اسے بیوی کے ہاتھ میں دیا۔ اور جا کر بستر پر لیٹ گئے۔

مسز کولارکر کا سارا غصّہ اپنے بچے پر نکلا "ایک دم گندہ بابا ہے۔ کہنا نہیں مانتا" "ہم دوسرا بے بی لے آئیں گا" اور چھاتا کھول کر وہ بکتی جھکتی بچے کو اٹھا کر رسوئی گھر کی طرف چلی گئیں۔

جب سے مسٹر کولارکر نئی گلی میں آئے تھے۔ روز ایسا ہوتا تھا۔ رسوئی گھر بنگلے سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اور ننھا تلسی داس کبھی اپنی ممی کی ساڑی کا پلّو اور کبھی آیا کی سکرٹ کا دامن پکڑے رسوئی گھر سے بنگلے اور بنگلے سے رسوئی گھر کے کئی چکر لگاتا اور کئی بار گڈ اور کئی بار ڈرٹی بنتا۔

بمبئی میں مسٹر کولارکر کا فلیٹ دانکیشور روڈ پر بیتل باغ کے برابر واقع تھا۔ مکان کی دوسری منزل میں وہ رہتے تھے۔ اور ننھا تلسی داس اپنی ممی یا آیا کو تنگ کرنے کی بجائے کبھی اوپر کی منزل اور کبھی نیچے کی منزل میں ہی کوئنگ (AUNTI) کرتا اور اس کی ماں اور آیا اسے گڈ بوائے وری وری گڈ بوائے (VERY VERY GOOD BOY).

---

[1] نہیں نہیں، وہاں بیٹھو، وہاں، کشما، معافی

سمجھا کرتیں۔ ان کے نزدیک ساری بلڈنگ میں صرف وہی گڈا یا تھا۔ باقی سب ڈرٹی تھے۔ وہ نہ صرف اپنی ماں کا پیارا تھا۔ بلکہ آیا بھی اسے بڑا چاہتی تھی۔ اس کی سکھائی ہوئی انگریزی مراٹھی ملی ہندوستانی میں ایسی پیاری پیاری باتیں کرتا کہ دونوں اسے چوم چوم لیتیں۔ اس کے پاپا جب صبح اُٹھتے (رات کو مسٹر کولار کر دیر سے گھر آتے۔ اس لئے باپ بیٹے میں شاذ ہی سامنا ہوتا) تو وہ انہیں اپنے ہی کمرے سے گڈ مارننگ بلاتا۔ اور پھر اپنی ممی کی گود میں چڑھے چڑھے جا کر انہیں کسی (KISSY) دیتا اور گڈ بوائے کا خطاب پا کر ممی کے گلے میں باہیں ڈالے واپس آجاتا۔ اپنے فلیٹ میں وہ ہاتھ منہ دھونے، کپڑے بدلنے، ناشتہ کرتے، کھانا کھاتے یا سونے کے وقت ہی رہتا اس کا باقی وقت پڑوسن آنٹیوں اور ان کے بچوں سے کھیلتے یا آیا کے ساتھ چوپاٹی کی سیر میں گذرتا۔

لیکن پنچ گنی میں نہ پڑوسن آنٹیاں تھیں۔ نہ ان کے بچے تھے، نہ چوپاٹی کی سیر تھی۔ اور نہ آیا ہی اُس کا دل بہلاتی تھی۔ —— مسٹر کولار کر نے پنچ گنی میں جو بنگلہ لیا تھا۔ یا سیزن کا نہ ہونے کی وجہ سے انہیں جو بنگلہ ملا تھا۔ وہ کافی تنہا جگہ واقع تھا۔ دُور دُور تک بچہ تو کیا بوڑھا بھی نظر نہ آتا تھا۔ اس کے علاوہ آیا بچے کا کام دیکھنے کی بجائے رسوئی کا کام دیکھنے لگی تھی۔ اور بچہ بالکل اکیلا پڑ گیا تھا۔

ہوا یُوں کہ جب اچانک ڈاکٹروں نے مسٹر کولار کر کے دائیں پھیپھڑے میں کچھ انفلٹریشن یعنی دق کے جراثیم کی ہلکی سی یورش کا خدشہ ظاہر کیا۔ اور مسٹر کولار کر نے اپنے اور اپنے سُسر کے تمام تر رسُوخ کو بروئے کار لا کر پنچ گنی میں (جو بمبئی پریذیڈنسی میں سب سے خنک صحت افزا مقام سمجھا جاتا ہے) اپنی تبدیلی کرالی تو ان کے باورچی نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس وقت ان کی آیا نے پیش کش کی کہ اگر اس کی پگار بڑھا دی جائے اور میم صاحب اس کی کچھ مدد کریں تو وہ کچن کا کام سنبھال لے گی —— مسٹر کولار کر نے فوراً اس کی پیش کش منظور کر لی۔ ننھا اب اڑھائی برس کا ہونے کو آیا تھا۔ اس کا کام گھٹ گیا تھا۔ اور میاں بیوی آیا کو جواب دینے کی سوچ رہے تھے۔ لیکن جب آیا کچن کا کام سنبھالنے کو تیار ہوئی۔ اور مسز کولار کر نے بچے کو نہلانے کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ تو مسٹر کولار کر نے اس کی تنخواہ پانچ روپے بڑھا دی۔ اور راضی اپنے ساتھ پنچ گنی میں لے آئے۔

اس تبدیلی سے سبھی خوش تھے۔ کچن کی خدائی سے بچے کی غلامی مسز کولار کر کو نسبتاً زیادہ دلپسند تھی۔ مسٹر کولار کر کو اچھے سے اچھا کھانا مل جاتا تھا۔ خلاف توقع آیا باورچی سے بھی اچھے کھانے پکا لیتی تھی۔ کئی طرح کا گوشت اور مچھلی پکا سکتی تھی۔ کیک بنانے میں اسے کمال حاصل تھا۔ پتلے پتلے پیاز کے چھلکے تیار کرتی ہی (جو میم اور صاحب دونوں کو مرغوب تھے) اسے دقت ہوتی تھی۔ لیکن اس کام میں مسز کولار کر اس کا ہاتھ بٹا دیتیں۔ اس مہنگائی کے زمانے میں آیا کو اپنی مرضی کے مطابق کھانا مل جاتا تھا۔ پوتڑوں کی بدبو کی بجائے مرغن کھانوں کی خوشبو ملتی۔ اور آیا سے بڑھ کر مستری[1] ہونے پر وہ خوشی سے پھولی نہ سماتی۔

لیکن ننھا تلسی داس اس انتظام سے سخت پریشان تھا۔ جب وہ کھیلنا چاہتا تو ممی اور آیا دونوں ہی سے کسی نہ کسی کام میں مصروف ملتیں آیا چاہتی کہ اب جب وہ آیا سے باورچن ہو گئی ہے۔ اسے بچے کی ریں ریں سے نجات دی جائے۔ اور جب بچہ اپنی عادت کے مطابق اس کی ساڑی کا پھوبہ پکڑتا۔ تو چلاتی۔ مسز کولار کر چاہتیں کہ وہ نہلا دھلا کر اسے کپڑے پہنا دیں۔ تو وہ اکیلا چٹائی پر بیٹھا کھیلتا رہے اور وہ کوئی دوسرا کام کریں لیکن بچہ کھلونے چھوڑ کر ان کی ساڑی پکڑے۔ ان کے پیچھے پیچھے گھومتا پریشان کرتا پٹتا لیکن پٹتا اور رونے پر جیسا کہ اسے سکھایا گیا تھا۔ "ابی ایسا نہیں کرینگا" کہتا ہوا معافی مانگ لیتا۔

وہ بے حد خوبصورت گُل گوتھنا بچہ تھا۔ جب وہ قصور کرنے اور پٹنے پر معافی مانگتا اور گلے میں باہیں ڈال کر صلح کر لیتا تو مسز کولار کر سب

---

[1] مستری: بمبئی کی زبان میں رسویا۔

بچھ بھول کر اسے چھاتی سے لگا لیتیں۔ اور گڈ بوائے کا خطاب دیتی ہوئی چوم چوم کر اس کے گال سرخ کر دیتیں۔
لیکن اس کے باوجود وہ دن میں اسے کئی بار ڈانٹتیں اور کئی بار معاف کرتیں کئی بار گڈ بوائے اور کئی بار ڈرٹی بوائے کے خطاب دیتیں۔

باہر بارش بدستور ہو رہی تھی۔ ہوا تیز چلنے لگی تھی۔ صنوبر اور اوک کے سر بلند، لیکن دیودار کے مقابلے میں نازک درختوں کے پتے اس کے زور سے دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔ اور ان کی پتیوں کا ہلکا سبز رنگ باقی درختوں کے گہرے مونگیا رنگ کے پس منظر میں عجیب سا لگ رہا تھا۔ بادلوں کے غول کے غول حملہ اور فتح اور شراب کے نشے میں سرشار فوجیوں کی طرح اُڑے جا رہے تھے۔ بارش کے تھپیڑے کھڑکیوں کے شیشوں کو توڑے ڈالتے تھے۔ اور ٹین کی چھت پر پھیلے ہوئے بانس کے درختوں کی شاخیں چھت کے ساتھ رگڑ کھا کر بے تحاشا چیخ رہی تھیں۔ مسٹر کولارکر کھڑکی کے قریب چارپائی پر بے حس پڑے تھے۔ اگرچہ چھ مہینے کے اندر اندر انہیں بائیس پونڈ یعنی پورے گیارہ سیر وزن ملا تھا۔ اور اگرچہ ان کے سے جو بمبئی کی نہایت مصروف اور لہو و لعب سے بھری زندگی سے اندر دھنس گئے تھے۔ اور روز بروز زرد پڑتے جاتے تھے۔ اب بھر گئے تھے اور اس موذی مرض کا سایہ جو بمبئی میں اچانک انہیں لگتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ دور ہوتا جا رہا تھا لیکن اس کے باوجود انہیں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے ان کی کوئی بہت قیمتی چیز بمبئی ہی میں رہ گئی ہے۔
دفتر کا کام انہوں نے اپنے ایک اسسٹنٹ پر چھوڑ رکھا تھا۔ دق پر لکھی ایک کتاب میں انہوں نے پڑھا تھا کہ مرض سے آرام آنے پر بھی مریض کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے۔ کہ وہ چلنے کی نسبت کھڑے رہ کر، کھڑے رہنے کی نسبت بیٹھ کر کام کرنے کو ترجیح دے۔ اور مسٹر کولارکر ہر وقت آرام کرسی پر بیٹھے رہتے تھے۔ اور کاغذوں پر دستخط وہیں بیٹھے بیٹھے کر دیا کرتے تھے۔ لنچ کا وقت وہ کتابیں دیکھ کر اونگھتے ہوئے گزار دیتے تھے۔ ادب یا سیاست میں انہیں کبھی دلچسپی نہ تھی۔ اور اب تو ملک کی فضا خراب ہونے کی وجہ سے خبریں پریشان کن تھیں اور ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق ہر طرح کی پریشانی کو دماغ سے دور رکھنے کے خیال سے وہ اخبار کی سرخی تک بھی نہ دیکھا کرتے تھے۔ دفتر کا وقت کسی نہ کسی طرح ذبح کر کے جب وہ گھر آتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ وقت ایک بڑا سا پتھر بن کر ان کے دل پر آ بیٹھا ہے۔ اکتائے اکتائے سے وہ کھڑکی کے پاس بچھے ہوئے پلنگ پر بے حس و حرکت لیٹ جاتے۔ ان کی بیوی گھر یا کچن کے کام میں مصروف ہوتی۔ ان کا بچہ "ہیلو بابا" "گڈ ایوننگ پاپا" سے ان کا خیر مقدم کرتا۔ مسٹر کولارکر تھکے ہوئے لہجے میں کبھی اس کی ہیلو اور گڈ ایوننگ کا جواب دیتے۔ اور کبھی خاموش رہتے۔ لیکن کبھی اسکی اتنی حوصلہ افزائی نہ کرتے کہ وہ ان کی گود میں آ چڑھے یا اپنی توتلی باتوں سے ان کا دل بہلائے۔
مسٹر کولارکر کو کبھی بچوں سے محبت نہ تھی۔ بلکہ اس کی سخت ممانعت بھی تھی۔ اور یہیں پلنگ پر بے حس سے بیٹھے بیٹھے انہیں ریڈیو کلب کی پُرلطف شامیں یاد آ جاتیں۔ جب کلب کے ہری ہری گھاس کے قطعوں پر بیٹھتے اور ساحل سمندر کا نظارہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا جیسے عرشہ جہاز پر بیٹھے ہوں۔ کلب کے لان کی اونچائی سے بائیں طرف سمندر کی بیکراں ہریالی اور ان میں لنگر انداز سنیاسیوں سے اٹل جہاز اور دائیں طرف انڈیا گیٹ اور تاج ہوٹل کی بلڈنگ اور وہاں تک جاتی ہوئی سمندر کے بلند سد کی دیوار کے ساتھ بچی سڑک نہایت ہی خوبصورت معلوم ہوتی۔ سمندر کی موجیں بلند سد کے پتھروں کے ساتھ ٹکراتیں اور جھاگ بکھیرتی ہوئیں لوٹ جاتیں۔ اور کبھی کبھی ان سے کہیں پرے دور بیقرار کوئی دخانی کشتی ان سنیاسیوں کی طرح سمادھی لگائے ہوئے جہازوں تک کسی پیام تک جاتی۔ اور پیچھے سفید جھاگ کی ایک لہر سی بنا کر چھوڑ جاتی۔ مسٹر کولارکر سمندر کی لہروں، جہازوں اور دور پس منظر میں ایلی فینٹا کی پہاڑی کو شام کے دھندلکوں میں ان سنیاسیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دیکھتے اور نہایت اطمینان سے گلاس میں سفید سوڈے کی سیال آگ حلق سے اتارتے اور سگرٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے۔ آہستہ آہستہ ان کے دوسرے دوست آ جاتے۔ اور وسکی کے دور کی جگہ برج کا دور شروع ہو جاتا۔ اور پھر گئی رات تک... گویا ہنستے اور وسکی کی کاک ٹیل

(COCK TAIL) چلا کرتی۔ جب وہ گھر آتے تو ان کا بچہ سو چکا ہوتا۔ ان کی بیوی کوئی مراٹھی ناول ہاتھوں میں لئے اونگھتی ہوئی ان کا انتظار کر رہی ہوتی اور ان کو سلاتے ہی سو جاتی۔

جونہی ڈاکٹر نے اس بیماری کی تشخیص کی تھی۔ کلب، شراب، سگریٹ اور برج کی انہیں سخت ممانعت ہو گئی تھی۔ اور اگرچہ یہ سب چیزیں مسٹر کولالکر کو بے حد پیاری تھیں۔ لیکن زندگی شاید ان سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ اس لئے اس تمام قوتِ ارادی کو بروئے کار لا کر جو ان کے دل میں کہیں دبی پڑی تھی۔ انہوں نے سب چیزوں کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اور سچ گنی یہ اپنی تبدیلی کرلی۔

شراب اور سگریٹ تو ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئے تھے۔ لیکن اگر وہ چاہتے تو اب جب کہ ان کی صحت بہتر ہو گئی تھی۔ وزن بڑھ گیا تھا اور بلڈ پریشر نارمل ہو گیا تھا یعنی ان کے خون میں بیماری کا اثر ختم ہو گیا تھا۔ وہ برج کی ایک آدھ بازی کھیل سکتے تھے۔ لیکن بمبئی اتنی چھوٹی جگہ تھی۔ اور ان کا عہدہ ایسا تھا۔ کہ وہ دوست بناتے ہوئے ڈرتے تھے۔ بلکہ اگر کوئی پرانا دوست کبھی نظر آ جاتا۔ تو کترا جاتے۔ بمبئی میں وہ والکیشور روڈ پر رہتے تھے۔ سانتا کروز میں راشننگ افسر تھے۔ اور کولابا میں ان کا کلب تھا۔ ان کے دوستوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو ان کی دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھا سکتا۔ سچ گنی یہ انہیں خوف تھا کہ انہوں نے کوئی ... بتایا کہ اس نے چار آدمیوں کے راشن کارڈ غیر قانونی طور پر رکھے۔ یا کوئی دوسری فرمائش کی۔ اور وہ سب سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے۔

بازار چھوٹا سا تھا۔ اور جو تھوڑی بہت رونق اس میں تھی۔ وہ بھی برسات کے باعث ختم ہو گئی تھی۔ پھر یوں بھی برسات میں کسی طرح کی سیر کی گنجائش نہ تھی۔ برسات تو بمبئی میں بھی ہوتی۔ لیکن اس کے باوجود بمبئی کی زندگی سدا متحرک رہتی۔ سچ گنی یہاں تو معلوم ہوتا۔ جیسے زندگی ایک دم ساکن ہو گئی ہے۔ اس لگاتار ہفتوں مہینوں گرنے والی بارش نے اسے یکسر ساکت کر دیا ہے۔ مسٹر کولالکر بے حس سے پلنگ پر لیٹے رہتے اور چپ چاپ گھنٹوں گھنٹوں باہر باغیچے میں ایک ہی قطار میں لگے ہوئے سلور اوک کے تنوں کو تکتے رہتے۔ جن کے گھنے پتے کہیں چھت سے بھی بہت اوپر تھے۔ اور ان زرد منڈ تنوں کو تکتے ہوئے ریڈیو کلب کی دلچسپیاں انہیں یاد آیا کرتیں۔ اور ان اداس شاموں کی اداسی اور بھی بڑھ جاتی۔

آیا ایک ہاتھ پر چائے کی ٹرے اور دوسرے میں چھاتہ تھامے ہوئے جلدی جلدی آئی۔ بچہ ساتھ آنے کی ضد کر رہا تھا۔ اس لئے مسز کولالکر نے چائے آیا کے ہاتھ ہی بھیج دی تھی۔ آیا بڈھی تھی اور بدصورت۔ لیکن کنواری ہونے کی وجہ سے اسے ابھی تک بننے سنورنے کا شوق تھا۔ جوڑے میں وہ اب بھی پھول لگاتی تھی۔ اور سرخ شمیز پہنتی تھی۔ اور عجیب بےہودہ سی معلوم ہوتی۔ مسٹر کولالکر کو اس کا چائے لانا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ ان کی بیوی کم سے کم چائے کے وقت تو ان کے پاس بیٹھے اور کچھ نہیں تو وہ اس کے ساتھ ہی چند منٹ باتیں کریں۔ شروع شروع میں مسز کولالکر نے کوشش بھی کی تھی لیکن وہ جب بھی آتیں ہمیشہ ننھا ٹلسی راؤ ان کے ساتھ آیا وہ اتنا شوخ لڑکا تھا۔ کہ ایک لحظہ کے لئے نچلا نہ بیٹھتا۔ وہ انہیں بات نہ کرنے دیتا۔ اور چاہتا کہ اس کے پاپا اور ممی آپس میں بات کرنے کی بجائے اس کی باتیں سنیں۔ مسٹر کولالکر کے لئے چائے پینا حرام ہو جاتا۔ اور کچھ لمحے تک ضبط کی کوشش کے باوجود وہ چڑ جاتے۔ اور چلا کر اپنی بیوی کو حکم دیتے کہ وہ اس پاجی کو فوراً ان کے سامنے سے لے جائیے۔ اور ان کی بیوی چاہنے کے باوجود خود نہ آ سکتی۔ مسٹر کولالکر دل ہی دل میں جھلاتے۔ لیکن بچے کی بے معنی باتیں سننے کی بجائے اکیلے چائے پینے کو ترجیح دیتے۔

یہ عجیب بات تھی۔ کہ مسٹر کولالکر کو اپنی بیوی کی یہ غیر حاضری بمبئی میں کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ دفتر سے سیدھے لوکل ٹرین میں چرچ گیٹ اور وہاں سے کلب پہنچتے۔ اور جب لوٹتے تو تھک کر ... اور کبھی جب وہ کھانا کلب ہی میں کھا لیتے تو پی کر آتے، سونے کے

سوا ان کے سنئے اور کچھ نہ رہ جاتا۔ کبھی چھٹی کے دن فورٹ یا کرافورڈ مارکٹ میں شاپنگ کرتے وقت یا کبھی کسی شام اپنے کسی دوست کی پارٹی میں وہ ضرور اسے ساتھ لے جاتے۔ لیکن اس وقت تھا، ان کی بیوی کی اپنی اہمیت کچھ نہ ہوتی۔ اس کی جدید ترین قیمتی ساڑی، نئے فیشن کے سینڈل، نروتم داس بھاؤ کی دکان سے خریدی ہوئی اس کی طلائی انگوٹھیاں اور آویزے، اس کے چہرے کی سنجیدگی اور متانت، بول چال کا مہذب ڈھنگ اور اس کے ذہن کی بلندی کا پتہ دینے والی اس کی وہ لطیف مسکراہٹ ——— سب مسٹر بالکرشن وٹھل راؤ کولارکر کی اہمیت ہی کو بڑھاتے۔ جہاں تک فراغت کا تعلق ہے۔ انہیں تو یہ بھی نہ معلوم تھا۔ کہ ان کی بیوی رفیقِ حیات اپنا وقت کیسے بسر کرتی ہے۔

آیا نے چائے کا پیالہ بنا کر صاحب کے قریب ایک تپائی پر رکھ دیا اور دوسری پلیٹ میں اُبلا ہوا انڈا۔ اور تھوڑا نمک لے آئی۔ مسٹر کولارکر بدستور لیٹے رہے۔ اور سلوراک کے تنوں کو دیکھتے رہے۔ انہوں نے ایک بار پھر آیا کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ آج بازار سے آتے آتے تاش کا ایک پیکٹ اور ڈرافٹ کا بورڈ لے آئے تھے۔ جس ڈاکٹر سے وہ انجکشن وغیرہ لیتے تھے۔ اس کے ڈرائنگ روم میں انہوں نے شام کے وقت بارہا لوگوں کو ڈرافٹ یا تاش کھیلتے دیکھا تھا۔ ان کے چند انسپکٹر بھی ہمیشہ کھیلنے والوں میں ہوتے۔ مسٹر کولارکر کا بڑا جی چاہتا۔ کہ چند منٹ ان کے ساتھ جا بیٹھیں اور ڈرافٹ کے ایک دو بورڈ یا تاش کی ایک دو بازیاں کھیلیں لیکن کلرکوں اور انسپکٹروں سے ملنا جلنا وہ اتنا ہی بُرا سمجھتے جتنا جان پہچان والوں سے اور ہر بار وہ اپنی خواہش کو دل میں دبا لیتے تھے۔ آج جب وہ دفتر سے آتے آتے ڈاکٹر کے انجکشن لینے گئے اور انہوں نے حسبِ دستور وہاں ڈرافٹ کی مجلس جمی دیکھی تو نہ جانے کیوں، واپسی پر آتے آتے وہ پنج گنی سٹورز سے ڈرافٹ کا بورڈ اور تاش لیتے آئے۔ لیکن ان کی بیوی کو تو ان سے دو بات تک کرنے کی فرصت نہ تھی۔ اور وہ دونوں چیزیں اسی طرح کاغذ میں بندھی میز پر پڑی تھیں۔ مسٹر کولارکر بے جان سے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔

"صاحب چائے ٹھنڈا ہو جائے گا" ——— آیا چند منٹ تک صاحب کے اُٹھنے کا انتظار کر کے بولی۔

"تم جاؤ ہم پیتا ہے" مسٹر کولارکر نے اسی طرح لیٹے لیٹے کہا۔ "اور میم صاحب کو فرصت ہو تو ادھر بھیجو۔"

لیکن میم صاحب کو جلد فرصت نہیں ہوئی۔ شام کے وقت مسز کولارکر کی تار سوئی میں پکا کر بنگلے میں لے آتی تھیں۔ تاکہ بارش اور اندھیرے میں بار بار سوئی گھر نہ جانا پڑے۔ اس لئے برا تھے پکانے اور دوسرا سامان لیتے لے جاتے انہیں دیر لگ گئی۔ جب بچے کو آیا کے سپرد کر کے اور یہ حکم دے کر اس نے جلد کھانا کھلا دیا جائے۔ وہ مسٹر کولارکر کے پاس آئیں۔ تو مسٹر کولارکر کا جس بات تک کرنے کو جی چاہتا تھا ——— وہ پیڈ بولکسب کی زندگی کے مسرت بخش تصورات میں گم تھے۔ اور نہ چاہتے تھے۔ کہ کوئی آ کر انہیں منتشر کر دے۔ جب مسز کولارکر اُن کے پاس پلنگ کی پٹی پر بیٹھیں اور سوئی گھر میں اپنی مصروفیت اور بچے کی شرارت اور ہٹیلے پن کا ذکر کرتے ہوئے دیر کے لئے معذرت کرنے کے بعد انہوں نے بُلانے کا مقصد پوچھا۔ تو مسٹر کولارکر نے جیسے کسی دوسری دُنیا سے بولتے ہوئے صرف اتنا کہا

"میں آج بازار سے آتے آتے تاش اور ڈرافٹ لایا تھا۔ سوچتا تھا۔ اگر کچھ وقت ہو تو تاش کی ایک دو بازیاں کھیلیں گے لیکن اب تو رات ہو گئی!"

"تو پھر کیا ہوا" مسز کولارکر نے ان کا دل بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بس ذرا جلدی کھانا کھا لیجئے۔ پھر کھیلتے ہیں۔" اور یہ کہکر وہ مسٹر کولارکر کے کھانے کا انتظام کرنے کے لئے اُٹھ کر چلی گئیں۔

شام کو کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر مسز کولارکر اپنے شوہر کا بستر جھاڑ کر بچھاتی تھیں۔ اور پھر بچے کو سلاتی تھیں۔ آیا بڈھی تھی۔

اور کمروں کی صفائی کرتے۔ برتن ملتے، بازار سے سامان لاتے۔ رسوئی پکاتے۔ اور رسوئی گھر سے بنگلہ اور بنگلہ سے رسوئی گھر کے بیس چکر لگاتے ہوئے تھک جاتی۔ اس لئے جونہی کھانا وغیرہ ختم ہو جاتا وہ بڑے کمرے میں چٹائی بچھا کر اپنا بستر لگا لیتی۔ اور اس وقت میم صاحب ننھے کو چمنی کا ڈٹے[1] یا گھو طوطے کی کہانی سُنا کر یا انگریزی بولنا سکھا کر سُلانے کی کوشش کرتیں۔ آیا مزے سے سو جاتی جب کھانا وغیرہ ختم ہو گیا اور آیا حسب دستور بستر بچھا کر لیٹ گئی۔ تو مسز کولار کرنے بچے کو خود سُلانے کی بجائے اسے آیا کے سپرد کیا۔ اور سرگوشی میں صاحب کی خواہش کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ اسے ذرا تم سلاؤ۔ اور خوب اپنے شوہر کے حکم کی تعمیل میں ان کے سامنے جا بیٹھیں۔

مسٹر کولار کر کو سویپ کھیلے برسوں بیت گئے تھے۔ شادی کے اولین دنوں میں نئی نئی بیوی کی خوشی کے لئے اُنہوں نے مہینہ بھر تک اس کے ساتھ سویپ کھیلی تھی۔ لیکن ان دنوں اُن کے لئے سویپ کھیلنا اپنی بیوی کو پیار کرنے کا، بات بات میں چوم لینے یا گود بٹھا لینے کا محض بہانہ تھا جب سویپ میں ان کی اس دلچسپی کے نتیجے کے طور پر شادی کے دو ماہ بعد ہی اُن کی بیوی اُمید سے ہو کر اپنے میکے چلی گئیں۔ اور مسٹر کولار نے کلب کی شرن لی تو آج اڑھائی تین برس سے برج ہی ان کی واحد رفیقہ تھی۔ برج کے سامنے سویپ انہیں ایسے ہی معلوم ہوتی جیسے جدید ترین فیشن میں ملبوس کسی نازنین کے سامنے زمانہ ماقبل تاریخ کی کوئی حسینہ۔ اس کے باوجود ان کی بیوی ان کے سامنے آ بیٹھی تو اپنی تنہائی اور بچھل پن کے احساس کے دور کرنے کے لئے مسٹر کولار کر اُٹھ کر تاش کا پیکٹ لے آئے۔ اور قدرے گرم جوشی کے ساتھ اُنہوں نے پتے بانٹے۔

لیکن تبھی ننھا تلسی داس (جو آیا سے کوا کے چوہے کی "ہوں ہوں" والی کہانی سُن رہا تھا۔ اور اس کے پاپا اور ممی سمجھ رہے تھے کہ سونے ہی والا ہے) "ممی ہم بی کھیلیں گا۔ تاش پتے کھیلیں گا" کہتا اور بھاگتا ہوا آیا اور مسز کولار کر کی گود میں بیٹھ گیا۔

ممی نے اسے بڑے پیار سے چوم کر کہا "جاؤ بیٹا آیا کے پاس جا کر سوو"

"سوتا نہیں" بیٹا بولا "کھیلتا ہے"

"آیا تمہیں کہانی سنائیگی بڑی چانگلی"[2]

"کہانی نہیں سُنتا کھیلتا ہے۔ ممی کے ساتھ کھیلتا ہے"

مسٹر کولار کر نے اپنے بچے کی طرف دیکھا۔ ان کی بھویں تن گئیں۔ اور انہیں پہلی بار محسوس ہوا کہ اُن کا یہ بچہ جو صبح ہی اپنے کمرے سے انہیں گڈمارننگ بلاتا تھا۔ اور پھر ماں کے کندھے سے لگے لگے انہیں کسّی (KISSY) دے جاتا تھا اور جسے وہ نہایت باتمیز سمجھتے تھے۔ سخت نامعقول ہے۔

اس وقت ان کی بیوی بچے کو سمجھا رہی تھی "تنگ نہیں کرتے بیٹا پاپا جی کے پتے نہیں لیتے اپنے کھلونوں سے کھیلتے ہیں" اور بیٹا چلا رہا تھا "کھلونوں سے نہیں کھیلتا پتے کھیلتا ہے" اور مچل رہا تھا۔ اور ہاتھ پیر پٹک رہا تھا۔

"سخت بدتمیز لڑکا ہے۔ ماں نے ذرا بھر بھی تمیز نہیں سکھائی" مسٹر کولار کر نے دل ہی دل میں کہا۔ اور ان کے جی میں آئی کہ زناٹے کے ساتھ دو تھپڑ اس بدتمیز کے گال پر جڑ دیں۔ لیکن تبھی انہیں کچھ الہام سا ہوا۔ اور انہوں نے اپنے اور اپنی بیوی کے سامنے پڑے ہوئے پتوں کو اُٹھا کر بچے کے ہاتھ میں دیا اور کہا "جا ادھر آیا کے ساتھ کھیل"

"آیا کے ساتھ نہیں کھیلتا پاپا جی کے ساتھ کھیلتا ہے۔ آیا گندہ ہے" بچہ بولا۔

---

[1] چمنی کا ڈٹے :- چڑیا کوّے ۔ [2] چانگلی :- اچھی ۔

مسٹر کولارکر کی بھویں پھر تن گئیں۔ لیکن ان کی بیوی بچے کو اُٹھا کر آیا کے پاس چھوڑ آئی۔ اور اس نے آیا سے سرگوشی میں کہا "آیا اسے ذرا کھلاؤ۔" بیٹے کو بڑے پیار سے چُوما۔ اور بولیں "بڑا اچھا بیٹا ہے۔ ممی کو تنگ نہیں کرتا۔ آیا کے ساتھ کھیلتا ہے۔" اور جب بیٹے نے وہی فقرہ دُہرایا اور بڑے تحکمانہ انداز سے سر ہلا کر آیا سے کہا "ہمارے ساتھ پتے کھیلو۔" تو اس کی ممی اس کے پاپا کے پاس واپس چلی آئی۔

مسٹر کولارکر کا جوش اتنے ہی میں ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے الہام کے مطابق "چلو ایک ڈرافٹ ہی کی گیم کھیلتے ہیں۔" کہتے ہوئے ڈرافٹ کی بساط بچھائی اور اس پر مہرے لگانے لگے۔

لیکن ان کی بیوی ڈرافٹ کے کھیل سے قطعاً بے بہرہ تھی۔ آہستہ سے اس نے کہا "مجھے تو ڈرافٹ آتا نہیں۔"

کولارکر جھنجھلا گئے "تم نے بی۔ اے کر لیا اور تمہیں ڈرافٹ کھیلنا نہیں آتا!"

نہایت ادب سے بیوی نے عرض کیا کہ بی۔ اے میں انہیں ڈرافٹ نہیں سکھایا گیا۔

کولارکر کو بڑا غصہ آیا۔ لیکن کھیلنے کی گویا انہیں ضد ہو گئی تھی۔ بولے "آسان کھیل ہے۔ یہ مہرے شطرنج کے پیل ہی کی طرح ایک ایک گھر ٹیڑھا چلتے ہیں۔ لیکن جب ان آخری گھروں میں پہنچ جاتے ہیں تو پھر آگے پیچھے دونوں طرف جتنے گھر چاہیں پھلانگ سکتے ہیں۔" اور انہوں نے مہرہ چلکر دکھایا۔ پھر کچھ یاد آ جانے سے بولے "ایک بات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اگر مخالف کا کوئی مہرہ مرتا ہو۔ تو اسے مارنا ضروری ہے۔ نہ مارا جائے گا۔ تو جرمانے کے طور پر وہی مہرہ دینا پڑے گا۔"

اور یہ سب سمجھا کر انہوں نے چال چلی۔

ان کی بیوی نے جب جوابی چال چلی تو انہوں نے دوسرے خانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سمجھایا کہ یہ چال چلو تو بہتر ہے۔ اس نے وہی چال دی۔

لیکن ابھی کھیل چند چالوں سے آگے نہ بڑھا تھا ——— جن کے دوران میں ان کی بیوی کی کوڑ مغزی ان پر پورے طور پر روشن ہو گئی تھی۔ اس کے قریب قریب سارے مہرے مر گئے تھے۔ اور مسٹر کولارکر کا تمام لطف کرکرا ہو گیا تھا۔ اور وہ چاہتے تھے۔ کہ بساط الٹ کر بستر میں جا لیٹیں۔ کہ ننھا ٹُلسی راؤ نئی تاش کے بے ترتیب پتوں کو دونوں ہاتھوں میں سنبھالتا اور انہیں زمین پر گراتا بھاگا آیا۔ اور ڈرافٹ کے مہروں کی طرف اشارہ کرتا ہوا چلانے لگا "دو چار لیں گا ممی دو چار لیں گا!"

تین ماہ پہلے جب وہ بمبئی میں تھے۔ تو مسز کولارکر نے ایک دن بچے کو ڈرافٹ کے مہروں جیسے گول گول ٹکڑے لا کر دیئے تھے۔ جن پر ایک سے لے کر بیس تک ہندسے لکھے ہوئے تھے اور بچہ انہیں دو چار کہا کرتا تھا۔

پیار سے اس کی ماں نے کہا "اس سے نہیں کھیلتا بیٹا اپنے پتوں سے کھیلتا ہے۔" لیکن بچے نے چیخکر کہا کہ وہ دو چار لے گا۔

"میرا بیٹا کوئی ڈرٹی بوائے ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس کی ماں اسے سمجھانا چاہتی تھی۔ لیکن الفاظ ابھی اس کے ہونٹوں ہی پر تھے کہ دور سے ایک تھپڑ اس کے بیٹے کے منہ پر پڑا اور وہ اس کی گود میں آ گرا۔

لحظہ بھر کے لئے کولارکر کو خیال آیا۔ کہ وہ تو بچہ ہے اسے ان باتوں کی کیا سمجھ ہے۔ لیکن اس لحظہ انہیں غصہ آیا کہ اس کی ماں نے اسے یہ سب سکھایا۔ کیوں نہیں اور جیسے دُگنے زور سے انہوں نے ایک تھپڑ اس کے دوسرے گال پر جڑ دیا۔ ان کے دماغ کی تنی ہوئی نسیں اور تن گئیں۔ اور جیسے اس لگاتار برستی بارش، پنچ گنی کی تنہائی، اپنی بیماری، بیوی کی کوڑ مغزی کا تمام غصہ

انہوں نے متواتر کئی مکوّن کی صورت میں اپنے بیٹے کی پیٹھ پر نکال دیا۔ بساط اُلٹ دی۔ اور جھلّائے ہوئے سے جاکر بستر میں دھنس گئے۔

بچّے کی گھگھی بندھ گئی۔ سسکیوں کے درمیان وہ "اب نہیں مانگتا دو چار نہیں مانگتا اپنے پتوں سے کھیلتا ہے"! کہے جارہا تھا۔ اور ماں کی بیوی اسے گود سے چمٹائے جارہی تھی۔ اسی لحظہ مسٹر کولار کر کی نظر اپنی بیوی سے چار ہوئی اور انہیں محسوس ہوا۔ جیسے اس کی نگاہیں دو لپکتی ہوئی تلواریں ہیں۔ کچھ ایسی نفرت، مذمت، اور غصّہ ان میں چھلپا رہا تھا۔ کہ کولار کر ان کی تاب نہ لاسکے۔ انہوں نے آنکھیں جھکا لیں۔

لیکن دوسرے لمحے ان کی بیوی نے ان نگاہوں کا رُخ اپنے بچّے کی طرف موڑ دیا اور ڈانٹ کر بولی۔

"پھر تو پاپا جی کو تنگ نہیں کرے گا"؟

"نہیں کرینگا"! سسکیوں کے درمیان بچّے نے جواب دیا۔

اور اپنی قوّت ارادی سے، گھنے بادلوں میں جھلک اُٹھنے والی بے معلوم سی شعاع ایسی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لا کر ان کی بیوی نے بچّے کو سینے سے بھینچتے ہوئے کہا:۔

"میرا بیٹا بڑا گڈ بوائے ہے۔ پاپا جی سے کشما مانگ لیتا ہے"!

اور ننھے نے روتے ہوئے کہا: "پاپا جی کشما کرو جی"!

"سندھی[1] کرو پاپا جی سے"!

اور وہ ننھے کو گود سے لگائے ہوئے اپنے شوہر کے پاس لے آئی اور ماں کی گود سے اُتر کر روتے روتے بچّہ مسٹر کولار کے گلے سے چمٹ گیا۔

اچانک مسٹر کولار کر کے گلے میں کچھ گولا سا اٹک گیا۔ انہوں نے بے ساختہ بچّے کو سینے سے بھینچ لیا۔ ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن ان کی بیوی پر ان کی یہ کمزوری کھُل نہ جائے۔ اس خیال سے انہوں نے بظاہر اپنی بے رُخی اور درشتی کو قائم رکھتے ہوئے کہا: "بس بس"! اور اسے اپنی بیوی کو واپس دے دیا۔

دوسرے کمرے میں مسز کولار کر بچّے کو سُلا رہی تھیں پچکار رہی تھیں اور خواب آلود آواز میں سسکتے سسکتے ماں کے ساتھ ساتھ بچّہ کہہ رہا تھا: "پاپا جی کو تنگ نہیں کرتا اپنے پتوں سے کھیلتا ہے، بازار سے دو چار لائینگا۔ پاپا جی کا کھیل نہیں چھیڑینگا" اور اپنے کمرے میں مسٹر کولار کر بستر پر لیٹے نہایت بے چینی سے کروٹیں بدل رہے تھے۔

ماں کے گرم، پُر نرم بوسوں سے ننھے کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ سو گیا لیکن نیند میں بھی اسے ہچکیاں آرہی تھیں۔ پیار اور رحم سے بھری ہوئی ایک نظر اس پر ڈال کر مسز کولار کر اپنے شوہر کے کمرے میں آئیں۔

"کیوں سوئے نہیں؟"

"نیند نہیں آرہی"!

"سر دبا دوں"!

"نہیں"!

[1] سندھی۔ صلح

"کیوں، کیا بات ہے؟"

"سوچتا ہوں یوں ہی بچّے کو پیٹ دیا۔"

"پھر کیا ہوا، میں نہیں پیٹتی کیا؟"

لیکن کولارکر کی تسلّی نہ ہوئی۔ بولے "مجھے فضول ہی غصّہ آگیا۔ بچّہ تو بچہ ہی ہے۔ اس طرح پیٹنے سے بچّے کے دل میں ڈر بیٹھ جاتا ہے۔"

"ڈر کسی کا تو ہونا ہی چاہیئے مجھ سے تو ذرا بھی نہیں ڈرتا۔"

کولارکر کی خود ہی کو تسکین ملی۔ لیکن ان کی جھنجھلاہٹ دُور نہ ہوئی۔ انہوں نے اپنی بیوی سے جا کر سونے کو کہا۔ اور کروٹ بدل لی۔

ان کی بیوی کمرے کی بتی بجھا کر خاموشی سے چلی گئی۔ اپنے کمرے میں جا کر اس نے ٹیبل لیمپ بھی بجھا دیا تاکہ اس کے شوہر کی نیند میں کسی طرح کا خلل نہ ہو۔

لیکن اس گہری تاریکی میں وہ تمام واقعہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کے ساتھ مسٹر کولار کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ اور یہ سوچ کر کہ انہوں نے بچّے کو بالکل بے قصور پیٹا ہے۔ ان کی نیند بالکل اُڑ گئی۔

ایک گھنٹے کے بعد ان کی بیوی پھر ان کے کمرے میں آئی "سوئے نہیں کیا؟"

کولارکر اچانک ہنس دیئے۔ بولے "نیند نہیں آ رہی۔"

"آپ تو ننھے سے بھی بڑھ گئے" وہ ان کے سرہانے آ بیٹھی اور بڑے پیار سے ان کا سر دباتے ہوئے بولی "اسے تو کچھ یاد بھی نہ رہے گا۔ دیکھ لیجیئے گا۔ صبح اُٹھتے ہی آپ کو گڈ مارننگ بُلائے گا۔ اور رات تنگ بھی نہ کرے گا۔ کبھی کبھی دو چار طمانچے لگنے میں کوئی ہرج نہیں۔ اور اس طرح تسلّی دیتے ہوئے وہ ان کی کنپٹیاں سہلانے لگی۔

کنستر مسٹر کولارکر نے سر اپنی بیوی کی گود میں رکھ دیا۔ دس منٹ بعد وہ خراٹے لینے لگے۔

بڑی آہستہ سے ان کی بیوی نے اپنی ران ان کے سر کے نیچے سے نکالی۔ بغیر آواز کئے بستر سے اُتری۔ لحظہ بھر چُپ چاپ اُنہیں سوئے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر دوسرے کمرے میں جا کر اس نے بے اختیار اپنے سوتے ہوئے بچّے کو چُوم لیا۔

قیدِ حیات

اوپندر ناتھ اشک کے دو طویل ڈراموں کا مجموعہ

نسائی محبت کے دو متضاد رُخوں کے فنکارانہ تجزیئے

محبت: جب عورت سماجی پابندیوں میں گھٹ گھٹ کر خون کے آنسو روتی رہتی ہے

محبت: جب عورت، مرد سماج کی جکڑ بندیوں میں رہ کر بھی پرواز کا شعور نہیں کھوتی

اشک کے ڈرامائی ذہن نے فلسفۂ محبت کی دو ڈرامائی تصویریں کھینچی ہیں

قیمت: دو روپے

مکتبۂ اُردو، لاہور

احمد ندیم قاسمی

چُڑیل

جی ہاں، ہے تو عجیب سی بات، مگر بعض سچی باتیں بھی تو عجیب ہوتی ہیں۔ دن بھر وہ برساتی نالوں میں سے چقماق کی جھولیاں چُنتی ہے، اور رات کو انہیں آپس میں بجاتی ہے۔ اور جب ان سے چنگاریاں جھڑنے لگتی ہیں تو زور زور سے ہنستی ہے، اور پھر اس کی ہنسی شدید ہونے لگتی ہے۔ قہقہے چیخوں میں بدل جاتے ہیں اور چیخیں گریہ میں۔ اور جب آدھی رات کو لوگ یہ آوازیں سنتے ہیں اور کروٹیں بدلتے ہوئے کہتے ہیں "تو ہم پر رحمتیں برسا خاتون۔" تو آسمان پر ستارے گھلنے لگتے ہیں۔ جھیل کی سطح سے چھنتے ہوئے چاند کو لطیف جھونکے لاتعداد دفوں کی قطاروں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور ہوا میں گھنی بیریوں میں سے سمٹ سمٹ اور لچک لچک کر نکلتی ہوئی گنگنانے لگتی ہیں۔ اور یہ گنگناہٹ سنسناتے ہوئے سناٹے کا روپ دھار کر پہاڑیوں اور وادیوں پر مسلط ہو جاتی ہے۔ اور صرف تبھی ٹوٹتی ہے جب پو پھٹے گلابی کنکروں سے پٹی ہوئی ڈھیریوں پر ایک سایہ سا منڈلانے لگتا ہے۔

اول اول جب وہ ان ڈھیریوں پر آئی تو جیٹھ کے مہینے کی ایک رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ آسمان پر بادلوں کی جنگ جاری تھی اور برساتی نالے گرج رہے تھے۔ کسی کھوہ میں ایک گڈریا دبکا بیٹھا تھا۔ یہ قریب سے گذری تو گڈریا "چڑیل، چڑیل" پکارتا چیختا چلاتا، کنکر اڑاتا اندھیرے میں جذب ہو گیا۔ دوسرے روز چرواہوں نے بہت دور سے اسے ڈھیریوں پر چقماق چنتے دیکھا تو گڈریے کے واویلا میں سچائی کی رمق نظر آئی۔ گھروں کے صدر دروازوں پر تعویذ لٹکائے گئے۔ دہقانوں کے چھپروں کے اردگرد پیر جی کا دم کیا ہوا پانی چھڑکا جانے لگا، اور نمبردار نے مولوی جی کو عین وسط میں بٹھا کر کہا کہ یہاں تین مرتبہ قرآن مجید پڑھ کر پھونکو، اور پیٹ بھر حلوہ
۔ سنتا سنگھ جو راولپنڈی کے فسادوں کا حال سن کر گھر کی چار دیواری میں بند ہو کر رہ گیا تھا، باہر آیا۔ اور مکان کے قفل پر سیندور چھڑک کر اندر بھاگ گیا۔ اور لالہ چونی لال نے اڑوس پڑوس کے پنڈتوں کو فوراً جمع کیا اور ایک بھجن منڈلی قائم کر دی۔ ہو حق کے ورد اور رام نام کے جاپ سے گاؤں بھڑوں کے چھتے کی طرح سرسرانے لگا۔ اس روز مدرسہ بھی بند رہا۔ کیونکہ گاؤں نے اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو کلیجوں ہی سے چمٹائے رکھا۔ اور مدرسے کے برآمدے میں بیٹھ کر چڑیل کی باتیں کرتے رہے۔

مگر چند ہی دنوں کے بعد مراد نے گاؤں بھر میں یہ خبر پھیلا دی کہ وہ چڑیل نہیں۔

"چڑیل نہیں!" مولوی جی نے پوچھا تھا۔ "ارے بھئی تمہیں کیا معلوم کہ سکندر اعظم کے زمانے میں کالی ڈھیری کی چوٹی پر ایک ہندوستانی چڑیل نے ایک یونانی کی کھوپڑی توڑ کر اس کا گودا نگل لیا تھا۔ جب سے اس ڈھیری پر کسی نے قدم نہیں رکھا، اور اکثر دیکھا گیا ہے، خود ہم نے دیکھا ہے، کہ طوفانی راتوں میں ڈھیری پر دیے جلتے ہیں اور تالیاں بجتی ہیں، اور ڈراؤنے قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں، دادا سے پوچھ لو۔"

دادا جسے قرآن مجید کی کئی آیات کے ترجمے سے لے کر ابابیلوں کی چونچ اور گدھ کی آنکھوں کے مرکب سے ایک اکسیری سرمے کا نسخہ تک سب یاد تھا۔ بولا "کون نہیں جانتا، کوئی ماں کا لال کالی ڈھیری پر چڑھ کر تو دکھائے۔ کہتے ہیں اکبر بادشاہ دلی سے صرف اس لئے یہاں آیا تھا، کہ اس چوٹی کا راز معلوم کرے، مگر مارے ڈر کے پلٹ گیا تھا۔"

مراد بولا: "میری بات بھی تو سنو۔"

"ہاں ہاں بھئی۔" دادا نے کہا: "سچ مچ مراد کی بات بھی تو سنو۔ ہمارے تمہارے جیسا نادان تو نہیں کہ سنی سنائی ہانک دے گا۔ پڑھا لکھا ہے، انگریز کو اردو پڑھاتا رہا ہے فوج میں —— کہو بھئی مراد۔"

اور مراد بولا: "وہ چڑیل نہیں، بلا کی خوبصورت عورت ہے۔ اتنے لمبے اور گھنے بال ہیں اس کے کہ معلوم ہوتا ہے اس کے بدن پر گاڑھے دھوئیں کا ایک ہرا ہرا سا خول چڑھا ہوا ہے، اور رنگ تو اس غضب کا ہے کہ چاند کی کرنوں کی ایسی کی تیسی۔ آنکھیں بادامی ہیں۔ پھر کوٹکٹکی باندھ کر دیکھے تو چینٹا کے دھرے ہے۔ پلکیں اتنی لمبی اور ایسی شان سے مڑی ہوئی کہ تیر کمان یاد آجائیں —— اور دادا ——"

"کہتے جاؤ، کہتے جاؤ۔" دادا مسکرا رہا تھا۔

مولوی جی نے تسبیح پر سینکڑا ختم کر لیا تھا۔

اور مراد بولا: "دادا —— اس کے دونوں ابرؤوں کے درمیان ایک نیلی سی بندیا بھی ہے!"

"ارے!" دادا جیسے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور مولوی جی نے تسبیح کو مٹھی میں مروڑ کر ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا: "میں نہیں کہتا تھا کہ وہ کالی ڈھیری کی چڑیل ہے، جس نے یونانی سپاہی کی کھوپڑی کا گودا نگلا تھا۔ یہ ماتھے کی بندیا ہندو عورت ہی کا نشان تو ہے۔"

"خدا لگتی کہوں گا مراد۔" دادا بولا: "مولوی جی کی بات سچ رہی ہے۔ نفل پڑھو شکرانے کے کہ بچ کر آگئے ہو ورنہ ——"

"نہیں وہ چڑیل نہیں۔" مراد کی آواز میں اعتماد تھا: "اگر چڑیلیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں تو میں ابھی کالی ڈھیری پر جانے کے لئے تیار ہوں —— مگر دادا —— میرا دل کہتا ہے کہ وہ چڑیل نہیں۔"

"تو پھر کون ہے آخر؟" دادا نے لوگوں کی آنکھوں میں دبکے ہوئے سوالوں کو زبان سے ادا کر دیا۔

"ہوگی کوئی۔" مراد بولا: "مگر دادا، سچ کہتا ہوں، ایران بھی دیکھا اور عراق بھی اور مصر بھی۔ کہیں کشمیری سیب کی سی رنگت تھی تو کہیں ہے چینی کی سی۔ لیکن یہ گندم کا سا، ندی کنارے کی ریت کا سا، سنہری سنہری رنگ، یہ ہمارے ہندوستان ہی میں ملتا ہے۔"

"ہندوستان میں اور بھی تو بہت کچھ ہے۔" نمبردار کا بیٹا رحیم جو لاہور کے ایک کالج میں پڑھتا تھا اور ایسٹر کی چھٹیاں گذارنے گاؤں میں آیا تھا۔ بھاری بھاری کتابوں کی اوٹ سے بولا: "یہاں بنگال کے گلے سڑے ڈھانچے بھی ہیں۔ اور بہار کے یتیم بھی ہیں، اور سارے ہندوستان کی وہ بیوائیں بھی ہیں، جن کی آبرو کے رکھوالوں پر مشرق و مغرب کے میدانوں میں گدھوں، چیلوں اور کیڑوں نے ضیافتیں اڑائیں۔ اور جن کے لہو کی پھوار نے فاشزم کا فانوس بجھایا۔ اور جن کے خون کی حدت نے کئی اور کالی نوری شمعیں روشن کیں۔ اور پھر ہندوستان میں تمہارے امرتسر، راولپنڈی اور ملتان بھی تو ہیں۔ جہاں صرف اس لئے عورتوں کی آبرو ریزی کی جا رہی ہے کہ ان کے ماتھے پر نیلی سی بندیا ہے۔ اور جہاں بچوں کو ——"

"نہیں نہیں بھئی۔" دادا بولا: "بچوں کو نہیں۔ بچوں کو ابھی تک کسی نے کچھ نہیں کہا۔"

"بچے نہ سہی۔" رحیم کی آواز کانپنے لگی: "مگر کیا بندیا والی عورتیں اور کڑے والے نوجوان اور جنیو والے بوڑھے انسان نہیں ہیں؟ کیا وہ کسی اور سیارے سے ٹپک پڑے ہیں؟ کیا ان کی امیدیں اور امنگیں اور ولولے مر چکے ہیں؟ کیا ان کے سینوں میں دل اور دلوں میں ——"

ایک نوجوان دہقان نے احتجاج کیا: "بات گندمی رنگ کی ہو رہی تھی ملک جی۔"

"اور میں کہہ رہا تھا۔" رحیم بولا: "کہ گندمی رنگ کے علاوہ اور بھی تو بہت کچھ ہے دنیا میں۔ افریقہ کا حبشی ہے، امریکہ کا

انڈین ہے۔ ہندوستان کا اچھوت ہے۔"

"دیکھو بھئی رحیم" دادا نے لجاجت سے کہا۔ "اصل میں بات ہو رہی تھی اس چڑیل کی۔" اور دادا نے ڈھیریوں کی طرف دیکھا جن پر مغربی افق پر چھائی بدلیوں کی جھریوں میں سے ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعیں شفق میں نہا کر اتر آئی تھیں۔ "بات سے بات یوں نکلتی ہے ملک ہیر سے، کہ چڑیل کا ذکر آیا۔ مراد نے کہا کہ وہ عورت ہے، اور عورت بھی ایسی کہ دیکھو تو خدا یاد آ جائے۔ اور وہاں سے بات چلی اس کے رنگ کی، اور رنگ ہمیں بنگال اور بہار لے گیا ——— اچھا بتاؤ، دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟"

"چار" حیران رحیم بولا۔

"چار اور چار؟"

"آٹھ۔"

"بس ٹھیک ہے" بوڑھا بولا۔ "یہ ہیں تم پڑھے لکھوں کی باتیں۔ ہم بیچارے گنوار، ہم یہ باتیں کیا جانیں۔ ہاں تو مراد، تم کہتے ہو چڑیل سانچے میں ڈھلی ہوئی عورت ہے۔ اچھا تو اب یہ بتاؤ کہ اس کے بعد تمہاری آنکھ کھل گئی تھی نا؟"

ایک قہقہہ پڑا۔ اور مراد خفا ہو کر بولا۔ "خواب کی بات نہیں دادا۔ یقین نہ آئے تو کل چلو میرے ساتھ۔ پھر سے جوان نہ ہو جاؤ، تو مونچھیں کتر لینا میری۔"

"مونچھیں تو خیر تم نے پہلے سے کتر رکھی ہیں۔" دادا نے کہا۔ "مگر دیکھو ابھی کیوں نہ چلیں، سب کے سب؟"

لیکن مراد نے کہا کہ عورت کا رات کا ٹھکانا اسے معلوم نہیں، اور پھر اس نے اس عجیب و غریب انکشاف کو کھول کر بیان کیا "بات یوں ہوئی کہ گھاس ختم ہو گئی تھی۔ اور ادھر اتری ڈھلان پر کسی بدذات نے رات کی رات وہ ہاتھ صاف کیا ہے کہ ایک تنکا بھی ملا ہو تو قسم ہے۔ تم جانتے ہو کہ نوکری سے واپس آکر میں نے وارث سے ایک بیگھ زمین خریدی تھی۔ انہیں پچھمی ڈھیریوں میں۔ سو میں نے کہا کہ چڑیل میری ہی تاک میں تو ہو گی نہیں۔ چپکے سے جاؤں گا اور کسی منشیب سے گھاس کاٹ کر بھاگ نکلوں گا۔ درانتی کے علاوہ کلہاڑی بھی ساتھ لیتا گیا ——— اب کرنا خدا کا کیا ہوا کہ میں پگڈنڈی چھوڑ کر دبے پاؤں لپکا جا رہا تھا کہ اچانک ایک جھاڑی کے پیچھے سے وہ یوں اٹھی جیسے حقے کا کش لگانے سے چلم پر شعلہ ابھرتا ہے۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا ——— وہ بےتحاشہ بھاگی اور جھاڑی سے پرے ڈھلان پر سے اتر گئی ——— وہ جہاں نوبے کے بابو پر بھیڑیئے نے حملہ کیا تھا۔ بس وہیں ——— اچھا تو جب وہ بھاگی ہے تو میں نے اس کے پاؤں کی طرف دیکھا جو بالکل سیدھے تھے میری تمہاری طرح ——— اور چڑیلوں کے پاؤں الٹے ہوتے ہیں نا؟"

"ہاں بھئی چڑیلوں کے پاؤں تو اُلٹے ہوتے ہیں" مولوی جی دلچسپی لے رہے تھے۔

"اور پھر دادا، اس کے گھنے بال یوں اڑے جیسے ——— جیسے کوئی شریر بچہ گھنگھور گھٹا کے ایک لیوترے سے ٹکڑے میں دھاگا ڈال کر اسے اڑاتا پھرے۔"

"انسان بن انسان" دادا بگڑ گیا۔ "بھوت پریت کی باتیں نہ کر۔ بادل کا ٹکڑا اڑاتا پھرے! ارے سیدھی طرح یوں کیوں نہیں کہتا کہ ——— جیسے دھوئیں کی لہر یا سیاہ ریشم کا ڈھیر۔"

مولوی جی بول اٹھے "اور وہ ماتھے کی بندیا؟ ——— وہ بھول گئے؟"

"مگر مولوی جی" مراد نے فریاد کی "مسلمان، عیسائی، اور پارسی۔ سبھی عورتیں بندیا لگاتی ہیں شہروں میں۔ ان آنکھوں سے دیکھا

ہے۔اور پھر بندیا یا کرتے یا چینو یا مسواک سے بیچاری انسانیت پر تو کوئی آنچ نہیں آتی۔آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔"

دادا بولا: "سچ سچ مولوی جی۔وہ آپ کو وہاب مجذوب تو یاد ہوگا جس کے سر پہ برہمنوں کی سی اتنی لمبی جٹیا تھی۔اور ماتھے پر تلک لگاتا تھا۔اور قرآن مجید کا حافظ تھا اور کنوئیں میں اتر کر خدا کو یاد کرتا تھا۔"

مولوی جی نے کہا: "ہاں بھئی۔وہاب مجذوب کسے یاد نہیں۔وہ نہ ہوتا تو اُس سال علاقہ قحط کی لپیٹ میں آجاتا۔مگر اس نے ایک بار عصا اٹھا کر اسے آسمان میں جیسے چبھو دیا۔اور وہ بارش ہوئی۔وہ بارش ہوئی کہ ندیاں نالوں میں نالے دریاؤں میں بدل گئے تھے۔"

"کون جانے یہ بھی کوئی مجذوب عورت ہو۔" دادا نے کہا۔ تب لوگوں کے چہروں پہ سنجیدگی چھاگئی۔اور مراد نے حالات کے اس نئے پلٹے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اٹھ کر جانا چاہا۔

"بھئی پورا قصہ تو سناؤ۔" لوگوں نے تقاضہ کیا۔

اور وہ بولا: "چلو نہیں سُناتے،جھوٹ تھا سب کچھ،اس کے بعد آنکھ کھل گئی میری ——— بس! ——— اب تشفی ہوگئی ہوگی تم سب کی۔"

دادا نے بھی ہجوم کے بدلتے ہوئے تیور بھانپ لئے تھے۔بولا "بھئی بات سے بات نکل آئی تھی ورنہ ———"

ایک دم سب لوگ چلا اٹھے: "اب اس قصے کو ختم بھی کرو چچا ——— ہاں تو مراد بھیا،پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا" مراد بناوٹی نارضامندی سے بولا: "بس میں اس کے پیچھے پیچھے گیا اور ——— اور جب نشیب میں اترا تو کیا دیکھتا ہوں،کہ وہ چقماق کے ٹکڑوں کی اتنی بڑی ڈھیری سی لگائے بیٹھی ہے، ——— چپ چاپ۔پلکیں تک نہیں جھپکتیں،اس کی ——— اور جب مجھے دیکھا تو اٹھ کھڑی ہوئی۔اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی،اور چلانے لگی: "چلے جاؤ۔چلے جاؤ مجھے چھوؤ نہیں ——— مجھ سے دور رہو،چلے جاؤ" ——— اور وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر زیادہ شدت سے رونے لگی ——— میں نے اپنی پوٹلی کھول کر کہا۔ "یہ کھانا رکھے جا رہا ہوں تمہارے لئے" ——— اور پھر میں چلا آیا۔

لوگ گلیوں میں بکھر گئے،اور دوسرے روز فجر کی نماز کے بعد مولوی جی نے نمازیوں کو روک کر کہا: "یہ ضروری نہیں کہ ولی اور قطب،ابدال اور مجذوب صرف مردوں میں سے اٹھیں۔عورتیں بھی تو انسان ہیں،اگرچہ اس مجذوب عورت کے ماتھے پر بندی کا نشان ہے،مگر کون جانے کہ یہی نشان اس کی بزرگی پر دال ہو ——— اس مجذوب عورت کو تمہارے علاقے میں اتار کر اللہ تعالےٰ نے ہم پر احسان فرمایا ہے۔اس لئے بھائیو! اس کی قدر کرو۔اس کی خدمت کرو۔اور یقین کرو کہ ——— "اور ان کی آواز ذرا گریہ سے بھرا کر گھٹ گئی،اور وہ رسمی سی دعا مانگ کر چادر سے آنکھیں پونچھتے منبر پہ سے اتر آئے۔

اسی روز مولوی جی سے مشورہ کر کے ذیلدار نے چوپال پر پنچایت بلائی اور فیصلہ ہوا کہ باری باری ہر شخص اسے خوراک پہنچایا کرے۔"تین چار سو گھروں کا گاؤں ہے،مدتوں کے بعد دوسری باری آئے گی۔جب ایسے لوگ کہیں ظاہر ہوتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ سنبھل جاؤ،خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔"

رحیم سنبھل کر بولا "مگر ابا جان ایک عورت کے لئے اس قدر اہتمام! ——— اور ہندوستان کے وہ کروڑوں باشندے جن کے پاس کھانے کو ایک ٹکڑا نہیں،تن ڈھانکنے کو ایک دھجی نہیں ——— ان کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"کیوں بے مراد" مولوی جی نے رحیم کی بات کاٹ دی: "کپڑے تو پہن رکھے ہیں نا اس نے؟"

"جی ہاں استاد جی"۔ مراد بولا: "ہیں تو سہی مگر ذرا ——— میرا مطلب ہے ——— ذرا واجبی سے ہیں۔"

"اِن لوگوں کو لباس کی کیا پروا"۔ مولوی جی نے تسبیح کی گردش تیز تر کر دی۔ "جو ساری ننگ دھڑنگ انسانیت کو ڈھانپنے نکلے ہوں۔ جن کی لو صرف خدا سے لگی ہے، اور جن کا بستر گھاس اور چھت آسمان ہے، اور تارے چراغ ہیں اور پھول ساتھی ہیں اور ــــ"

"اور چقماق کے ٹکڑے ـــــ ڈھیروں کے ڈھیر"۔ مراد بولا۔

ادھر سے رحیم جھپٹا۔ "اور آندھیاں اور سیلاب اور بجلیاں جھلساتی ہوئی دھوپ اور جھاڑے کی راتیں"۔

مگر رحیم کی طرف کسی نے توجہ نہ کی، اور گاؤں والے مجذوب عورت کے پاس ہر روز صبح و شام کھانا پہنچانے کی سکیم پر یوں عمل کرنے لگے، جیسے وہ کچھ عرصہ پہلے تھانیدار کے لئے انڈے اور جنگل کے داروغہ کے لئے گھی اور صاحب ضلع کے لئے شہد کے مرتبان مہیا کیا کرتے تھے،

مسجدیں خلافِ معمول نمازیوں سے بھری رہنے لگیں۔ گاؤں پر ایک ہیبت، ذرا سناٹا چھایا رہنے لگا۔ اور عورتیں راتوں کو سونے سے پہلے رو رو کر دعائیں مانگتیں۔ "ماں۔ تم جو ویران ڈھیریوں پر رہتی ہو، اور گلابی چقماق جمع کرتی ہو، اور سنسان گھاٹیوں میں گھومتی ہو۔ تم جس نے دنیا پر لات مار کر صرف اپنے پیدا کرنے والے کی ذات سے لو لگا رکھی ہے۔ تم ہمارے کھیتوں پر بارشیں برساؤ اور ہماری اولاد پر رحمتیں چھڑکو"۔

چند ہی مہینوں میں مجذوب عورت نے دیہاتیوں کے ذہنوں میں وہ حیثیت اختیار کر لی جو گاؤں کی مسجد یا پنگھٹ یا مدرسے کی تھی۔ آہستہ آہستہ نواحی دیہات سے بھی لوگ آنے لگے۔ اور مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر اور ان ڈھیریوں کی طرف رخ کر کے منتیں ماننے لگے: "میرا لڑکا خیریت سے واپس آ جائے ـــ میری بیٹی کی بیماریاں دور ہو جائیں ـــ میرے بیلوں کے کھر ٹھیک ہو جائیں"۔ ـــ اور جب بڑے دنوں کی چھٹیوں میں جب رحیم گاؤں آیا تو بولا: "یہ دعا کیوں نہیں مانگتے کہ ملک کے آزاد ہو جانے کے بعد ہم لوگ آزاد قوموں کی طرح زندہ رہنا سیکھیں، اور جمے ہوئے لہو کی تہوں کو اپنے ذہنوں پر سے کھرچ دیں، جنہوں نے ہماری انسانیت کو چھپا رکھا ہے۔ نہ جانے غیروں کی بندگی کا کلنک ہمارے ماتھوں پر سے کب مٹے گا: ـــ ـــ نہ جانے ـــ ـــ" مگر دادا نے اُسے ہمیشہ کی طرح ٹوک دیا: "بھولے بچے فرشتوں نے ہم لوگوں کو سجدہ کیا تھا، اب ان سجدوں کی سزا ہمیں کو تو بھگتنا ہے، بندگی ہماری قسمت میں ہے بچے"۔

"کیسی باتیں کرتے ہو دادا"۔ رحیم کا سارا علم اس کے حلق میں آکر پھنس گیا۔ "تم کیا جانو کہ ہم نے آزادی کو اپنے ہی لہو میں بھگو کر پلید کر دیا ہے، اور یہ عمل اب تک جاری ہے، اب تک ہمارے گھروں اور سڑکوں اور کھیتوں پر لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ اور بچے کچلے پڑے ہیں۔ اور عورتوں کے جسموں پر عصمت کی ایک دھجی تک باقی نہیں۔ تم کیا جانو دنیا میں کیا ہو رہا ہے"۔

دادا ہار ماننے والا کب تھا: "وہی کچھ ہو رہا ہے جو یہ مجذوب عورت ہمیں روز دکھاتی ہے، چقماق ٹکرا رہے ہیں چنگاریاں جھڑ رہی ہیں اور اس وقت تک جھڑتی رہیں گی جب تک سب چقماق گھس نہیں جاتے"۔

"چقماق بھی گھس جاتے ہیں دادا؟" مراد نے بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔

"اب گھستے نہیں تو ٹوٹتے تو ضرور ہیں"۔ دادا اپنے نظریے کے محور کے گرد برابر گھوم رہا تھا۔

اور اچانک مراد نے دور بھوری پہاڑیوں پر نظریں دوڑائیں۔ اور وہ اپنے ذہن میں الٹی زقند بھر کر پھر سے ایک شریر بچہ بن گیا ـــ وہ ہم جولیوں کے ہمراہ چقماق تلاش کرتا پھر رہا تھا چوٹیوں سے اتر کر وہ ڈھلانوں پر گھوما۔ اور وہاں سے وادیوں میں اتر آیا۔ برساتی نالوں کے گول گول پتھروں میں پھنسے ہوئے لہریئے چقماق چنتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ

یہ پہاڑ اور یہ وادیاں اپنے آتش فشاں خزانے لٹا چکی ہیں۔ ان گلابی قاشوں کے سوا جو اس کی اور اس کے ساتھیوں کی جھولیوں میں تھیں گھاٹیوں پر دور دور تک بکھرے ہوئے پتھر گلابی اور اودے رنگ سے خالی ہیں۔ زمین کی کوکھ کا شعلہ بجھ چکا ہے اور یخ بستہ کہرا چاروں طرف سے سمٹا آ رہا ہے، اسے جکڑ رہا ہے، اسے بھینچ رہا ہے۔

"مراد" دادا نے اسے جھنجھوڑا۔ "قاہرہ کی گلیاں تو یاد نہیں آ رہیں؟"

"نہیں دادا۔" مراد نے لمبے لمبے پٹوں سے ڈھکے ہوئے سر کو جھٹکا یا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ یہ مجذوب عورت سارا دن چقماق سے چقماق بجاتی رہتی ہے۔ مگر ان گھاٹیوں پر اتنے چقماق کہاں سے آئے کہ گھسیں بھی، ٹوٹیں بھی اور ختم بھی نہ ہوں۔"

"سچ مچ۔" دادا بولا۔ "چقماق تو ختم ہو جائیں گے۔"

ذیلدار نے آگے بڑھ کر کہا۔ "بھئی سچ مچ اگر چقماق ختم ہو گئے تو ——"

اور ذیلدار کی بات کئی زبانوں کی مسافتیں طے کرتی مولوی جی کے کانوں میں جا گھسی اور انہوں نے نماز کے بعد مقتدیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یا ایہا المومنین! اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ہر کسی کو الگ الگ کام سپرد کر رکھے ہیں۔ تم ہل چلاتے ہو اور اناج پیدا کرتے ہو۔ یہ فقیر پر تقصیر پروردگار کے ہیبتناک احکام سناتا ہے اور تمہیں اپنی عاقبت سنوارنے کو کہتا ہے۔ اور وہ مجذوب عورت جس نے کسی خدائی اشارے سے ہماری پہاڑیوں کو نوازا۔ دن بھر چقماق رگڑتی اور چنگاریاں برساتی ہے دنیاداروں کے لیے اس کا یہ شغل بے معنی ہے۔ لیکن اصل میں ان مجذوبوں کی ہر حرکت میں کروڑوں آسمانی راز چھپے ہوتے ہیں، مجھ سے پوچھو کہ جب میں چلہ کاٹ رہا تھا، میرے قریب ایک مجذوب آ کر بیٹھ گئے، چالیس دن بیٹھے رہے، اور جانتے ہو کیا کرتے رہے؟ ٹین کے ایک ڈبے میں کنکر بجاتے رہے۔ دن رات وہ اس ڈبے کو بجاتے اور بچوں کی طرح ہنستے۔ اور جس روز انہوں نے ڈبے کو زمین پر پٹخ دیا تو جانتے ہو کیا ہوا؟ —— سنہ چودہ کی لام شروع ہو گئی۔"

"سبحان اللہ، سبحان اللہ۔" دیہاتیوں نے پہلو بدلے۔

"اور اب میرے بزرگو! میرے عزیزو! میرے دوستو! یہ مجذوب عورت چقماق سے چقماق بجاتی ہے اور چنگاریاں برساتی ہے۔ نہ جانے کیا کچھ ہونے والا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ کچھ ہو، ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ خاتون ہم سے مایوس ہو کر کسی اور طرف نہ نکل جائے۔ تم جانتے ہو کہ ہماری پہاڑیوں پر اکا دکا ہی چقماق نظر آتے ہیں، اور یہ ختم ہو جائیں گے اور اس طرح رحمت کی بارش ختم ہو جائے گی —— اور میرے بھائیو! یہ عورت تو خدا کا خاص کرم ہے، ورنہ ہم گنہگار کس لائق ہیں —— ہم بدبخت جو جانتے ہیں کہ مسجد کے تیل کا کنستر برسوں سے ختم ہو چکا ہے، مگر ——"

مولوی جی تیل کے کنستر کے بارے میں بہت سی باتیں کرتے رہے مگر سب لوگوں کے دلوں میں چقماق جمع کرنے کی دھن سما چکی تھی، اور یہ بات گاؤں گاؤں گھوم گئی کہ مجذوب عورت کو چقماق کے ڈھیر چاہئیں۔ اور پھر چند ہی دنوں کے بعد علاقے بھر کے لوگ سروں پر چقماق بھری ٹوکریاں رکھے، گدھوں پر چقماق کے بورے لادے اس گاؤں میں آ نکلے۔ اور جب مسجد کے صحن کے ایک کونے میں چقماق کی ایک پہاڑی سی ابھر آئی تو پنچایت نے مل کر فیصلہ کیا، کہ کل ان پتھروں کو اونٹوں پر لاد کر چپکے سے گھاٹی میں پھینک آنا چاہیے۔

"تم لوگ" رحیم نے تیز تیز چلتے ہوئے دادا اور مراد کو گلی کے موڑ پر روک لیا۔ "تم اجڈ لوگ ——"

دادا نے بھڑک کر کہا۔ "اور تمہارا ابا جان جڈ ہوا کہ گاؤں بھر کا سردار ہے —— خفا نہ ہونا بھئی۔ غریبی اجڈپنا نہیں،

غریبوں کو اجڈ نہ کہا کرو۔ سمجھے ؟ اگر میں پڑھا لکھا ہوتا تو سچ کہتا ہوں صوبے کی لاٹ صاحبی تو کہیں نہیں گئی تھی۔"
"سنو تو دادا" رحیم بولا "تمہیں تو ہمیشہ مذاق کی سوجھتی ہے۔ تم۔ تم سادہ مزاج لوگ ہو۔ تم اب تک خان بہادروں اور نواب زادوں کے لئے خون کے بنک ہو۔۔ تم اب تک ۔۔۔"
"بھئی کچھ کہنا ہے تو کہہ بھی چکو" دادا اچھلا گیا "کیسی کاٹی کتری باتیں کرنے لگے ہو انگریزی پڑھ کے۔"
"مراد!" رحیم نے رُخ بدلا "میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم پر غیر ملکی حکومت اور حکومت کے کارندوں نے اتنے ظلم توڑے ہیں، کہ تمہیں ذرا سی بھی پناہ مل جائے تو یہ سمجھتے ہو کہ عرش کے دریچے کھل گئے۔ تم ساری عمر رئیسوں اور سیٹھوں کی سجائی ہوئی نمائش گاہوں میں بجاڈ پڑے رہے ہو۔ اور ہزار ہزار بار بکتے رہے ہو۔ اور جب تمہیں کہیں سے ایک تعویذ ملتا ہے تو یوں سمجھتے ہو جیسے قسمت کی نکیل تمہارے ہاتھ میں آگئی۔"
"بھئی رحیم" مراد بیزار ہو گیا "دادا اور میں ساربانوں کے ہاں جا رہے ہیں۔ ساتھ ہی چاولوں کا انتظام کرنا ہے تاکہ لوگ چقماق پہنچا کر آئیں تو گاؤں کی طرف سے ان کی دعوت ہو جائے۔ سمجھے ؟ ۔۔۔ ہم ذرا جلدی میں ہیں۔ تم لاہور کب جا رہے ہو ؟"
رحیم نے تیوری چڑھا کر کہا "یہ پاگل عورت تمہیں کہیں کا نہ رکھے گی۔۔"
پاگل عورت !۔۔۔ دادا اور مراد رحیم کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی پلٹ کر مسجد کی محراب کو چوم رہے تھے۔
دوسرے روز صبح سویرے اونٹوں کی ایک قطار کو مسجد کی گلی میں لایا گیا، اونٹوں کے گھٹنوں پر بندھے ہوئے گھنگھرو ڈول اور گلے میں لٹکتی ہوئی گھنٹیوں کی جھنجھناہٹوں سے سارا گاؤں چونک اٹھا۔ مولوی جی نے فوراً گھنگھرو اور گھنٹیاں اتار لینے کا حکم دیا، کیونکہ ۔۔۔ "میرے بھائیو۔ ایک تو گھنگرو گھنٹی مکروہ ہیں، دوسرے ان کی آواز سے مجذوب عورت کو تکلیف ہوگی۔ تیسرے ہم نمائش کے طور نہیں جا رہے۔ یہ چقماق تو معمولی چیز ہے۔ نہ جانے آگے چل کر ہمیں کیا کیا قربانیاں دینا پڑیں۔"
فوراً گھنگھرو اور گھنٹیاں اتار لی گئیں۔ اور یہ چپ چاپ قافلہ ڈھیریوں کی طرف چلا، دادا اور مراد قافلہ سالاروں کی حیثیت سے آگے آگے جا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔
"دادا۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر اس بزرگ عورت نے یہیں ٹھکانہ کر لیا تو ہمارا گاؤں اچھا خاصہ قصبہ بن جائے گا، اور چہل پہل ہو جائے گی۔"
"ہولے ہولے" دادا نے سرگوشی کی "کسی نے سن لیا تو بات چل نکلے گی اور کوئی من چلا شیرینیاں جمع کرنے یہیں کہیں کسی ڈھیری پر اڈہ جمالے گا۔"
"ٹھیک ہے دادا" مراد بولا "مگر کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ یہ عورت آئی کہاں سے ؟"
"اللہ نے بھیجی۔"
"اللہ نے تو بھیجی، مگر کہاں سے بھیجی ؟"
"کہیں سے بھی بھیجی ہو۔ ہمیں اس سے کیا۔ ہمیں آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے ؟"
اور مراد نے چپ سادھ لی۔
جب قافلہ ڈھیریوں کے قدموں میں پہنچا تو سورج اپنا سارا سونا لٹا چکا تھا۔ زمین کو جاڑا جکڑنے لگا تھا۔ اور جھاڑ بوٹا

کے پتّے ٹھٹھر کر گول مول ہونے لگے تھے۔ ڈھیریاں جیسے اونگھ رہی تھیں، اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دھرتی کی ان سنگین چھاتیوں سے ساری زندگی نچڑ چکی ہے۔

"اُف، کیسا ہول سا آنے لگا ہے" دادا بولا: "تم یہاں کیسے آتے رہے ہو مراد؟"

اور مراد نے پلٹ کر غرور سے ساربانوں کی طرف دیکھا جن کے منہ کھلے تھے اور جن کے کانوں کی مُندریں جیسے ذکر بارِی میں جھوم رہی تھیں، اور ان کے قدم یوں ادب سے اُٹھتے تھے جیسے کانچ کے فرش پر چل رہے ہیں۔

مراد نے کئی عجیب ہرے بھرے راستوں سے قافلے کی رہنمائی کی۔ اور پھر ایک برساتی نالے کے عین وسط میں چقماق کا ایک سربلند شعلہ بھڑکا۔ سب لے سب چپکے سے بیٹھ گئے، دُور سے دادا نے آواز دی: "چلو بھئی مراد۔"

اور مراد پکارا۔ "آبادادا آیا" — اور وہ چٹانوں کے بے ہنگم موڑوں پر اُگی ہوئی جھاڑیوں پر بیٹھے ہوئے سبز رنگ کے ٹڈوں کو چونکاتا خاتون کی تلاش کرنے لگا۔ گہرے کھڈوں میں جھانکا۔ برساتی نالوں کے خموں میں بھٹکتا پھرا۔ اور جب ہر طرف جگنو چمکنے لگے اور کہیں دور سے ایک تیتری اندھیرے میں بلبلائی تو وہ چقماق کے ڈھیر کے پاس آکر پوری طاقت سے پکارا "خاتون!" — اس کی آواز چاروں طرف تالیاں پیٹتی، اندھیرے میں گرجتی، پہاڑیوں سے ٹکراتی نشیبوں میں گر گئی اور جواب میں اسے بہت سے گیدڑوں کی آوازیں سنائی دیں، جو شاید اس کی آواز سے چونک اٹھے تھے — "خاتون!" وہ پکارا۔ اور پہاڑیوں نے اس کی آواز کو ہوا میں اچھال دیا، دیر تک فضا جھنجھناتی رہی، گیدڑوں کی چیخیں تیز تر ہوگئیں اور اس پاس کی جھاڑیوں میں ٹڈے خاموش ہوگئے۔

حیران اور مایوس ہوکر وہ گاؤں کو پلٹا، اس وقت چوپال پر ایک ہجوم اٹھا تھا۔ الاؤ کا ایک شعلہ ناچ رہا تھا۔ اور دہقانوں کے سنجیدہ چہروں پر ہراس اور احترام کے ملے جلے جذبات نے آسیب بکھیر رکھا تھا۔ مراد نے چوپال پر قدم رکھا تو ہجوم چونکا۔ الاؤ کا شعلہ کمان کی طرح لچک گیا اور دادا پکارا۔ "کیسے عجیب سے لڑکے ہو تم۔ ہم تو سوچ رہے تھے کہ تمہاری تلاش میں چند جوانوں کو بھیجیں مگر کالی ڈھیری سب کے دماغوں پر سوار ہے۔ جیم میاں کی ہمت بھی جواب دے گئی ہے۔ تم کہاں تھے اب تک؟"

"وہ چلی گئی ہے کہیں" مراد نے یہ الفاظ چپکے سے دیے، جیسے وہ دیر سے اس کے ہونٹوں سے لٹک رہے تھے۔

"کون؟" دادا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"خاتون"

"چلی گئی؟" سب پکار اُٹھے "کہاں؟"

"نہ جانے کہاں"

"تم نے اسے پکارا؟"

"کئی بار"

"کہاں کہاں ڈھونڈا"

"کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا"

"چلی گئی" — دادا بے جان سا ہوکر دیوار سے لگ گیا۔

چوپال کے دروازے پر کھڑا ہوا ایک لڑکا تیر کی طرح گلی میں لپکا اور مسجد کے صحن میں جاکر چلا اُٹھا: "مجذوب عورت چلی گئی"

"چلی گئی! نمازی پکار اٹھے۔

اور پھر آن کی آن میں سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ مسجد کے چراغوں کی چمک سے فق چہروں پر جناتی زردی چھپٹی ہوئی تھی، دیر تک چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ اور آخر متفقہ فیصلہ ہوا کہ کل فجر کی نماز کے بعد سب گاؤں والے ڈھیریوں پر جائیں۔ ایک ایک چٹان ایک ایک جھاڑی کو چھان ماریں، اور اگر خاتون نہ ملے تو دور تک اس کا کھوج لگائیں، اس کا پیچھا کریں، اسے واپس لے آئیں۔

"ورنہ یقین کر لو کوئی ایسا عذاب ٹوٹے گا کہ صدیوں تک اس گاؤں کے کھنڈروں میں کوئی قدم تک نہ رکھے گا"

اس رات ہر گھر میں دیئے جلتے رہے، عورتیں تسبیحوں پر درود شریف کا ورد کرتی رہیں۔ اور مرد دیر تک مسجد میں بیٹھے ذکر الٰہی میں مصروف رہے، چوپال کے حقے ٹھنڈے پڑ گئے اور دہقان گٹھڑیوں کی طرح گھٹنوں اور پیال پر سمٹے سکڑے بیٹھے رہے۔ اور جب صبح ہوئی تو مولوی جی مسجد سے باہر آئے۔ گاؤں بھر نے نہایت عاجزی سے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور دادا اور مراد کی قیادت میں ایک انبوہ ڈھیریوں کی طرف بڑھا۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ آئی تھیں۔ ننھے بچے گلیوں میں حواس باختہ سے کھڑے تھے، مولوی جی جگہ جگہ پلٹ پلٹ کر کہتے گئے "اللہ کو یاد کرو اور دعائیں مانگو کہ مجذوب عورت پھر مل جائے۔ وہ نہ ملی تو ایک ایسا زلزلہ آئے گا کہ سمندر خشکیوں پر چڑھ دوڑیں گے اور یہ ڈھیریاں جزیرے بن جائیں گی۔ اس لئے اللہ کو یاد کرو۔ اللہ کی راہ میں قربانیاں دو۔ اور اللہ کے گھر کو شام کے بعد اندھیرا نہ رہنے دو۔ برسوں سے —"

ڈھیریوں کے قدموں پر پہنچ کر ہجوم دادا اور مراد کے مشورے کے مطابق ٹولیوں میں بٹ گیا۔ بکھرتے ہوئے لوگوں کو دونوں دیر تک ہدایات دیتے رہے۔ اور پھر اس گھاٹی کی طرف چل کھڑے ہوئے جہاں ایک دن پہلے انہوں نے چقماق کا ایک مینار سا ابھارا تھا۔ یہ ہنوز اسی حالت میں تھا اور گلابی سنگریزوں پر انتظار کی سی کیفیت طاری تھی۔

"وہ جا چکی ہے دادا" مراد نے چقماق کے ڈھیر کے پاس رک کر کہا۔ "وہ جا چکی ہے اب وہ یہاں نہیں آئے گی"

"مگر تم نے کالی ڈھیری کو بھی دیکھا؟" دادا نے گھناؤنی سی اونچی پہاڑی کی طرف ہاتھ اٹھایا۔

"دیکھا نہیں مگر پکارا ضرور تھا" مراد بولا "اور دادا میری پکار خالی نہیں تھی، اس میں میری روح رچی ہوئی تھی۔

دادا چونکا "روح رچی ہوئی تھی!" وہ مراد کو گھورنے لگا۔

"ہاں دادا" مراد نے ایک چقماق اٹھا کر مٹھی میں بند کر لیا "اب کہ وہ چلی گئی ہے تمہیں بتا ہی دوں کہ میں نے اسے — میں نے اسے —" مراد کی آواز بھرا گئی۔ پلٹ کر وہ کہیں دور دیکھنے لگا۔ اور پھر چقماق کو ڈھیر پر گرا کر بولا۔ "دادا! تم حیران ہو گئے؟"

دادا کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا "میرے خیال میں اب لوٹ چلیں تو بہتر ہے، وہ جا چکی ہے۔ اسے چلے جانا چاہئے تھا"

مراد نے حیرت سے دادا کی طرف دیکھا "کیا محبت کرنا گناہ ہے دادا؟"

دادا نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر کچھ سوچتا رہا۔

"دادا" مراد پکارا۔ اور بوڑھے کو خاموش پا کر آگے بڑھ گیا۔

"مراد" بہت دیر کے بعد دادا نے اسے آواز دی مگر مراد کالی ڈھیری کا کافی حصہ طے کر چکا تھا۔

"مراد" دادا دہشت زدہ سا ہو کر مراد کی طرف بھاگا "دیکھو مراد سکندر کے زمانے سے لیکر اب تک اس ڈھیری پر کوئی نہیں گیا، چڑیل کی روح ہماری کھوپڑی کا گودا تک نوچ لے گی۔ وہ وہاں موجود ہے۔ وہ سینکڑوں صدیوں سے

وہاں موجود ہے ا—— مراد —— مراد۔"

مگر مراد مشّاق کوہ نوردوں کی طرح لپکا چلا گیا۔ اور دادا اسے پکارتا رہا اور پہاڑیاں گونجتی رہیں۔ آس پاس بکھرے ہوئے لوگ دادا کی طرف بھاگے۔ اور جب ایک ہجوم کالی ڈھیری کے قدموں میں جمع ہوگیا، تو دادا بولا "اب وہ نہیں آئے گا مجذوب عورت نے ہم سے یہ پہلی قربانی لی ہے۔۔۔ مگر دوستو کتنی بڑی قربانی — مراد کی قربانی" وہ اچانک بچوں کی طرح رونے لگا۔ اور پھر جلی بجھی چٹانوں کا رخ کرکے بلبلایا "مراد —— ہو مراد"

"اب وہ نہیں آئے گا" مولوی جی بولے "ابھی اس کی کھوپری چٹخنے کی آواز آئے گی اور ——"

"مولوی" دادا یوں گرجا جیسے اس نے مولوی جی کو کوئی زبردست گالی دے دی ہے۔ ہجوم دم بخود رہ گیا۔ اب دادا پھر سے رونے لگا "وہ آئے گا —— مراد آئے گا" —— آنکھیں پونچھ کر اس نے کالی بجھنگ چٹانوں کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر بولا "نہیں۔ وہ اب نہیں آئے گا"

کافی دیر تک لوگ دادا کو سمجھاتے رہے۔ کیونکہ اس پر دیوانگی سی طاری تھی۔ اس کی آنکھیں اجڑ سی گئی تھیں۔ اور اس کے ہونٹ کچھ اس انداز میں کھلے تھے، جیسے وہ برسوں کا پیاسا ہے۔ مولوی جی نے تسبیح کو بے تحاشہ گھماتے ہوئے دادا کے جسم پر کئی بار اپنا پاک تنفس برسایا۔ اور بکھرے ہوئے لوگ جمع ہوتے رہے اور مشورے ہوتے رہے کہ مراد کو کالی ڈھیری سے کیسے اتارا جائے۔

"کیسے اتارا جائے" رحیم ہجوم میں سے پکارا "دادا کو اگر مراد سے اتنی ہی محبت ہے تو ہمت کرے۔ ہم تو کوئی اچھی سی موت مریں گے۔ قوم کی خاطر اپنی جان دیں گے۔ سکندر نے زمانے کی چڑیل کے ہاتھوں میں اپنی کھوپڑی کو گیند کیوں بننے دیں"

"تم میں سے خدا کی ذات پر کس کس کو یقین ہے" دادا کسی انوکھے جذبے سے پکارا کہ اس کی گردن کی رگیں پھول گئیں، اور داڑھی کے بال اکڑ گئے۔

"ہم سب کو اللہ تعالے جل شانہ کی ذات پر یقین ہے" مولوی جی نے تسبیح کو مٹھی میں سمیٹ کر سارے گاؤں کی نمائندگی کی۔

"خدا کی ذات بڑی کہ چڑیل کی" دادا جیسے ہجوم کا امتحان لے رہا تھا۔

مولوی جی غصے اور طنز سے ہنسے "یہ کفر کا کلمہ ہے دادا! سنبھل کر بولو۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ خداوند تعالے سب سے بڑے ہیں"

"تو پھر چلو" اس نے سپہ سالاروں کی طرح باہیں ہوا میں لہرائیں۔ اور وہ کالی ڈھیری پر چڑھتے ہوئے بولا "خدا کی ذات پر بھروسا ہے تو چلو میرے ساتھ"

"ارے" مولوی جی نے تسبیح رولنا شروع کردی۔

"دماغ چل گیا ہے" رحیم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

گاؤں والے ایک لمحہ کے لئے خاموش رہے اور پھر یکبارگی پکار اٹھے "دادا"

مگر دادا آگے بڑھتا چلا گیا۔

"دادا" گاؤں والوں کی پکار بلند تر ہوگئی۔

اور دادا چٹانوں کے کناروں کو پکڑتا سوکھی سڑی جھاڑیوں کو تھامتا لپکا چلا گیا۔

اور پھر اچانک ہجوم کے قدموں تلے کنکر چیخ اٹھے۔ لوگ ڈھیری کی طرف لپکے "دادا" وہ چلائے "ہم بھی آرہے ہیں دادا"

--- دادا نے پلٹ کر دیکھا۔ ہجوم اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ البتہ مولوی جی سر جھکائے تنہا کھڑے تھے اور ہجوم کو کھلی آنکھوں سے گھور رہے تھے، اور تسبیح رواں دواں تھی --- اور رحیم مولوی جی اور ہجوم کے درمیان ڈھیری پر چڑھنے کی یوں کوشش کر رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار اس کے قدموں نے کنکروں کو مس کیا ہے،

ہجوم دادا کے پاس پہنچا ہی تھا کہ چوٹی پر سے آواز آئی: "دادا۔"

یہ آواز فضا میں چکراتی ہوئی ہر طرف گونج گئی۔ اور مولوی صاحب ایک بچے کی طرح ہمک کر ایک چٹان پر چڑھ گئے۔

اور رحیم نے طے کی ہوئی مسافت الٹے قدموں سے پھر سے طے کر لی۔

"دادا" جیسے کالی ڈھیری کی چوٹی پکاری،

اور دادا نے نہایت مشکل سے جواب دیا: "مراد بیٹا"

"وہ نہیں گئی --- وہ یہیں ہے" آواز آئی۔

اور ہجوم یہ سن کر اس تیزی سے چوٹی کی طرف بھاگا کہ لڑھکتے ہوئے پتھروں سے بچنے کے لئے مولوی جی برساتی نالے کے کنارے تک ہٹ گئے۔ اور رحیم اس تیزی سے چوٹی کی طرف بڑھا جیسے چٹانوں اور جھاڑیوں پر سے تیرتا ہوا جا رہا ہے۔

آن کی آن میں ہجوم چوٹی پر جا پہنچا۔ اور پھر یوں تھم گیا جیسے اس کے سامنے یکایک ایک دیوار ابھر آئی ہے، سب کی آنکھیں پتھرا گئیں اور چہرے فق ہو گئے۔

سامنے مراد ایک روتے ہوئے نوزائیدہ بچے کو بازوؤں پر اٹھائے کھڑا تھا اور وہ کہہ رہا تھا: "تم حیران ہو رہے ہو دادا؟ یہ اس میں حیرانی کی کونسی بات ہے۔ یہ تو ایک نیا انسان ہے، پچھلے چیت کی جیوانیت نے اسے جنم دیا ہے۔ یہ تو منوں بہے ہوئے لہو کا جوہر ہے۔ تم ایک دوسرے کو مبارکباد کیوں نہیں کہتے۔ دیوانی انسانیت کی کوکھ سے نکلے ہوئے اس نئے انسان کو تم ہاتھوں ہاتھ کیوں نہیں لیتے۔ اور تم یہاں میرے پاس آ کر اور اس چوٹی پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کو یہ کیوں نہیں بتاتے کہ دھرتی کی اجڑی ہوئی مانگ کا سیندور پھر سے چمک اٹھا ہے۔ دادا --- دادا"

"مگر اس عورت کے ماتھے پر تو بندیا کا نشان تھا" نیچے سے مولوی جی نے ایک اعتراض اچھالا۔

اور مراد پکارا: "مگر بچے کا ماتھا تو چاند کا ٹکڑا ہے"

"چڑیلوں کے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں" مولوی جی نے جیسے ساری دنیا کو سرزنش کی۔ ہجوم ایک دم دادا کی قیادت میں رحیم سمیت نیچے کی طرف پلٹا۔ اور مراد انسانیت کی نئی نویلی امانت کو اپنے ہاتھوں پر بلند کر کے پکارا: "کیا تم میں ایک انسان بھی ایسا نہیں جو اس نئے انسان کو اپنی دھرتی کی جنت میں بسا لے؟ --- اگر نہیں تو یاد رکھو کہ جنت سے نکالا ہوا انسان اپنی ایک نئی دھرتی اور ایک جنت بسانے پر بھی قادر ہے اور یہ جنت تمہاری جنت کے کھنڈروں پر ابھرے گی۔ سنتے ہو؟ --- ارے سنتے ہو؟"

جواب میں چٹانیں تالیاں پیٹتی رہ گئیں۔

مدھوسودن

سرد شعلے

کھڑکی کے شیشوں پر سے بارش کا پانی نیچے بہتا رہا۔ تین دن سے متواتر بارش ہو رہی تھی۔ تین دن سے ہلا کھڑکی کے شیشوں پر پانی کو بہتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ بیمار تھی، لیکن اس بیماری سے پریشان نہ تھی، اس نے چاہا تھا کہ ایسا ہو۔ تین دن کی اس دستوری بیماری کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ایک ہونے والی ماں بن گئی ہے۔ اب بیوی بننا اس کے لئے آسان ہوگا۔ وہ زرتشت کے مندر میں ایک کنواری کی طرح بیاہی جائے گی۔

پچھلے تین دن سے وہ گھر سے باہر نہیں گئی تھی۔ کبھی کبھی پریشانی کا ایک سایہ سا اس کے دماغ پر سے گزرتا تھا۔ فیروز اُسے دیکھنے نہیں آیا تھا۔ ہلا پوری طرح جانتی تھی کہ فیروز میں اب وہ گرمجوشی نہیں رہی۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ گرمجوشی اسے مسز فیروز بن جانے کے بعد اور بھی کم ہو جائے گی لیکن اس نے اس احساس سے سمجھوتہ کر لیا تھا وہ اسے برداشت کرنے کو تیار تھی، جیسے اسے اب زندگی میں گرمجوشی اور محبت کے آتشیں جذبے کی ضرورت نہیں ہے اسے گرمجوشی اور عشق تپاں کی ضرورت نہیں تھی۔ اب وہ اطمینان اور قرار چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ فیروز اس سے شادی کر لے۔ جبھی تو اس نے خود کو فیروز کے بچے کی ماں بن جانے دیا تھا!

صوفے پر نیم دراز وہ سوچتی رہی اور کھڑکی کے شیشوں پہ پانی بہتا رہا۔ فیروز کا نہ آنا اسے بُرا لگ رہا تھا۔ ان تین دنوں میں بارہا اس نے اس احساس کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ اسے ٹالا تھا۔ لیکن جذبۂ افتخار میں ایک کانٹا سا چبھ رہا تھا۔ اس بات سے اسے تسکین تھی کہ تینوں دن فیروز نے اسے فون کیا تھا۔ تینوں بار وہ فیروز کو گھر آنے کی دعوت دینے سے باز رہی تھی۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ فیروز خود آتا ہے یا نہیں۔ وہ خود نہیں آیا تھا اور یہ ہلا کو برا لگ رہا تھا۔ وہ فیروز سے کلب میں نہیں یہاں کہنا چاہتی تھی کہ وہ اس کے بچے کی ماں بن گئی ہے۔ یہاں کہنا کہیں زیادہ موثر ہوگا۔ اس نے سوچا تھا یہاں۔ بیمار حالت میں بستر پر لیٹے ہوئے۔ جیسے یہ تمام مصیبت اس نے فیروز کی خاطر سہہ لی ہو۔

یک بیک اسے بے صبری کا احساس ہوا۔ وہ صوفے پر اٹھ بیٹھی۔ وہ فیروز کے آنے کا انتظار نہیں کر سکتی۔ اُسے فیروز کو بتانا ہے۔ بتانے میں دیر اس کے اپنے حق میں مہلک ثابت ہوگی اسے فیروز پر بھروسہ نہ تھا، اعتبار نہ تھا اطمینان نہ تھا۔ بارہا اسے احساس ہوتا تھا کہ فیروز اس کے ہاتھوں سے پھسل رہا ہے۔ نہ جانے ان تین دنوں میں کون اس سے ملا ہے۔ وہ کس سے ملا ہے۔ اسے معلوم نہیں۔ وہ نہیں جانتی ان تین دنوں میں کیا ہوا ہے۔ ایک غیر اطمینانی کے جذبے میں گرفتار وہ بے چین بیٹھی رہی۔ وہ فیروز سے شام سے پہلے نہیں مل سکتی۔

یہ ڈر ہمیشہ اس کے دل کے نہاں خانے میں موجود رہتا تھا کہ فیروز اس کی کنڈلی سے باہر نہ نکل جائے۔ اس نے فیروز کے گرد اپنی شخصیت کے طلسم کا ایک جال تن رکھا تھا۔ وہ فیروز کو اس جال سے باہر نہ جانے دیتی تھی۔ کسی دوسری عورت کو اس میں داخل نہ ہونے دیتی تھی۔ اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دوسری عورتوں کو فیروز سے دور رکھنے کے لئے اُسے اپنے اور فیروز کے

تعلقات کو بڑے نمائشی ڈھنگ سے پیش کرنا پڑتا تھا۔

کھڑکی کے شیشوں پر پانی کی بے رنگ شریانیں بہتی رہیں اور وہ سوچتی رہی کتنی بار ایسا ہوا تھا کہ اسے اپنے تعلقات کا اشتہار دینا پڑا تھا۔ لوگوں کے سامنے مشتہر کرنا پڑا تھا کہ وہ فیروز کی محبوبہ ہے! ایک ناخوشگوار احساس میں ملبوس ہلا کو پھر وہ شام یاد آئی۔ کتنی پرمسرت تھی وہ شام اور کتنی بری لگی تھی اسے۔ کس قدر مسرور پارٹی تھی اور کتنا زہر پیا تھا اس نے۔ زندہ رہنے کے لئے اس نے جان بوجھ کر خودکشی کر لی تھی۔ یہ شام اس تمام عرصے کبھی اس کی یاد سے خارج نہیں ہوئی تھی۔ اور اس کے لئے ہمیشہ وہ رازدارانہ طور پر فیروز سے نفرت کرتی رہی۔

جہانگیر بہرام جی نے اپنی شادی کی پہلی سالگرہ پر گارڈن پارٹی دی تھی۔ وہ دونوں مدعو تھے اور ہلا نے فیروز سے کہا تھا کہ اسے ساتھ لیتا جائے۔ وہ اکیلی نہیں جانا چاہتی تھی۔ دراصل وہ فیروز کے ساتھ پہنچنا چاہتی تھی۔ لوگوں کو غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔

جب وہ فیروز کے ساتھ کار سے اتری تو مہمان جمع ہو چکے تھے۔ وہ دیر سے آئے تھے۔ ہلا نے تیار ہونے میں بہت دیر لگا دی تھی۔ وہ سب لوگوں کے ان کو ساتھ آتے ہوئے دیکھنے کے متعلق سوچتی رہی تھی اور دیر ہو گئی تھی۔ وہ سوچتی رہی تھی کہ جب وہ دونوں کار سے اتریں گے تو سب ان کی طرف دیکھیں گے۔ فیروز اور وہ، وہ اور فیروز۔ سب لوگ موجود تھے۔ اکثر نے انہیں کار سے ساتھ اترتے ہوئے دیکھا۔ لیکن وہ دونوں اب احباب کے حلقے میں گفتگو کا موضوع نہیں رہے تھے۔ اب وہ ماضی کی ملکیت تھے۔ لوگ سوچ رہے تھے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے۔ جب وہ پورے طور پر ایک دوسرے سے منسلک یا قطعی طور پر الگ ہو جائیں گے۔ ہلا چاہتی تھی کہ وہ رشتے میں بندھ جائیں۔ اگرچہ یہ بات کبھی اس کی زبان پر نہ آئی تھی۔ شاید فیروز ابھی کچھ دن آزاد رہنا چاہتا تھا۔ وہ انتظار کر رہی تھی۔

مہمانوں میں کچھ نئے چہرے تھے۔ میزبان نے تعارف کراتے ہوئے کہا: "یہ مس ناروجی ہیں۔ روشن ناروجی۔" ہلا کو محسوس ہوا جیسے روشن کا تعارف صرف فیروز سے کرایا جا رہا ہے اور وہ اس رسم میں محض ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ ناراضگی اور برگشتگی میں اسے خیال آیا کہ وہ یہاں کیوں آئی۔ اسے مسز جہانگیر کی اس سالگرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے مسز جہانگیر سے کبھی کوئی اُنس نہیں رہا۔ اور اس وقت تو وہ ہلا کو بڑی لگ رہی تھی۔ لیکن اب وہ یہاں آ چکی تھی، روشن سے مل چکی تھی روشن فیروز سے باتیں کرنے لگی تھی۔ جیسے اسے فیروز کے بارے میں ملنے سے پہلے سب کچھ بتایا گیا ہو۔ جیسے ملنے سے پہلے اس نے فیروز کے بارے میں ایک خیال قائم کر لیا ہو۔ ایک ارادہ کر چکی ہو۔

یہ ارادہ ہلا کو نظر آ رہا تھا۔ اس کی مخصوص نسوانی حس اُسے بتا رہی تھی کہ روشن کے دل میں فیروز کے لئے وہی خیال ہے جو خود اس کے اپنے دل میں ہے۔ اس کے آگے وہ اس کے پس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ روشن کو اُن دونوں کے تعلقات کا علم نہ ہو۔ مسز جہانگیر نے اسے ضرور بتایا ہوگا۔ ہلا نے سوچا۔ لیکن اس طرح کہ وہ فیروز کے درپے ہے۔ کہ فیروز اس کی قید سے آزاد ہونا چاہتا ہے، اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اسے رہا ہونے نہیں دیتی۔

فیروز روشن سے باتوں میں مشغول تھا۔ غصے اور حقارت اور ایک غیر واضح احساسِ ذلت نے ہلا کو خاموش کر رکھا تھا۔ یہ صرف اس کا قیاس نہ تھا۔ خود کہیں اپنے دل میں اسے یہ خیال تھا کہ فیروز اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ اور وہ ڈوبتے کے مصداق اس سے چمٹی جا رہی ہے۔

فیروز خود روشن سے گفتگو میں اس قدر محو ہو چکا تھا کہ بظاہر اُسے ہلا کی موجودگی کا کوئی خاص احساس نہ رہا تھا۔ اس وقت ہلا کو احساس ہُوا جیسے اُسے فیروز سے نفرت ہے۔ اس لمحے اسے فیروز سے نفرت تھی۔ وہ اُنس جو اس نے فیروز کے لئے اپنے دل میں پیدا کیا تھا۔ جسے قائم رکھا تھا۔ مفقود ہو گیا تھا۔ محبت کے وہ چند حقیر ذرات جو ہلا نے اپنے دل میں سمیٹے تھے بکھر گئے۔ اس لمحے اسے فیروز سے نفرت ہو رہی تھی۔

"کبھی کبھی میں خود کلب کی زندگی سے اکتا جاتا ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اس ہجوم میں، اس چہل پہل سے۔ لیکن میں اکیلا نہیں جی سکتا۔ مجھے تنہائی سے وحشت ہوتی ہے۔"

"کتنے لوگوں کا ساتھ چاہتے ہیں آپ کو؟" ہلا نے شوخی سے پوچھا۔ ساتھ ہی اچانک بجلی کی طرح ہلا کے ذہن میں یہ خیال کوندا کہ فیروز اس کی گرفت سے نکلا جا رہا ہے۔ نکلا جا رہا ہے۔

"صرف ایک!" اس نے فیروز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ایک ثانیہ پہلے جو خیال پیدا ہُوا تھا وہ اس کے سینے میں دھڑک رہا تھا۔ جیسے وہ اس فصل کو کھو رہی تھی جو اس نے بمشکل پروان چڑھائی تھی۔ ہلا کی یہ حرکت اتنی بے ساختہ تھی کہ ایک لمحہ کے لئے وہ خود مبہوت رہ گئی۔ دوسرے لمحے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ اور اب وہ جان بوجھ کر پیار سے فیروز کی انگلی کی انگوٹھی کو گھما رہی تھی۔

"وہ واقعہ یاد ہے تمہیں جب ہم ایلیفنٹا آئیلینڈ پر اکیلے رہ گئے تھے؟" اس نے معصومیت سے روشن کی طرف مسکرا کر فیروز سے پوچھا۔

"ہاں۔" فیروز نے جواب دیا۔ ہلا کو واضح طور سے احساس تھا کہ اس کی اس بات نے روشن اور فیروز دونوں کو چونکا دیا ہے۔ وہ فیروز کی بوکھلاہٹ پر ناراض تھی۔ وہ روشن کی بوکھلاہٹ پر خوش تھی۔ اچانک جیسے حفاظت نفسی کے جذبے نے اُسے متحرک کر دیا تھا۔ وہ ذلت جو چند لمحے پہلے وہ محسوس کر رہی تھی اس سیلاب میں ڈوب گئی تھی۔

"بات یوں ہوئی" اس نے روشن کی طرف مڑ کر کہا۔ "کہ ہم نے آئیلینڈ سے آنے والا آخری سٹیمر مس کر دیا اور ہم اکیلے رہ گئے۔ میں اور فیروز۔ صرف فیروز اور میں۔ دونوں اکیلے۔ فیروز کو زیادہ لوگوں سے وحشت ہوتی ہے۔ اس لئے ہم اکیلے ہی گئے تھے۔"

اس کے چہرے کا رنگ کیسا اُڑ رہا ہے۔ ہلا نے اپنے ذہن کے عقب میں سوچا، اور وہ بولتی رہی۔ "اور جب لوٹنے کیلئے ہم واپس ساحل پر آئے تو سٹیمر نکل چکا تھا۔ اگلا سٹیمر دوسرے دن دوپہر سے پہلے نہیں آتا تھا۔ شاید آخری سٹیمر کے چلے جانے کے بعد جزیرے پر اور کوئی نہیں رہا تھا۔ ہم دونوں اکیلے رہ گئے تھے، جیسے طوفان میں ہمارا جہاز ٹوٹ گیا ہو اور لہروں نے ہمیں اس انجان جزیرے پر لا ڈالا ہو۔ وہ پہلا موقع تھا جب ہم دونوں نے اپنے آپ کو واقعی اکیلا پایا تھا۔ اور کوئی ہمارے درمیان دخل دینے والا نہ تھا۔ مجھے یاد ہے اس وقت فیروز نے کہا تھا کہ محبت تیسرے آدمی کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

وہ گھبرا رہی ہے۔ ہلا نے سوچا۔ اس کی وہ تیز زبانی کہاں چلی گئی؟ اور فیروز ـــ وہ فیروز کی طرف مڑی۔

"اور اس شام کو تم اچانک کس قدر بچے بن گئے تھے۔ کتنی سلی حرکتیں کر رہے تھے تم۔"

"محبت انسان کو اکثر احمق بنا دیتی ہے۔" فیروز نے تقریباً اکھڑتے ہوئے لہجے میں کہا لیکن اس نے یہ کہہ دیا ہے۔

ہلا نے سوچا۔ اس نے اس لڑکی کے سامنے محبت کا اقبال کر لیا ہے۔ وہ جیت گئی ہے۔ وہ پھر روشن کی طرف مڑی۔

"اور ہم یونہی مستوں کی سی باتیں کرتے رہے۔" اس نے کہا۔ "اور پھر اندھیرا ہو گیا۔ پھر چاندنی نکل آئی۔ میں نے کہا

زیادہ خوبصورت رات کبھی نہیں دیکھی۔ اس سے زیادہ خوبصورت چاندنی کبھی نہیں دیکھی۔ نہ جانے رات کے کس پہر تک ہم حماقتوں میں مشغول رہے" اور پھر میں سو گئی۔"

وہ رکی۔ روشن کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے کہا نہیں اور بلا پھر کہنے لگی " جب میں صبح اٹھی تو سمندر پر پو پھوٹ رہی تھی اور فیروز میرے بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ تم ساری رات جاگتے رہے تھے نا۔" اس نے فیروز کی طرف مڑ کر کہا " میں جانتی ہوں۔"

فیروز بولنا چاہتا تھا مگر بلا نے موقعہ نہیں دیا " کتنی پیاری صبح تھی۔" وہ بولی " فیروز کو کچھ نہیں دیکھی کہ وہ سو گیا تھا۔"

فیروز نے نہیں کہا بات آگے بڑھ گئی تھی۔ بلا کا سر فیروز کے کندھے کا سہارا لیے رہا تھا۔ اس مجمعے میں یہ بات اچنبھے سے کم نہ تھی۔ لیکن بلا جانتی تھی کہ فیروز اس کا سر ہٹا نہیں سکتا۔ فیروز نے اس کے اس فعل کو نظر انداز کر دیا تھا۔ عین اس وقت رقص شروع ہو گیا اور لوگوں کی توجہ ادھر مبذول ہو گئی۔

" آپ رقص میں حصہ نہیں لیں گی؟" فیروز نے روشن سے پوچھا۔ بلا کا سر اب تک اس کے شانے پر تھا۔

" نہیں۔ میں آج تھکی ہوئی ہوں۔" روشن نے جواب دیا۔ بلا مسکرائی ---- پھر اس نے فیروز کو اٹھایا اور اسے لے کر رقص کرتے ہوئے جوڑوں میں گم ہو گئی۔

رقص ختم ہونے کے بعد پارٹی منتشر ہو گئی۔ واپس کار میں لوٹتے وقت بلا خاموش تھی جیسے وہ بولتے بولتے تھک گئی ہو۔ وہ بولتے بولتے تھک گئی تھی۔ فیروز نے کار کو احاطے سے نکالتے ہوئے اس سے کہا " تم سیدھا گھر پہنچنا چاہتی ہو؟"

" ہاں۔" کار سڑک پر آ گئی تھی۔

" رات کتنی پرسکون ہے۔ ساحل پر نہ چلیں تھوڑی دیر۔"

" نہیں۔ میں گھر جا رہی ہوں۔" بلا نے جواب دیا۔

" تم غصے میں ہو۔"

یک لخت بند ٹوٹ گیا۔ وہ غصہ جو پارٹی کے دوران میں اس نے دبائے رکھا تھا پھٹ پڑا۔

" تم سمجھتے ہو میں غصے میں نہیں آ سکتی۔ تم تمام دنیا کی عورتوں سے فلرٹ کرتے رہو اور میں ایک معصوم بچی کی طرح تمہیں پیار کرتی رہوں گی۔"

" لیکن بلا ---"

" میں نہیں سننا چاہتی۔ مجھے تمہارے بہانوں کی ضرورت نہیں ہے جو تم مجھے دھوکہ دینے کے لئے گھڑتے رہتے ہو۔ یہ پہلا موقعہ نہیں ہے جب تم نے اس طرح میری توہین کی ہے۔ ان دنوں میں نے کئی بار یہ نوٹ کیا ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے یا تھی۔ تم مجھ سے جھوٹ بولتے رہتے ہو۔"

" مہمل باتیں نہ کرو بلا۔ تو میری جیب سے سگرٹ نکال کر سلگا دو۔"

" اپنی مدد آپ کرو۔"

پھر ایک طویل خاموشی چھا گئی۔

خاموشی میں کار سڑک پر چلتی رہی۔

خاموشی میں سڑک کار کے نیچے سے گزرتی رہی۔

ہلا کا مکان آگیا۔ کار رک گئی۔

ہلا نے خود کار کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ فیروز نے کچھ نہیں کہا۔ شاید ہلا کو امید تھی کہ وہ کچھ کہے گا۔ مایوسی نے اسے اور ناراض کر دیا۔ مڑ کر دیکھے بغیر وہ مکان کے احاطے میں چلی گئی۔ اس نے اپنے پیچھے کار کا دروازہ بند ہونے کا دھماکہ سنا۔ کار سٹارٹ ہوئی اور آگے بڑھ گئی۔

سونے سے پہلے وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ شدید جذبات کی عادی نہ تھی۔ چیزوں کو شدت کے ساتھ محسوس کرنا وہ عرصہ ہوا چھوڑ چکی تھی۔ سکول کی زندگی میں جذباتی ضرور رہی تھی۔ لیکن زندگی میں داخل ہونے کے بعد رفتہ رفتہ احساس کی شدت مٹتی گئی تھی۔ جیسے اس کی سماجی ضرورتوں نے احساس کو نیم جان کر دیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود آج اس کے غصے میں وہ شرارہ تھا جس کی حرارت کو اپنی زندگی میں گویا اس نے صدیوں سے محسوس نہیں کیا تھا۔ آج جیسے اس کی حقیقی شخصیت کی راکھ میں جان پڑ گئی تھی۔ آج یہ غصہ محض اس کے ذہن میں نہیں تھا، اس کے خون میں تھا۔ اب اچانک اس کے ذہن میں یہ بات طلوع ہوتی تھی کہ فیروز اسے کبھی پسند نہ تھا۔ اور یہ سچ تھا۔ فیروز کے ساتھ اسے حقیقی طور پر کبھی کوئی جذباتی لگاؤ نہ تھا۔ مگر وہ شادی کرنا چاہتی تھی اور فیروز اس کے لئے ایک نہایت مناسب خاوند تھا۔ وہ فیروز کے ساتھ آرام سے رہ سکتی تھی۔ فیروز اسے زحمت اور فارغ البالی سے رکھ سکتا تھا۔ اور اس نے اپنے آپ کو اس کے لئے پیش کر دیا تھا۔

لیکن اس وقت فیروز کی وہ ساری صفات کہیں تاریکی میں چلی گئی تھیں۔ اچانک وہ اس چمکتی ہوئی حقیقت سے دوچار تھی کہ فیروز اسے کبھی پسند نہیں رہا۔ اس کی روح نے کبھی فیروز کو نہیں پایا اور ـــــ وہ فیروز سے شادی نہیں کرے گی۔ یہ خیال شام سے اس کی شعور کی سطح سے نیچے تیر رہا تھا۔ جب فیروز اور روشن کی باہمی محویت نے اسے ذلت کے قعر تاریک میں دھکیل دیا تھا تب ایک لمحۂ خفیف میں اس خیال نے جنم لیا تھا۔ لیکن اس وقت ہلا نے اس کا استقبال نہیں کیا۔ اب ـــ وہ فیروز سے شادی نہیں کرے گی۔ اس کے لئے کسی اور سے شادی کرنا ممکن نہیں ہے۔ مگر یہاں وہ چونک گئی۔ جیسے تصور کرنے کے لئے آگے کچھ نہ ہو۔ وہ ڈرتی تھی کہ اس کے لئے کسی اور سے شادی کرنا آسان نہ ہوگا۔ اسے معلوم تھا کہ لوگ اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔ اس کے حلقۂ احباب میں یہ بات چل نکلی تھی کہ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے جو کسی ایک آدمی کے ساتھ وابستہ ہو کر رہے گی۔ وہ عمر کی اس حد سے آگے بڑھ گئی تھی جہاں اسے کسی ایک کا ہو جانا چاہئے تھا۔ ہلا جانتی تھی کہ اس خیال کے لوگوں کی زبان پر آ جانے کے بعد اس کی شادی کے امکانات یک لخت بہت کم ہو گئے تھے۔ اس ڈر نے کہ کسی اور سے شادی کرنا آسان نہ ہوگا، اسے اب تک یہ سوچنے سے باز رکھا تھا کہ وہ فیروز سے شادی نہیں کرے گی۔ لیکن اب یہ خیال اس کے سامنے تھا۔

لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ وہ شادی کر لے، اس نے سوچا۔ کیا وہ شادی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس نے خود سے پوچھا اور ایک کمزوری اس کی رگوں میں سرایت کرنے لگی۔ اسے جواب معلوم تھا۔ لیکن اس نے کبھی اس پر غور کرنا نہ چاہا تھا۔ وہ شادی کے بغیر رہ سکتی ہے لیکن اسے کام کرنا ہوگا۔ وہ ہمیشہ اپنے والدین کی دست نگر نہیں رہ سکتی۔ وہ کئی بار ان کی طرف سے اشارہ پا چکی تھی کہ اب اسے سٹیبل ہو جانا چاہئے۔ ہر شخص جو اس سے ہمدردی رکھتا تھا، چاہتا تھا کہ وہ سٹیبل ہو جائے۔ وہ خود بھی چاہتی تھی۔ کام کرنا اسے گوارا نہ تھا۔ اس کے خیال میں یہ باعزت نہ تھا۔ جس حلقے میں وہ رہتی تھی وہ اسے باعزت نہ سمجھتا تھا۔ جن لوگوں میں اس نے پرورش پائی تھی وہ اسے باعزت نہ سمجھتے تھے۔ یہاں جو عورت کام کرتی تھی، اسے بری نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ بری نظروں سے دیکھا جانا نہ چاہتی تھی۔

وہ فیروز سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ وہ کام کرنا نہیں چاہتی۔ ضروری نہیں کوئی اور اس سے شادی کرے۔ وہ کام کرے گی۔ اس نے اپنی رگوں میں سرایت کرتی ہوئی کمزوری کی رَو کو روکتے ہوئے سوچا۔ وہ کسی دفتر میں کام کر سکتی ہے۔ وہ بچوں کو پڑھا سکتی ہے۔ وہ ۔۔۔ لیکن لوگ کیا کہیں گے۔ اسے خیال آیا۔ کہنے کے علاوہ وہ کیا سوچیں گے۔ اسے کام میں یقین نہیں تھا۔ محنت میں یقین نہیں تھا۔ اپنے اندر یقین نہیں تھا۔ یہ قدر اس کے خون میں رچ چکی تھی کہ عزت محض ایک مرد کے دستِ نگر رہنے میں ہے۔ کام عورت کو زیب نہیں دیتا۔ مگر۔۔۔۔

بلا سوچتی رہی اور اپنے آپ کو ڈراتی رہی۔ وہ سوچتی رہی اور خون سرد پڑتا گیا۔ وہ سوچتی رہی اور سو گئی۔

صبح جب وہ اٹھی تو اس کی طبیعت پر بار نہ تھا۔ غبار اس کے ذہن سے چھٹ گیا تھا۔ اسے یاد تھا وہ رات کو کیا سوچ رہی تھی۔ دفتروں میں کام کرنے اور بچوں کو پڑھانے کا کام اس وقت اسے بے ہنگم لگ رہا تھا۔ وہ نئی زندگی جو چند لمحوں کے لئے اس نے رات کو پائی تھی پھر اسے موت کے آغوش میں دبک کر سو گئی تھی۔ وہ اب پھر ٹھنڈے دل سے سوچ رہی تھی۔ کل رات اس نے کافی بے وقوفی کا ثبوت دیا۔ اس نے خود کو بتایا۔ جب سب کچھ ہو ہی چکا تھا تو پھر خواہ مخواہ جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ تھا۔ خاص کر جب شکست اس کی نہیں ہوئی تھی۔ وہ نہایت بے وقوف ثابت ہوئی ہے۔ اس نے ساحل پر پہنچنے سے پہلے چپّو پانی میں پھینک دئیے تھے!

شام کو کلب میں اس نے نوٹ کیا کہ فیروز اس سے الگ رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بلا کے راستے میں نہ آتا تھا۔ بلا اس کے لئے تیار نہ تھی۔ اس نے یہ ضرور سوچا تھا کہ ممکن ہے فیروز اسے منانے میں ہچکچاہٹ محسوس کرے۔ لیکن وہ اسے موقعہ دے گی۔ وہ فیروز کو اپنے منانے کے لئے ہر قسم کی سہولت دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ من جانے کے لئے تیار ہو کر آئی تھی۔ لیکن اب فیروز اس سے کترا رہا تھا۔ جیسے وہ اس جھگڑے کا بہانہ لے کر رشتہ توڑنا چاہتا ہو۔

اس احساس نے ایک لمحہ کے لئے اسے پھر زندہ کر دیا۔ وہ کام کیوں نہیں کر سکتی۔ وہ کام کر سکتی ہے۔ اس نے سوچا۔ لیکن اس خیال کے ساتھ ہی اسے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ ایک حقارت اس کے دل میں بیدار ہوئی جو شاید کام کے لئے تھی۔ یا شاید فیروز کے لئے۔ فیروز برج کھیل رہا تھا۔ اچانک بلا کو محسوس ہوا کہ وہ اکیلی ہے۔ کہیں لوگ دیکھ نہ لیں۔ قیاس نہ کریں کہ ان دونوں کے درمیان ناچاقی ہو گئی ہے۔ اس خیال سے وہ ڈر گئی۔ وہ نہ چاہتی تھی کہ لوگوں کو معلوم ہو۔ وہ ہال سے باہر چلی گئی۔

بہت دیر بعد اس نے فیروز کو اندر کلب کی روشنی میں سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ باہر فیروز کی کار میں بیٹھی تھی۔ اس نے اس جھگڑے کے لئے خود کو ملامت کی تھی۔ اپنے تئیں قصوروار ٹھہرایا تھا۔ وہ فیروز کو منانا چاہتی تھی۔ آج اسی رات۔ کل ممکن ہے بہت دیر ہو جائے۔ کل ممکن ہے یہ خلیج اور عریض ہو جائے۔ کل ممکن ہے وہ منایا نہ جا سکے۔

فیروز کار کے پاس آ گیا۔ پھر اس نے کار کا دروازہ کھولا۔ پھر وہ رک گیا۔

"تمہیں یہاں پانے کی امید نہ تھی۔" اس نے بلا کو دیکھ کر کہا۔

"مجھے گھر تک چھوڑ دو۔" بلا نے ملامت سے جواب دیا۔

فیروز کار میں بیٹھ گیا۔

کار سڑک پر آ گئی۔

کار خاموشی میں سڑک پر چلتی رہی۔ خاموشی حائل تھی۔ بلا کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ کیا کہے گی۔

"کتنی پرسکون رات ہے۔ ساحل پر چل کر بیٹھیں گے؟"

"مجھے نیند آرہی ہے۔" فیروز نے جواب دیا
"تمہیں نیند نہیں آرہی، تمہیں غصہ آرہا ہے۔"
"ممکن ہے، مجھے معلوم نہیں۔"

"اوہ ڈارلنگ ——" ہلا نے کہا جیسے وہ بے بس ہے۔ فیروز نے سٹیرنگ پر سے ہاتھ ہٹایا۔ ہلا کو معلوم تھا وہ جیب سے سگرٹ نکالنا چاہتا ہے۔ اس نے فیروز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے فیروز کی جیب سے کیس نکالا اور سگرٹ اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔

"ماچس ادھر کی جیب میں ہوگی۔" فیروز نے اس کے ہاتھوں میں سے ہاتھ نکالتے ہوئے کہا۔

ہلا دوسری جیب میں سے ماچس نکالنے کیلئے جھکی۔ اس کا جسم فیروز کی پشت سے چھو رہا تھا۔ اسے فیروز کو منانا ہے۔ اس نے اپنا جسم فیروز کے جسم سے ملا دیا۔ اس نے فیروز کو بغل گیر نہیں کیا لیکن جیسے ممکن ہو وہ اس کے جسم کے ساتھ چپک گئی۔ اپنا بازو اس کے شانے پر رکھے ہوئے، اپنے جسم کا وزن اس کی پشت پر ڈالے ہوئے، اپنے جسم کی حرارت کو اس کے جسم میں جذب کرتی رہی اور کئی لمحے گزر گئے۔

"ماچس۔" فیروز نے کہا اور ہلا نے سنا اس کی آواز مختلف تھی۔

"مجھ سے ناراض مت ہو۔" بہت دھیمی آواز میں جیسے ہلا نے اپنے آپ سے کہا۔

کار ساحل پر پہنچ گئی تھی، کار کی رفتار کم ہوگئی، پھر رک گئی اور وہ دونوں اتر کر ساحل کے اندھیرے میں چلے گئے۔

اس دن سے ہلا نے یہ فکر کرنی چھوڑ دی تھی کہ وہ حاملہ ہو جائے گی۔ اب وہ ہونا چاہتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہی وہ تنکا ہے جو اسے ڈوبنے سے بچا سکتا ہے۔ اس نے تنکے کا سہارا لے لیا تھا۔ فیروز کے روٹھ جانے کے بعد اسے یقین نہیں تھا کہ وہ منایا جا سکے گا۔ لیکن اب اس نے فیروز کو منا لیا تھا۔ اب وہ فیروز کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دے گی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خود کو ماں بننے دے گی۔ ماں بن کر وہ فیروز سے شادی کو کہے گی۔ اسے یقین تھا فیروز اس وقت انکار نہیں کر سکے گا۔ اسے فیروز کی شرافت پر اعتبار تھا۔

آج اب اسے یقین ہوگیا تھا کہ وہ حاملہ ہوگئی ہے۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے اسے ایک تسکین ہوئی۔ بارش ختم ہو چلی تھی اور کھڑکی کے شیشوں پر بوندیں ساکت ہوگئی تھیں۔ وہ صوفے پر اٹھ بیٹھی۔ شام ہوا چاہتی تھی اور اسے کلب جانے سے پہلے خود کو سنوارنا تھا۔ آج اسے فیروز کو بتانا تھا۔ آج اسے فیروز سے شادی کو کہنا تھا۔

سحر ہونے تک

ناصر شمسی کے نو ڈراموں کا دلآویز مجموعہ۔ ناصر شمسی کے آرٹ میں فلسفہ اور ادب کا ایک حسین امتزاج ہے۔ جس نے اس کے ڈراموں کو انتہائی دلنشیں، اثرانگیز اور فکر انگیز بنا دیا ہے۔ قیمت تین روپے۔

مکتبہ اردو لاہور

مہندر ناتھ

آخری ساتھی

کمرے میں ایک عجیب قسم کا سناٹا تھا۔ دسمبر کا مہینہ اور کڑاکے کی سردی۔ بجلی کا قمقمہ سردی میں ٹھٹھر رہا تھا۔ اور سرد یخ بستہ ہوائیں خنک آہیں بھرتی ہوئی، نیم کے پتوں سے گذر رہی تھیں۔ رمیش نے سردی سے مجبور ہو کر اپنی ٹانگیں سکیڑ لیں۔ اور کہنے لگا "رانی یونہی بیٹھے بیٹھے ایک قصہ یاد آ گیا۔ اب تو میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ رگوں میں وہ خون کی تیزی نہیں رہی۔ گفتار میں روانی غائب ہے۔ اور چال میں نقاہت اور ڈھیلا پن سا آ گیا ہے۔ سر کے بال اُڑ گئے ہیں۔ اور چہرے پر جھریوں کا ایک جال سا بچھ گیا ہے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں جوان تھا۔ جسم میں سختی تھی، تناؤ تھا۔ رگوں اور پٹھوں میں فولاد کی سی قوت تھی۔ خون میں ایک بے پناہ ہیجان تھا، جوش تھا۔ گرمی تھی۔ کسی نے ایسی ویسی بات کی کہ جھٹ سے ہی تھپڑ رسید کیا۔ اُن دنوں میں کافی خوبصورت تھا۔ میری فراخ پیشانی اور چوڑے چکلے سینے کو دیکھتے ہی عورتیں دل لٹا بیٹھتی تھیں۔ اور میں کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا۔ اُن دنوں ایک رنڈی مجھ سے عشق کرنے لگی۔"

رمیش کی بیوی کے ہاتھ سے سوئٹر گر گیا۔ اس کی بھویں سکڑ گئیں۔ اس نے اپنے خاوند کی طرف چھلکتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اور کہنے لگی "چھی چھی۔ آپ کو رنڈیوں سے بھی محبت تھی؟" اور اس میں حقارت اور نفرت کا جذبہ تھا۔

"گو وہ رنڈی تھی لیکن دل کی بہت صاف تھی۔ بہت ہی نیک اور خوش گفتار تھی۔"

"رنڈیاں بھی کہیں نیک ہوا کرتی ہیں؟" رانی نے جوش میں آ کر کہا۔ اور سوئٹر اٹھا کر بننے لگی۔

"جہاں تک نیکی اور شرافت کا تعلق ہے میں صاف صاف کہوں گا کہ اُس سے بہتر عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔"

"تو پھر اُس رنڈی سے کیوں نہ شادی کر لی۔ مجھ سے کیوں جھک ماری؟"

"تمہاری بات کا میں پھر جواب دوں گا۔ پہلے میری بات سن لو۔ تو ہاں۔ میری اور اُس کی محبت میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا۔ رنڈیوں کے ہاں۔ تم جانتی ہو، بہت سے آدمی آتے جاتے ہیں۔ یہی اس کے پرانے واقف کار۔ اور کچھ نئے گاہک۔ ان میں سیٹھ بھی تھے۔ بابو بھی تھے۔ ان پڑھ بھی تھے۔ پڑھے لکھے بھی تھے۔ مذہب میں یقین رکھنے والے بھی۔ اور دہریے بھی۔ مسلم لیگی بھی اور کانگرسی بھی۔ لیکن وہ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتی تھی۔ اُس نے ہندو مسلم میں کبھی تفریق نہ کی۔ امیر اور غریب کو ایک ہی نظر سے پرکھا۔ جو اس کا ریٹ دے۔ وہ اُس کے ساتھ سو جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ اُسے روپیہ سے محبت تھی۔ نہ کہ انسانیت سے۔ جب میں اُس کی زندگی میں داخل ہوا۔ تو میں نے اُسے اِس راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ شروع میں اُسے یہ بات ناگوار گذری لیکن آہستہ آہستہ وہ میری باتوں کا یقین کرنے لگی۔ اور اُس نے اپنے پرانے واقف کاروں کو اپنے گھر میں آنے سے روک دیا۔ اس کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجھے کیوں چاہنے لگی۔ وہ مجھ سے اتنی مرعوب کیوں ہو گئی۔ کیا وہ میرا چوڑا چکلا سینہ دیکھ کر مجھ پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ یا میری دیانت داری اور خلوص کی قائل ہو گئی تھی۔ یا میرے حسن پر مرمٹی تھی لیکن ایک بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں جاٹ کا بچہ ہوں۔ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتا ہوں۔ مار پیٹ میں یقین رکھتا ہوں۔ اور جب غصہ آ جائے تو دھول دھپے سے گریز نہیں کرتا۔ میں اکثر اُسے پیٹا کرتا تھا۔ جوں جوں میں اسے مارتا۔ اُس کی محبت میں اور اضافہ ہوتا جاتا۔ اُن دنوں میں اچھے خاصے روپے کماتا تھا۔ کچھ روپے گھر بھیجتا اور جو باقی بچتے۔ وہ اس کو دیتا۔ میں اکثر ہر شام اُس کے گھر جاتا۔ وہ ہر شام میرا انتظار کرتی

اور جب کبھی ذرا دیر ہو جاتی تو وہ سوالوں کی بوچھاڑ کرتی۔ کیوں دیر لگا دی۔ کہاں گئے تھے۔ گھر سے کب نکلے تھے۔ کہاں رہے۔

میں برابر اُس کے ساتھ سویا کرتا تھا۔

"بے شرم ہو جی" رانی نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"اس میں شرم کی کیا بات ہے"

"بات کرنے کا ڈھنگ تو آنا چاہیے۔" رانی نے جھینپ کر کہا۔

"خیر، اگر یہ بات تمہیں ناگوار گزری ہے تو بھئی مجھے معاف کرنا۔ میں تمہارے جذبات کا احترام کرتا ہوں لیکن یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر تمہیں کوئی خاص اعتراض ہو۔ اس قسم کے فقرے منہ سے نکل ہی جاتے ہیں۔ بہرحال میں اُس کے ساتھ ایک خاوند کی طرح رہنے لگا۔"

"یعنی آپ نے اُس رنڈی سے شادی بھی کر لی تھی" رانی نے لفظ رنڈی پر زیادہ زور دیا اور حیرت زدہ نگاہوں سے روشن کی طرف دیکھنے لگی۔

"شادی تو جناب میں نے صرف آپ سے کی ہے۔ اُس کے ساتھ تو میں صرف سوتا تھا اور وہ بھی عین جوانی میں۔ اُس وقت جبکہ میں نہ آپ کو جانتا تھا۔ اور نہ ہی پہچانتا تھا۔ اور نہ ہی اس بات کی اُمید تھی کہ آپ کے ساتھ میری شادی ہو جائے گی۔"

"اب پچھتانے سے کیا فائدہ۔ پہلے ہی سوچ بچار کی ہوتی۔"

"اچھا یہ کھڑکی تو بند کر دو۔ کمبخت پھر کھل گئی۔ یہ ٹھنڈی ہوائیں برداشت نہیں کر سکتا۔"

رانی نے اُٹھ کر کھڑکی بند کی۔ باہر ہوا چیخ رہی تھی اور رات اپنی خوفناک نگاہوں سے بستی کو گھور رہی تھی۔

"گو وہ لڑکی خوبصورت نہ تھی" روشن نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن بدصورت بھی نہ تھی۔ اُس کے نقش دلکش نہ تھے۔ گال کچھ پھولے ہوئے، اور چپٹے چپٹے سے۔ مگر ہونٹ رسیلے اور پتلے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی لیکن معصوم مکاری اور عیاری سے بھرا۔ ہاں جسم خوبصورت تھا۔ اور جب کبھی ساڑھی پہنتی۔ تو جسم کا ہر نقش ابھر آتا تھا۔ ساری پہننے کا انداز کوئی اُس لڑکی سے سیکھتا۔ تمہاری قسم ان ساڑھی پہننا کوئی آسان بات نہیں۔ یہ تو ایک آرٹ ہے۔ کپڑے پہننا۔ بات چیت کرنا۔ خاوند کی خدمت کرنا۔ یہ باتیں اگر سلیقے سے کی جائیں تو یہی سلیقہ ایک فن بن سکتا ہے۔ آرٹ بن سکتا ہے۔"

"آپ آرٹ پر بحث مت کیجیے گا۔ اُس رنڈی کی کہانی سنائیے گا" رانی نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں تو میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ مجھے بھی اُس لڑکی سے محبت ہو گئی تھی اگر میں اُس کے پاس کسی دن نہ جاتا۔ تو رات بھر مجھے نیند نہ آتی۔ اگر وہ کسی سے ہنس کر بات کرتی۔ تو مجھے غصہ آ جاتا لیکن میں یہ کہنے سے گریز نہ کروں گا۔ کہ اُسے بھی مجھ سے عشق ہو گیا تھا۔ اور عشق میں ہر بات جائز ہے یعنی ہنسنا، رونا، سینما جانا، شراب پینا، گالی بکنا، خوش رہنا۔ اور جب موقع ملے محبت کرنا۔ ہماری زندگی کافی خوشگوار تھی گو کبھی کبھی لڑائی ہو جاتی۔ لیکن وہ فوراً مجھے منا لیتی تھی!"

اُن دنوں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے لیکن میری دیدہ دلیری دیکھو کہ میں ہر شام اُس کے گھر جاتا۔ اور بے خوف و خطر اُس کے گھر رہتا۔ اس کے پڑوس میں چند سود خور پٹھان بھی رہتے تھے اور پٹھانوں سے اُس لڑکی نے قرض لے رکھا تھا۔ اور وہ پٹھان اُسے اکثر ڈرایا دھمکایا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی مجھے بھی گالیاں دیتے تھے۔ کہ کمبخت یہاں آ کر عیش کرتا ہے لیکن روپے نہیں دیتا۔ لیکن اُن دنوں خون کی گرمی اس قدر تیز تھی کہ میں اُن کے سامنے سینہ تان کر چلتا۔ اور بے دھڑک بات کرتا لیکن وہ چوں تک نہ کرتے تھے کیونکہ اُس محلے میں ہندوؤں کی آبادی مسلمانوں سے زیادہ تھی۔ ایک بار اُس نے مجھ سے کہا۔

"یہ بلو کون تھی؟"

"وہ اُسی لڑکی کا نام۔"

"تو کیا کہا بلو نے؟"

کہنے لگی "احمد آباد سے ایک سیٹھ آیا تھا"

"کون سیٹھ" میں نے چونک کر کہا

"پرانا واقف کار ہے میرا"

"ابھی تک تمہارے پرانے واقف کاروں کی قطار ختم نہیں ہوئی۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ تمہارے کتنے واقف کار ہیں۔ برابر دو سال سے دیکھ رہا ہوں کوئی نہ کوئی تمہارا یار آ ٹپکتا ہے۔"

"یہ سیٹھ بہت ہی اچھا آدمی ہے روشن جی" بلو نے ہنس کر کہا۔

"بلو مجھے ہمیشہ روشن جی کہہ کر بلاتی تھی" "ہر سیٹھ اچھا ہوا کرتا ہے۔ اور جس کے پاس روپے ہوں۔ اس میں برائی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں روشن جی" بلو نے میرے گالوں کو انگلیوں سے سہلاتے ہوئے کہا "یہ سیٹھ بہت ہی اچھا آدمی ہے یہ شراب بہت پیتا ہے۔ روپے بہت خرچ کرتا ہے اور مجھ سے بہت ہی پریم کرتا ہے"

"کرتا تھا یا کرتا ہے؟" میں نے چمک کر پوچھا۔

"کرتا تھا روشن جی" "بجے ایک دو بار آیا۔ تو میں نے اُسے کھری کھری سنا دیں۔ اور میں نے اُس سے صاف کہہ دیا۔ کہ میں نے کب کا دھندا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے اب اس لائن سے نفرت ہو گئی ہے۔ کون اس میں پڑے۔ اور اب تم میرے پاس نہ آیا کرو۔"

"کس دن آیا تھا وہ؟"

"پرسوں رات۔"

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"میں نے سوچا، آپ یونہی گرم ہو جائیں گے۔ اس لئے چپ رہی۔"

"دیکھو بلو۔ یہ بہت بُری بات ہے" میں نے سینہ باہر نکالتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے کسی دوسرے آدمی سے عشق کیا تو مجھ سے بُرا اور کوئی نہ ہوگا میں جس سے عشق کرتا ہوں صرف اُسی سے عشق کرتا ہوں میں اُسے کسی دوسرے سے عشق نہیں کرنے دیتا۔ چاہے وہ تمہارا پرانا واقف کار ہو۔ یا نیا۔"

"سچ بات تو یہ تھی رانی۔ کہ مجھے بھی اس رنڈی سے عشق ہو گیا تھا میں اُسے کسی قیمت پر چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ دراصل وہ تھی بہت کام کی عورت! — یعنی عشق گیا بھاڑ میں۔ وہ میری بہت خدمت کرتی تھی۔ میری دیکھ بھال کرنا۔ میرے کپڑوں کو سینا۔ جرابوں کو دھونا۔ بالوں میں تیل لگانا۔ صاف اور ستھرے کپڑے پہننا، محبت اور پیار سے پیش آنا۔ اور سب سے زیادہ جو چیز مجھے پسند تھی۔ وہ یہ۔ کہ وہ مجھ سے بہت کم روپے مانگتی تھی یعنی جتنے روپے دیدیئے۔ اسی پر قناعت کرتی تھی۔ ورنہ رنڈیوں کے متعلق تم جانتی ہو۔ امیر کو بھکاری بنانا تو ان کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ جب تک امیر کی کھال نہ ادھیڑ لیں چھوڑتی نہیں گویا چمڑی بیچتی ہیں۔ ہڈی چھوڑ دیتی ہیں"

"بلو نے پھر کیا جواب دیا؟" رانی نے سر پر ٹوپی پہنتے ہوئے پوچھا۔

کہنے لگی "نہیں، رمیش جی۔ بھلا ایسی بھی کیا بات ہے۔ تمہاری قسم مجھے اب کسی سے محبت نہیں۔ میں صرف تمہاری ہوں۔ اور تمہاری ہی رہوں گی۔"

× × × × ×

لیکن اُس دن کے بعد میرے دل میں شبہ سا پیدا ہو گیا۔ دوسرے دن جب شام کو میں ہو کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ بلو صبح سے غائب ہے۔ اس وقت چھ بج چکے تھے۔ میں نے سوچا وہ کہاں جا سکتی ہے۔ اس دو سال کے عرصے میں بلو نے کبھی اس قسم کی حرکت نہ کی تھی۔ جہاں کہیں جاتی تھی۔ مجھ سے پوچھ کر جاتی تھی۔ دراصل مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔ بلو کی اس حرکت پر۔ کبھی میں بلو کے کمرے میں جاتا اور کبھی باہر کھڑا ہو جاتا۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔ اور میں نے سینما جانے کی ٹھانی۔ جونہی میں سینما کے قریب پہنچا۔ یکایک ایک موٹر آہستہ سے میرے قریب سے نکل گئی۔ اس میں ایک لڑکی بھی۔ اُس نے مجھے دیکھا اور میں نے اُسے۔

"بکھلتی تھی؟"

"بلو تھی۔ رانی؟"

بلو کو کار میں دیکھتے ہی میرا خون کھول اُٹھا۔ اُسی وقت واپس لوٹا۔ اب جی چاہ رہا تھا کہ گھر پہنچتے ہی سالی کا گلا گھونٹ دوں۔ بڑی پاکباز بنی پھرتی ہے کہتی ہے میں نے دھندا چھوڑ دیا ہے مگر رنڈی ہے۔ رنڈی پر اعتبار کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اور پھر مجھے اپنے آپ پر غصہ آتا۔ اور اپنے آپ پر لعنت بھیجتا۔ کہ کمبخت عشق کرنا تھا تو کسی اچھی شریف زادی سے کیا ہوتا۔ بھلا ایک گھٹیا ذلیل ٹاٹ کی رنڈی سے عشق شروع کر دیا۔ مبتی ہیں اور کوئی عورت نہ تھی کیا۔ یہ سوچتے سوچتے میں مکان کے اندر داخل ہوا۔ بلو کپڑے اتار رہی تھی۔

"نمستے جی"۔

لیکن میں نہ رک سکا۔

"کہاں گئی تھیں تم" میری آواز میں بجلی کی کڑک تھی میرے ناک کے نتھنے پھول گئے تھے۔ سانس کی روانی تیز ہو گئی تھی۔ اور غصے سے الفاظ منہ سے نہ نکلتے تھے۔

بلو نے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

"کہاں گئی تھیں"۔ میں غصے سے کانپ رہا تھا میرے ہاتھوں میں بلا کی سختی آ گئی تھی۔

"بازار گئی تھی" بلو نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ پہلی بار میں نے اُن آنکھوں میں بے حیائی دیکھی۔

"پیدل آئی ہو یا کار میں"؟

"پیدل" اُس نے نڈر ہو کر کہا۔

"کیوں جھوٹ بکتی ہو" میری آواز میں غصہ تھا تحکم تھا۔

"تمہاری قسم میں پیدل آئی ہوں"

بلو کے منہ سے جونہی یہ الفاظ نکلے کہ میں نے زور کا تھپڑ رسید کیا داہنے گال پر تھپڑ پڑتے ہی اُس کے منہ سے خون نکلنے لگا۔

"حرامزادی رنڈی کی اولاد جھوٹ بولتی ہے۔ ابھی تو کار میں آ رہی تھی۔ مجھ کو دیکھ کر منہ چھپا لیا۔ اور کار کو تیز کرا لیا۔ بتاؤ کہاں گئی تھی۔ اور کس کے پاس گئی تھی"۔ وہ بالکل سن ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈھلک پڑے۔ لیکن میرا غصہ کم نہ ہوا۔ میں نے چنگھاڑ کر کہا۔ "کہاں گئی تھیں"؟

وہ پھر خاموش رہی۔ آنکھوں سے آنسو ڈھلکتے رہے۔ اور میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔

اُس کی خاموشی میرے غصے کی آگ پر تیل کا کام دے رہی تھی۔ سلگتی ہوئی آگ شعلہ فشاں ہو گئی۔ اب جی میں آ رہا تھا کہ اس رنڈی کا گلا

گھونٹ دوں۔ مار مار کر بے ہوش کر دوں۔ ناک کاٹ ڈالوں اور گدھے پر سوار کر کے اتنے جوتے ماروں کہ عمر بھر یاد رکھے۔ سالی کمینی کہیں کی میرے نام کو بٹہ لگا دیا۔ عزت کا نام ذہن میں آتے ہی مجھے اور غصہ آیا۔ اور میں نے بلو کی چوٹی پکڑی۔ اور زور سے کھینچا۔ وہ لپکتی ہوئی صوفے سے نیچے آگری۔ گرتے ہی میں نے دو تین مکے رسید کئے۔ اور لاتیں ماریں۔ لیکن اتنی مار کے بعد بھی وہ خاموش رہی۔

"اور مارو جی بھر کر مارو۔ تاکہ تمہارا جی خوش ہو جائے۔" بلو نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"تم بھی اپنا جی خوش کر آئی ہو نا۔ بتاؤ کتنے روپے لائی ہو۔" اور میں نے جلدی سے اس کا بلاؤز ٹٹولا لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ میں کچھ کھسیانہ سا ہو گیا لیکن گالیوں کی بارش کم نہ ہوئی۔ "الو کی پٹھی، بے شرم، بے حیا کہیں کی، حرامزادی، لوفر۔" اور میں گالیاں بکتا گیا۔

"ہاں ہاں گالیاں بھی دو، اور مار و بھی۔"

"میں گالی بھی بکوں گا، اور ماروں گا بھی ——— اگر اپنی جان کی سلامتی چاہتی ہو تو یہ بتاؤ کہ تم کہاں تھیں۔"

"سیٹھ کے پاس گئی تھی۔"

"کیسلا گئی تھی۔"

"وہ کل رات یہاں آیا تھا۔"

"وہ پرسوں بھی تمہارے پاس آیا تھا۔ اور کل رات بھی۔ یعنی ہر رات تمہارے پاس آتا ہے" میں نے چونک کر کہا۔ اور دو تین تھپڑ اور رسید کئے۔ اب بلو سے نہ رہا گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور ساتھ ساتھ یہ کہتی گئی۔ "وہ کل رات یہاں آیا تھا۔ رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ دیکھا تو جانی بابو تھا۔ میں اس سیٹھ کو جانی بابو کے نام سے پکارتی ہوں۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ میں نے کہا جانی بابو۔ اس وقت تم یہاں کیوں آئے۔ اس نے کہا۔ بلو مجھے اندر آنے کی اجازت دو۔ میں پل بھر تمہارے سنگ ٹھہروں گا۔ پھر چلا جاؤں گا۔ اس کی آنکھوں میں ایک التجا تھی۔ رحم کی درخواست تھی۔ وہ بالکل ایک بھکاری کی طرح میرے دروازے پر کھڑا تھا۔ میں نے اسے اندر آنے دیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ اس نے بہت پی ہوئی تھی۔ شراب کی بوتل اس کی بغل میں تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا میرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور زار و قطار رونے لگا۔

میں نے پوچھا کیوں روتے ہو۔ جانی بابو۔"

تو کہنے لگا۔ "بلو۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بلو میں تمہیں چاہتا ہوں۔ اور بہت چاہتا ہوں۔ جانی بابو نے ایک ہزار کے نوٹ جیب سے نکالے اور میری طرف پھینک دیئے۔ یہ سب نوٹ تمہارے ہیں۔ میں احمد آباد کا رئیس اعظم ہوں۔ میری تین ملیں ہیں۔ میری ملوں میں کئی ہزار مزدور کام کرتے ہیں۔ میں ان کا حاکم ہوں لیکن تمہارا محکوم ہوں۔ اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسے روتے دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اور میں نے سوچا۔ کیا یہ شخص واقعی مجھے بہت چاہتا ہے۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ اس بات سے بہت خوش ہوا۔ اور کہنے لگا۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں اپنے پاس رکھوں گا۔ تم رنڈی نہیں ہو۔ لیکن تم نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ میں کل رات تمہارے پاس آیا تھا۔ لیکن تم نے میرے ساتھ باہر جانے سے انکار کر دیا۔ کل تم نے بتایا کہ تم نے دھندا چھوڑ دیا ہے لیکن بلو۔ مجھے تمہاری یاد ستاتی ہے جب رات کے اندھیرے میں شراب پینے لگتا ہوں تو سارا شراب خانہ تمہاری یاد میں جگمگا اٹھتا ہے۔ اور پھر مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ میں سیدھا تمہارے گھر کی طرف رخ کرتا ہوں۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا۔ مجھے معلوم نہیں۔ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ تم اتنی سندر نہیں۔ خوبصورت نہیں لیکن پھر بھی میں تمہیں چاہتا ہوں۔ اگر میں چاہوں۔ تو بمبئی کی تمام رنڈیوں کو خرید لوں۔ خوبصورت سے خوبصورت رنڈی کو اپنے گھر میں

دکھ لوں۔ لیکن بلو، تم ہی بتاؤ۔ کیا کروں۔ یہ کہہ کر اُس نے بغل سے شراب کی بوتل نکالی۔ اور کہنے لگا۔

"سوڈا منگواؤ۔"

بھلا اس وقت سوڈا کہاں سے منگواتی۔ بڑی مشکل سے اُسے سمجھایا۔ کہ اِس وقت سوڈا نہیں مل سکے گا۔ یہ سنتے ہی اُسے نیند آنے لگی۔ میں نے کہا "جانی بابو۔ اُٹھو گھر جاؤ۔"

"گھر جاؤں۔ گھر کیا کروں گا جا کر۔ میرا کونسا گھر ہے" جانی بابو نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

اور میں نے جانی بابو کو پھر جھنجھوڑا ——— اور کہا "جانی بابو۔ یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ اگر کل کسی نے روشن جی سے یہ بات کہہ دی تو وہ میری کھال ادھیڑ دیں گے۔ پرماتما کے لئے چلے جاؤ یہاں سے نہیں تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔"

"تم میرے ساتھ چلو۔" جانی بابو ضد کرنے لگا۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی میں نے کہا۔

"اس وقت تم جاؤ۔ میں کل تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔"

"تم وعدہ کرتی ہو، کہ کل تم ضرور آؤ گی۔"

"ہاں میں وعدہ کرتی ہوں۔" میں نے اُس کے ساتھ وعدہ کر لیا۔

"مجھے وشواس ہے۔ مجھے وشواس ہے" بڑبڑاتا ہوا جانی بابو لڑکھڑاتا ہوا بوتل بغل میں دبائے ہوئے نکل گیا۔

اُس کے جاتے ہی میں نے آرام کا سانس لیا۔ اچھا ہوا۔ کہ بلا ٹل گئی۔ لیکن جانی بابو کی باتیں واقعی میرے ذہن میں کیل کی طرح چبھنے لگیں یہ سچ ہے، روشن جی۔ کہ میں اُسے عرصہ چار سال سے جانتی ہوں۔ تمہارے آنے سے پہلے وہ ہر سال میرے پاس آتا تھا۔ اور میرے ساتھ سوتا تھا۔ اور مجھے اچھی خاصی رقم دیکر جاتا تھا۔ ایک بار میں سخت بیمار ہو گئی تھی۔ خوش قسمتی سے جانی بابو میری بیماری کے دوران میں اِدھر آ نکلا۔ اُس نے مجھے ایک ہزار روپے دیئے اور علاج کرانے کے لئے دہلی بھیج دیا۔ وہ جب کبھی آتا ہمیشہ شراب پی کر آتا۔ نہ اُس نے کبھی مجھے گالی بکی نہ کبھی مارا۔ وہ پچھلے سال بھی آیا تھا۔ وہ مجھ سے ملا۔ اور پھر چلا گیا۔ میں تمہاری قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں اُس کے ساتھ نہیں سوئی میں نے بہانہ بنا کر اُسے واپس لوٹا دیا۔ وہ اِس سال پھر آیا۔ میں نے اُسے صاف صاف بتا دیا۔ کہ وہ میرے گھر نہ آئے لیکن وہ باز نہیں آتا میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ غنڈا نہیں بدمعاش نہیں۔ لچا نہیں۔ لفنگا نہیں لیکن وہ یہاں آنے سے باز نہیں رہتا۔

"رات جب وہ آیا تو اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جب میں نے تمہارا نام لیا۔ تو وہ گھبرا سا گیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جیسے خلا میں کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔ اور پھر زار و قطار رونے لگا۔ اُسے روتے دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے سوچا۔ اس شخص نے میرے ساتھ کیا بُرائی کی ہے۔ جب بھی میرے ہاں آیا۔ اچھی رقم دی۔ میں اِس کے ساتھ بدسلوکی کیوں کروں۔ گالی کیوں دوں۔ منہ پر کیسے تھوک دوں۔ بڑی مشکل سے چپ کرا کے اُس کو واپس لوٹا دیا۔

"اور جب صبح ہوئی۔ تو میں نے سوچا۔ اُس کا یہاں آنا ٹھیک نہیں۔ اگر تمہیں اِس بات کا علم ہو گیا تو تم مجھے مار ڈالو گے۔ اور ہمیشہ کے لئے چھوڑ دو گے۔ اِس ڈر کی وجہ سے میں اُس کے گھر چلی گئی۔

"جانی بابو ایک دوست کے پاس ٹھیرا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔ میرے ساتھ تمہارا ذکر رات بھی تھا۔ اسی دا اسے پوچھ لو۔ اگر اُس شخص نے میرے جسم کو چھوا ہو تو میری بوٹی بوٹی کاٹ لو۔ اگر میں اُس کے پاس سوئی ہوں تو اپنے باپ کے پاس سوئی ہوں۔ تمہاری قسم۔ اپنی جوانی کی قسم اگر اُس شخص نے مجھے ہاتھ تک بھی لگایا ہو۔ جانی بابو اُس وقت ہوش میں تھا۔ لیکن میز پر شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔

"شراب پیوگی؟" اُس نے کہا۔

مَیں نے ہاں کر دی۔

اُس نے مجھے ایک چھوٹا پیگ دیا۔

اور میں نے پی لیا۔"

"کیا تم رومیش کو بہت چاہتی ہو؟" جانی بابو نے مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں ——میں رومیش جی کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتی۔"

"یہ سنتے ہی وہ خاموش ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ برف کے تودے سے ٹکرا گیا ہو۔ وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اور شراب پیتا رہا۔ اور میری طرف دیکھتا رہا۔ اور جب میں اُٹھنے لگی تو میرے قریب آیا اور کہنے لگا "بلو میں کل چلا جاؤں گا۔ اور دوبارہ تمہارے دروازے پر کبھی قدم نہ رکھوں گا" یہ سنتے ہی میں جلدی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ اور وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ میں ایمان کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ کہ جانی بابو کو واقعی مجھ سے محبت ہے پیار ہے۔ وہ صرف رنڈی باز ہی نہیں۔ انسانیت کا جذبہ اُس میں ضرور ہے۔"

یہ کہہ کر بلو خاموش ہو گئی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ چانٹا اتنے زور کا پڑا تھا۔ کہ اُس کا داہنا گال سوج گیا تھا بلو نے میری طرف دیکھا۔ اور کہنے لگی۔ "رومیش جی، تم نے مجھے ناحق مارا۔ اس میں میرا کیا قصور تھا"—— یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ چمٹ گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں خود اپنے کیے پر نادم تھا اور آج تک نادم ہوں۔ میں نے فرطِ محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اُس کے بالوں کو چوما۔ اُسکے گالوں کو سہلایا۔ اُسکے رخسار کو چوما۔ اور اُس سے [illegible] باتیں کیں۔ اور اس کے بعد دوبارہ بلو کے گھر کبھی نہ گیا۔"

"دوبارہ کبھی نہیں؟ وہ کیوں؟" رانی نے یہ الفاظ اس لہجے میں کہے۔ جیسے ابھی خواب سے جاگی ہو۔

"بلو کا آخری ساتھی اُس سے چھن چکا تھا۔ میں صرف اکیلا تھا۔ بھلا میں ایک رنڈی سے کس طرح شادی کرتا۔"

"کمینے" رانی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ زندگی میں پہلی بار اس کے منہ سے گالی نکلی تھی۔ لیکن رومیش اپنے ہی خیال میں کھویا ہوا بیٹھا تھا رانی کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اور وہ اُٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دئے۔

باہر کالی سیاہ اندھیری رات تھی۔ اور ٹھنڈی یخ بستہ ہوا خراٹے بھرتی ہوئی گذر رہی تھی۔ دور ایک اُلو چیخ رہا تھا۔ اور کمرے میں بجلی کا قمقمہ۔ اُداس۔ مضمحل۔ سردی سے اکڑا ہوا۔ رانی کو پریشان نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

اور پھر رومیش نے کھانستے ہوئے کہا۔ "اور اب جب کبھی بلو کی تصویر میرے سامنے آتی ہے تو میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور جب اس بات کا خیال آتا ہے کہ بلو آج کل کیا کرتی ہو گی۔ کیا وہ زندہ ہے یا مر گئی ہے۔ کیا وہ کسی مندر میں سر منڈوا کر پرماتما کے نام کا جاپ کرتی ہو گی۔ یا ابھی تک کسی نکڑ میں لالٹین کا سہارا لیکر اُس کی اندھی روشنی میں کئی اجنبی قدموں کی چاپ سنتی ہو گی۔ تو میرے سینے میں درد و کرب کا لاوا پھوٹنے لگتا ہے۔ سانس گلے میں رُک جاتا ہے۔ اور زندگی کی جوت مدھم ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اُس وقت سوائے اس کے کہ میں ملتجی آنکھوں۔ اور کچھ نہیں کر سکتا۔"

اے حمید

تعریف اُس خدا کی.....

کیفے ڈی رابن میں بیٹھے بیٹھے جب شام ڈوب جاتی ہے تو ہال کمرے کی منقش چھت سے لٹکتی ہوئی مومی شمعوں کی نرم اور پرسکون نیند ٹوٹ جاتی ہے اور فرش پر بچھے ہوئے پرانے قالینوں کے رنگ ان کی دھندلی چمک میں زیادہ پژمردہ نظر آنے لگتے ہیں۔ جھومتی ہوئی پھولوں بھری ڈالیوں کی مانند محو رقص جوڑوں کے قدموں میں رقص نامکمل دائرے بن کر پھیلتا ہے اور پھیل کر ٹوٹ جاتا ہے۔

اور بار ہر مال کافوری فانوسوں کی روشنی میں دور تک جگمگا اٹھتی ہے۔

اور ٹوج، کوٹی، پونڈز.... مال کی دلہنیں....

بکھرے ہوئے سگریٹ، خالی ڈبیاں، مسلے ہوئے پھول..... دلہنوں کا سہاگ۔

ڈاکٹر تم نے کسی ایسی دلہن کو دیکھا ہے جس کا سہاگ.....

تم ادھر ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟ جین ابھی نہیں آئی۔ لیکن وہ ضرور آئے گی۔ وہ تم پر جان چھڑکتی ہے۔

یہ آج رم کا رنگ کیسا ہے؟ اس میں پانی زیادہ ڈال دیا گیا ہے کیا؟

"ڈ بٹر"؟

"یس سر!"

"اٹھاؤ اسے اس میں پانی زیادہ ہے، یہ کیا حماقت ہے؟"

"یس سر"

"یس سر کا بچہ ——"

جین بڑی وردمند لڑکی ہے ڈاکٹر میں اسے پسند کرتا ہوں۔ وہ چست اور بھڑکیلا لباس بہت کم پہنتی ہے۔ وہ لپ اسٹک اور پاؤڈر بالکل استعمال نہیں کرتی۔ مگر کبھی کبھی جب سگریٹ سلگانے میری طرف جھکتی ہے تو کولڈ پونڈز کی ٹھنڈی خوشبو ضرور محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بھورے نرم بال پیٹ اور پھولوں کی گتھلوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ گریٹا گاربو کی طرح وہ انہیں سادگی اور لاپروائی سے بناتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر اس کے چہرے پر جگہ جگہ سرخ سرخ دانوں کے نشان کیسے ہیں؟ کچھ عرصہ پہلے تو اس کے چہرے کی جلد پگھلے ہوئے موم کی طرح نرم اور بے داغ تھی۔ یہ میرے خیال میں خون کا جوش ہے۔ شاید اسی لئے وہ پاؤڈرز اور وکس باقاعدہ استعمال کرتی ہے۔ ویسے عموماً اس کا چہرہ بڑا دلکش نظر آتا ہے۔ مگر تم اس کے لئے کوئی اچھا سا نسخہ کیوں نہیں تجویز کرتے......؟

بخدا۔ تمہیں اس کا کوئی خیال نہیں ہے اور وہ بیچاری محض تمہاری خاطر ہسپتال میں کئی کئی گھنٹے ڈیوٹی سے غیر حاضر رہتی ہے۔ تمہیں یاد ہے ایک بار تم نے کہا تھا: "جین ڈیوٹی سے غیر حاضر مت ہوا کرو۔" اور اس نے کہا تھا: "ڈاکٹر میری اصل ڈیوٹی اس وقت شروع ہوتی ہے جب میں تمہیں ملنے کوارٹر سے نکلتی ہوں، ورنہ میں اپنی ڈیوٹی سے کبھی غیر حاضر نہیں ہوتی" —— جین کی آنکھوں

میں اس وقت کیتی جیپ اور محبت تھی۔ اسے تمہارا بہت خیال رہتا ہے ڈاکٹر۔

وہ سگریٹ نہیں پیتی تھی۔ اسے شراب اور ہندوستانی لباس سے نفرت تھی۔ مگر تمہارے لئے جبین سگریٹ بھی پیتی ہے۔ تمہارے ساتھ بیٹھ کر وہ اب شراب کے کئی پیگ چڑھا جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی ہندوستانی لباس میں ملبوس وہ تمہارے ہمراہ سینما پر بھی چلی جاتی ہے۔

کبھی تم نے اس بارے میں بھی سوچا کہ جبین نے سگریٹ اور شراب کب شروع کی؟

تمہیں وہ دن یاد ہے جس روز ریگل میں "LIFE-BOAT" کا صرف ایک شو تھا اور میں تمہیں بھی ساتھ لیجانے کیلئے تمہارے پاس ہسپتال پہنچا تھا۔ تم برآمدے میں ایک جگہ کھڑے ایک دبلی پتلی، نیم سپید اور کھلے بالوں والی نرس سے باتیں کر رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں بیسن تھا جس میں اوزار اور زخموں پر سے اتاری ہوئی زرد زرد روئی تھی۔ تم دونوں بات بات پر مسکرائے جا رہے تھے۔ یہ منظر آنکھوں کو ٹھنڈک بخشنے والا تھا۔ اور اگر مجھے شو کا خیال نہ ہوتا تو میں تمہارے رومان میں کبھی مخل نہ ہوتا۔ میرے ذرا کھانسنے پر تمہاری نظر مجھ پر پڑی اور وہ نرس چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی تیزی سے اپریشن روم کی طرف گھوم گئی۔ تم میری طرف بڑھے اور مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور مجھے اپنے آپ پر اس نرس کا شبہ ہوا جو مجھے دیکھ کر اپریشن روم کی طرف بھاگ گئی تھی۔ تم نے بتایا تھا

'اس کا نام جبین ہے۔ ناگپور سے تبدیل ہو کر آئی ہے۔ بڑی شریف لڑکی ہے۔ سگریٹ اور دیگر منشیات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے'

اور ڈاکٹروں کو......؟

اور تم قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔ تمہارے قہقہے کی آواز سن کر برآمدے میں پڑے ہوئے کئی مریضوں نے گردنیں پھیر کر ہمیں دیکھا تھا۔ تمہیں اس کی خبر نہیں تھی۔

کچھ دنوں بعد تم دونوں لارنس کے اوپن ایر ٹی سٹال میں تھے۔ اس روز تم نے مجھ سے جبین کا تعارف کروایا۔ دن ڈھل رہا تھا اور دھوپ کا رنگ بھورا سنہری مائل ہو رہا تھا۔ ہمارے سروں پر بیچ کا چھوٹے تنے والا گھنا درخت تھا۔ اس کے سائے میں لطیف خنکی تھی۔ ہم چائے پی رہے تھے۔ یہ میرا پہلا موقع تھا کہ میں نے جبین کو اچھی طرح دیکھا۔ نیم سپید رنگ کی ایک سادہ سی لڑکی جس کی آواز میں ہمدردی اور ملائمت تھی اور جو بڑی دلچسپی سے چائے پی رہی تھی۔ اس کے نرم رخساروں کے کناروں پر مدھم سی گلابی جھلک نمایاں تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ بے داغ تھا اور وہاں سرخ دانوں کا کوئی نشان نہ تھا۔

ٹی سٹال سے اٹھنے کے بعد جب ہم ایک خاموش اور سایہ دار سڑک پر چلے جا رہے تھے تو میں نے غور سے دیکھا جبین دایاں پاؤں ذرا دبا کر چلتی تھی۔ جس نے اس کی چال میں بڑی عجیب دلکشی پیدا کر دی تھی۔

تیسرے دن اتوار کی شام کو میں ایک مشہور کتاب گھر میں قسم قسم کی کتابیں اٹھا کر دیکھ رہا تھا کہ میں نے سامنے والے قد آدم آئینے میں سے جبین کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ ہلکے خاکستائی رنگ کے لباس میں ملبوس تھی اور اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا سبز رنگ کا بیگ تھا۔ اس ملاقات کا ذکر میں نے تم سے کبھی نہیں کیا۔

وہ ایک جگہ کونٹر کے شیشے پر بیگ رکھے کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔ یوں ظاہر کرتے ہوئے گویا میں اسکی موجودگی سے بیخبر ہوں میں بھی اس کے بالمقابل پہنچ کر ایک البم دیکھنے لگا۔

"ہیلو..." جبین نے مجھے دیکھ کر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

"ہیلو جبین"

اس کے کانوں میں وہی ننھے منے خریدے ہوئے بُندے تھے۔ سپید اور ہلکے نیلے نگوں والے ——

"یہ کتاب کیسی ہے؟" جبین نے ہارورڈ سپرنگ کی "فانی سن فانی سن" میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے تو پسند نہیں"

"مجھے پسند ہے۔ اور میں نے اسے تیسری بار پڑھنا شروع کیا ہے" اس نے بڑے اطمینان سے کہا گویا اسے میری پسند یا ناپسند کی کوئی پروا نہیں تھی۔

"یہ بُندے بڑے خوبصورت ہیں۔ کیا دام اُٹھے تھے؟" اور میں نے دیکھا جبین کے کانوں کی لوئیں ریشمی ہو کر سُرخ ہو گئیں۔

اس نے کتاب کے صفحے پر نظریں گاڑے لرزتی آواز میں کہا

"یاد نہیں رہا"

نادان لڑکی مجھ سے اپنی محبت کا راز چھپانا چاہتی تھی۔ مجھے اس کی اس بیہودہ کوشش پر ترس آگیا اور یہ جانتے ہوئے کہ جبین سگریٹ نہیں پیا کرتی میں نے سگریٹ کیس اس کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ میں تمباکو نہیں پیتی" اور وہ خدا حافظ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ جیسے اس مکان میں اس نے کوئی خوفناک شے دیکھ لی ہو۔

...... وقت گزرتا گیا۔ شہر کے باغات میں پھلدار درختوں نے کئی بار لوگوں کو اپنے لذیذ پھلوں سے نوازا۔ شہر سے باہر کھیتوں میں کئی دفعہ فصلیں کٹیں اور دفعہ لوٹی گئیں۔

جبین تمہارے اور نزدیک آگئی۔ لارنس کی سایہ دار پُرسکون گذرگاہوں پر سے گذرتے ہوئے اس نے کئی بار تمہارے بازوؤں سے اپنا سر لگا کر نیم خوابیدہ آواز میں اپنی محبت کا اعتراف کیا۔

"ڈاکٹر —— میں ہر دم، ہر گھڑی تمہیں اپنے قریب دیکھنا چاہتی ہوں"

"جبین —— اس سے پہلے بھی تم نے کسی سے محبت کی ہے؟"

اور اس دردمند بھولی لڑکی نے کتنی صاف گوئی سے اپنے محبوب کے سامنے اپنا دل کھول دیا تھا۔

"نہیں —— بالکل نہیں ڈاکٹر ......

اتنی شدت سے میں کبھی کسی کی گرویدہ نہیں ہوئی —— مجھے یاد ہے ناگپور میں میرا ایک بھتیجا تھا۔ اس کا نام جوزف تھا۔ وہ نویں جماعت میں تھا اور مجھ پر بری طرح فدا تھا۔ ڈاکٹر تم سن کر ہنسو گے۔ جوزف مجھ سے آٹھ سال چھوٹا تھا مگر مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہر روز ہمارے ہاں آتا تھا اور کبھی خالی ہاتھ نہیں آتا تھا۔ کبھی کوئی مٹھائی لے آتا۔ کبھی کوئی کریم کی ڈبی، کبھی پھل اور جب اسے کچھ نہ ملتا تو نرگس کے لمبے ڈنٹھلوں والے پھول ہی لے آتا تھا ——

مجھے بھی اس سے تھوڑی سی محبت ہو چلی تھی۔ دراصل محبت کی بجائے مجھے اس پر ترس آتا تھا۔

پھر میری تبدیلی یہاں ہو گئی —— نہ جانے وہ کیا کرتا ہو گا۔ بیچارا بڑا بھولا بھالا سا تھا"

اور تم نے پوچھا تھا۔

"جینی اگر تمہاری محبت اسے یہاں کھینچ لائے"؟

اور جینی نے چمک کر کہا تھا۔

"تو میں اسے دھکے دے کر اپنے کوارٹر سے باہر نکال دوں گی"۔

....

کرسمس کا تہوار آ گیا۔ تم نے میرے ہوسٹل میں جینی کو دعوت دی۔ اس شام تم کتنے گھبرائے ہوئے تھے۔ جیسے تم نے کسی کو قتل کرنے کا ارادہ کیا ہوا ہو۔ جینی آئی۔ میرے خدا۔ ڈاکٹر اس شام وہ کتنی دلفریب لگ رہی تھی۔ آج اس نے لپ سٹک اور کوٹی بے تکلفی سے استعمال کی ہوئی تھی۔ اس کا نچلا ہونٹ اصلی گلاب کی گہری سُرخ پتی کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔

کھانے کے دوران میں تم نے جینی کو جنجر بیئر میں وائٹ جن ملا کر پلا دی۔ جیسے وہ بالکل محسوس نہ کر سکی۔ تھوڑی دیر بعد تم نے اسے دوسرا پیگ بھی پلا دیا ——— کھانے کے بعد تم نے امریکن لطیفے سنانے شروع کر دیئے۔ جینی قہقہے لگا کر ہنس رہی تھی۔ مگر میں اس کی لحہ بہ لحہ گھلتی ہوئی آنکھوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا میرا سر درد کرنے لگا ہے، اور تم نے اندر جا کر جنجر بیئر میں اور جن ملا دی۔

اور پھر جینی مسلسل مسکرا رہی تھی اور تمہیں تکے جا رہی تھی۔ اس کے جسم سے سرمستی و بیخودی فوارے کی مانند پھوٹ رہی تھی۔ تم نے مجھے اشارہ کیا۔ میں دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ صوفے پر نیم دراز میں نے سگریٹ سلگایا اور کتاب پڑھنے لگا۔

اس دوران میں میں نے کئی بار جینی کے قہقہوں اور گلاس کے ٹکرانے کی آوازیں سُنیں۔

جینی بالکل مدہوش ہو چکی تھی۔

کتاب پرے رکھ کر، سگریٹ بجھا میں صوفے پر ہی سو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر تک سویا رہا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی خواب ایسی کیفیت میں میں نے سنا۔ جینی تمہیں کہہ رہی تھی

ڈاکٹر آج کا دن مقدس دن تھا۔ آج حضرت مریم کے بطن سے ہمارا پیغمبر پیدا ہوا تھا۔

ڈاکٹر، میں نے آج تک کسی سے شادی نہیں کی میرا شباب شعلے کی طرح پاک اور بے داغ ہے۔ میں نے آٹھ سال بیمار انسانوں کی خدمت کی ہے —— میں کسی کو مصیبت میں نہیں دیکھ سکتی۔ اور میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ——

...... تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو ڈاکٹر

مسیح کی قسم میرا شباب شعلے کی مانند ہے......

اور وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی تھی۔

جوزف —— میرا ننھا محبوب۔ نہ معلوم وہ لمبے ڈنٹھلوں والے نرگس کے پھول کہاں لے جا رہا ہو گا۔

میرے جوزف! —— میرے محبوب!! —— میرے بچے!!!

ڈاکٹر —— میں نے آٹھ سال......

اور تم اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے —— دن نکل آیا۔ جینی ادھ موئی سی ہو رہی تھی۔ اور تم مسکرا رہے تھے..... پھر سگریٹ اور شراب اس کی زندگی کا جزو بن گئے۔ ڈی رائین میں تمہیں شراب کے نقصانات گنوانے والی جینی خود شراب کا آرڈر دینے لگی۔ اور رفتہ رفتہ اس کے شباب کا وہ شعلہ جو اس کے الفاظ میں پاک اور بے داغ تھا۔ دھوئیں

"کی" ایک لکیر میں بدل گیا اور جین کے چہرے پر سُرخ دانوں کا ایک جال بچھ گیا۔

تمہیں یاد ہے ڈاکٹر ایک رات اسی جگہ بیٹھے بیٹھے جین نے کہا تھا۔ وہ شراب میں بدمست تھی۔

"ڈاکٹر اپنی بیٹی مجھے دے ڈالو۔ میں اسے پڑھا لکھا کر مہذب بناؤں گی۔ اپنے سے بھی زیادہ مہذب۔ اور جب وہ جوان ہو جائے گی تو اسے اپنے ساتھ فرانس لے جاؤں گی۔ وہاں کئی ڈمی رائمین ہیں اور کئی "ڈاکٹر" ہیں اور تمہاری بیٹی میرے پاس رہے گی —— تمہاری نشانی بن کر۔

تم گھبرا رہے تھے اور اس کی زبان چل رہی تھی۔ وہ بولے جا رہی تھی بکے جا رہی تھی۔ تیز رفتار ندی کی طرح جو فراز کوہسار سے نچان کی وادیوں کی طرف بہتی ہوئی اپنے ساتھ کئی پتھر، جلی کٹی جھاڑیاں اور زہریلے جنگلی سانپ بہا کر لے جاتی ہے۔

—— میں سگریٹ نہیں پیتی۔ مجھے شراب سے نفرت ہے۔ میں نے آٹھ سال بیماروں کی خدمت کی ہے۔ میں مریم ہوں۔ میں نائٹنگیل ہوں .....

جوزف بھی مجھے چاہتا ہے۔ ڈاکٹر بھی چاہتا ہے —— سبھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اگلے کرسمس میں ان سب سے شادی رچاؤں گی۔ جوزف سے بھی۔ ڈاکٹر سے بھی اور ہارورڈ سپرنگ سے بھی —— میں نے اس کا ناول چار مرتبہ پڑھا ہے۔ —— وہ لندن میں —— رہتا ہے۔ جوزف ناگپور میں ہے۔

میں ان کو بلاؤں گی .....

ڈاکٹر..... میرا سگریٹ! ..... میری شراب!!

میرا شعلہ!! —— مائی سن! مائی سن!! .... اور جین رونے لگی۔

ہمارے گرد کی میزوں پر سے لوگ ہمیں دلچسپی سے تک رہے تھے —— تم گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور بڑی ہم نے اُسے بڑی مشکل سے تانگے میں بٹھا کر اس کے کوارٹر تک پہنچایا تھا۔

تم بڑے نیک دل ہو ڈاکٹر —— تم جین کے لئے شراب اور ہندوستانی لباس مہیا کرتے ہو جنہیں وہ صرف تمہاری خاطر استعمال کرتی ہے۔ جین کی مانند تم سے بھی کسی کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔ تم بھی چھ سات سال سے غریب بیماروں کی خدمت کر رہے ہو۔

باقی تمہیں یاد ہے بالی کے لئے بھی تم نے بہت کچھ کیا تھا۔ جین تو پھر بھی خوش قسمت ہے۔ کما لیتی ہے۔ مگر بالی کا تو سوائے ایک بوڑھی ماں اور ایک چھوٹی بہن کے اور کوئی نہ تھا۔ تم فرشتہ بن کر ان کے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ تم اچھی طرح سمجھتے ہو تم نیکی کرنے کے بعد اکثر اسے دریا میں ڈال دیتے ہو۔ یہ تمہاری پرانی عادت ہے۔ وہ رات یاد کرو جب وہ ہلکی بارش میں ہم اندرون شہر کی پرپیچ گلیوں میں سے گذر رہے تھے۔ سردی اور بارش کے باعث کیچڑ بھری گلیاں اور ویران تھیں۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ ہم اس علاقے میں کیا کرنے گئے تھے —— بہرحال ہم کیچڑ اور گڑھوں سے بچتے ہوئے سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ کہیں کہیں کسی مکان کے روشندانوں پر ہلکی زرد روشنی کے دھبے سے دکھائی دیتے اور یا کسی جگہ بچے کے رونے کی کمزور آواز سنائی دے جاتی۔

ایک جگہ گلی کا موڑ مڑتے ہی ہمیں کسی آدمی کے تیز تیز چلنے کی آواز سنائی دی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو ایک شخص

کے بڑھے ہوئے چھجے کے نیچے دو تین آدمی کھڑے تھے۔ قریب پہنچ کر تم بھی یونہی ٹھہر گئے۔ وہ آدمی جو سیڑھیوں میں کھڑی کسی عورت سے جھگڑ رہا تھا اچانک تم سے مخاطب ہو گیا،

"جناب، ایک تو تین ماہ سے مکان کا کرایہ ادا نہیں کیا اور پھر اوپر سے دھونس کہ جو کرنا ہے کر لے۔
میں بھی آج پوری رقم لے کر ہی ٹلوں گا۔ دیکھتا ہوں کون مائی کا لال مجھے اٹھاتا ہے۔"

"مائی کا کوئی لال ہوتا تو تمہاری گردن سامنے نالی میں ہوتی ـــــ" یہ آواز سیڑھیوں کے اوپر والے دروازے سے آئی تھی، اور اس میں آنسوؤں کی نمی اور تھرتھراہٹ تھی۔ اور تم نے منہ اندر لیجا کر کہا تھا۔

"دیکھئے آپ کرایہ ادا کیوں نہیں کر دیتیں؟"

اوپر سے آنسوؤں بھری وہی کمزور آواز پھر آئی

"میرے لال! تیرے جیسا جوان بیٹا لڑائی پر گیا ہوا ہے۔ تین ماہ سے اس کا کوئی منی آرڈر نہیں آیا۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ تین ماہ کا کرایہ کہاں سے دیں ـــــ؟" اور تمہارا دردمند دل پسیج گیا تھا۔ تم نے مالک مکان کو اپنا ایڈریس دیتے ہوئے کہا کہ تم کل رقم ادا کر دو گے۔ بوڑھی ماں تمہیں دعائیں دیتی رہ گئی۔ دوسرے روز تم نے کل حساب صاف کر دیا اور تیسرے روز تم اس گلی میں خود پہنچ گئے۔ بوڑھی عورت نے تمہیں کھڑکی میں سے دیکھ لیا۔ (اس وقت تم اس گلی کے تین چکر لگا چکے تھے)۔ وہ تمہیں لینے کیلئے خود گلی والے دروازے میں آئی۔

"اوپر آؤ بیٹا!"

تم نے مصنوعی انداز میں کچھ پس و پیش کیا اور پھر اوپر چڑھ گئے۔ اوپر سوائے دو تنگ تنگ اور سیلے سیلے دو نیم روشن کمروں، ایک مختصر دالان، دو تین چارپائیوں، ایک دو کرسیوں اور چند برتنوں، صندوقوں اور ایک چرخے کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ تمہارا دماغ چکرا گیا۔ تمہیں اوپر آنے پر افسوس ہونے لگا۔ بوڑھیا نے جلدی سے لوہے کی ٹھنڈی کرسی پر اپنا دوپٹہ بچھا دیا۔ جسے تم نے اٹھا کر اسے واپس کر دیا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا کھاؤ گے بیٹا؟ ہم تو غریب ہیں۔ پھر بھی غریبی دعوے کا جو کچھ ہے حاضر ہے۔"

تم نے انکار کر دیا۔ تم کچھ بے چین تھے۔ اور تمہاری بے چینی سچی تھی۔ بھلا اس بڑھیا سے تمہیں کیا واسطہ تھا۔ تم نے نیکی کی تھی اور تم اسے حسب عادت دریا میں ڈال چکے تھے۔ بوڑھی بدستور اصرار کر رہی تھی۔

"اچھا اور نہ سہی ایک پیالہ چائے ہی پی لو ـــــ بیٹی بالی ذرا پانی تو گرم کرنا۔"

بالی ـــــ تم دفعتہً چونک سے پڑے۔ جیسے تم نیکی دریا میں ڈالنے گئے تھے اور وہاں کوئی جل پری دیکھ لی ہو اور تم نیکی نکال کر وہیں بیٹھ گئے ـــــ بالی اس بوڑھیا کی جوان بیٹی تھی۔ تم خود بخود بڑھیا سے باتیں کرنے لگے۔ وہی گھر جو ایک لمحہ پہلے ویران اور بے رنگ تھا اور جہاں تمہیں گھٹن محسوس ہو رہی تھی اب طرح طرح کی دلچسپ اور رنگین چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور تم سوچ رہے تھے کہ چائے کے بعد تم وہاں بیٹھ کر کھانا بھی کھا سکتے ہو۔

اور تمہیں یاد ہے تم نے اس رات کھانا بھی وہیں کھایا۔

تم ہر دوسرے تیسرے بالی کے گھر جانے لگے۔ وہاں پہروں بیٹھے تم بالی کی ماں کو دنیا جہان کی باتیں سناتے رہتے۔ شروع شروع میں بالی تم سے پردہ کرتی تھی۔ مگر اب اس کا آنچل سرکنے لگا تھا۔ وہ کئی بار دوپٹہ کئے تمہارے پاس سے ہو کر

گذر جاتی۔ کچھ دیر یہ بھی دور ہو گیا اور ایک روز تم نے بالی کو سر سے پیر تک بھرپور نظر سے دیکھا۔ سانولے رنگ کی ایک عام وضع قطع کی لڑکی جس کا جوان اور پکا ہوا جسم موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ اگرچہ وہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ مگر تمہارے سامنے کم بولتی تھی۔ لیکن بتدریج بالی تم سے گفتگو بھی کرنے لگی۔ محلے میں تمہاری بابت چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ مگر بالی کی ماں سیانی اور تجربہ کار عورت تھی۔ اس نے مشہور کر دیا کہ تم اس کے دور کے رشتہ میں بیٹے ہو۔ تم بہت خوش ہوئے کہ نہانے دریا تک جا کر مچھلیاں پکڑنے میں اب کوئی روکاوٹ نہیں رہی تھی۔ بالی کے گھر جا کر اس کے بیٹے کی بابت باتیں کرنے یا لڑائی کے تازہ حالات پر روشنی ڈالنے کے علاوہ تم نے وہاں اطمینان سے دو تین گھنٹے گذارنے کی ایک اور سکیم تیار کر لی۔ تم نے بالی کی چھوٹی بہن کو جو دوسری جماعت میں تھی پڑھانا شروع کر دیا۔ اس کی ماں تمہاری اس مہربانی پر پھولی نہ سماتی تھی۔

سردیوں میں اکثر رات گئے تک تم بالی کی چھوٹی بہن کو پڑھاتے رہتے۔ اس کی ماں ایک طرف بیٹھی چرخے پر ریشم کات رہی ہوتی۔ بالی اپنی چارپائی پر لحاف میں گھسی کبھی آنکھیں بند کر لیتی اور کبھی چمکیلی آنکھوں سے تمہیں دیکھنے لگتی۔ اور اس کی چھوٹی بہن دیئے کی ٹمٹماتی روشنی میں اسکول کا سبق دُہرا رہی ہوتی۔ اردو کی دوسری کتاب اس کے گھٹنوں پر ہوتی اور وہ معصوم انداز میں کوئی کہانی یا نظم پڑھ رہی ہوتی تھی۔

تمہاری تنخواہ اور بالائی آمدن کا کافی حصہ بالی کے گھر پر خرچ ہونے لگا۔ اس دوران میں بالی کے بھائی کا کوئی منی آرڈر نہ آیا۔ جو نہ جانے بر ما کے کون سے محاذ پر دشمن سے برسر پیکار تھا۔ — تقریباً چھ ماہ سے مکان کا کرایہ نہیں ادا کر سکے تھے۔ بالی کی ماں بھلا ریشم اور سوت کی اٹیاں گھما گھما کر یہ تمام خرچ کیسے اٹھا سکتی تھی۔ ہر ہفتہ راشن منگواتے۔ نقد روپے کم ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ایک مدت سے تم پورا کر رہے تھے۔ بالی کی چھوٹی بہن تینوں کا دوپٹہ اور اونچی ایڑی کا سینڈل پہن کر اسکول جاتی تھی۔ اور خیر بالی کے لئے تو دو تین ریشمی سوٹ تیار ہونے ہی تھے۔

تم بڑی دیر سے نیکی کے دریا پر بنسی لٹکائے بیٹھے تھے۔ مگر جل پری گہرے پانیوں میں تھی۔ بہر حال تمہاری بنسی کی ڈور آہستہ آہستہ گہرے پانیوں میں اتر رہی تھی۔

ایک دن ....

اور وہ دن تمہیں اچھی طرح یاد ہو گا ڈاکٹر ....

جب تم بالی کے ہاں گئے تو وہ گھر میں تنہا تھی۔ اس کی ماں ریشم اور سوت دینے بازار گئی ہوئی تھی اور چھوٹی بہن ابھی سکول سے واپس نہ ہوئی تھی۔ بالی تمہیں اور اپنے تئیں اس گھر میں تنہا دیکھ کر کچھ گھبرا گئی تھی۔ اس کی ہر حرکت میں ایک اضطراری کیفیت تھی۔ جیسے اسے کسی ان ہونی شئے کے ہو جانے کا دھڑکا لگا ہو —— وہ تمہارے لئے چائے بنا رہی تھی اور تم خاموشی سے اس کی حرکات کو تکے جا رہے تھے۔ اس دوران میں نہ تم بولے تھے اور نہ ہی بالی نے کوئی بات کی تھی۔ چائے بنا کر اس نے اسے ایک خوبصورت پیالے میں جسے تم خرید کر لائے تھے، ڈالا اور تمہاری طرف بڑھی۔

بروکیڈ کے زرتار سوٹ میں ملبوس، پیالی ہاتھ میں اٹھائے، مناسب اور متوازن قدم اٹھاتی ——

تمہیں اپنی جل پری کا خیال آ گیا۔ تمہاری بنسی کو ڈور کا جھٹکا سا لگا۔ اور تم نے پیالی تھامنے کی بجائے بالی کا ہاتھ تھام لیا۔

"چائے گر جائے گی" بالی کی آواز خشک تھی۔ تم نے اٹھ کر آہستہ سے پیالی کرسی پر رکھ دی۔ بالی نے ایک جھرجھری لی۔

"کوئی آ جائے گا" اور تم نے بالی کے پکے ہوئے ہونٹوں پر اپنا منہ رکھ دیا۔ بالی کا جسم ٹھنڈا تھا اور کانپ رہا تھا۔ دفعتہً

سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز آئی۔
بالی تڑپ کر تمہاری آغوش سے نکل گئی۔ تم کرسی پر بیٹھ گئے۔ دروازے میں بالی کی ماں نمودار ہوئی۔ اس نے حسب عادت پہلے تمہارا سر چوما اور پھر ہاتھ پھیرا۔
تمہیں یاد ہے تم نے اس روز مجھے کہا تھا۔
"میں نے آج ایک عجیب قسم کی خوشبو سونگھی ہے۔ یہ خوشبو بالی کے اوپر والے ہونٹ۔ ۔۔۔ میرا مطلب ہے مونچھوں والی جگہ سے اٹھ رہی تھی۔ ایسی خوشبو میں نے کسی پھول اور کسی کریم یا سینٹ میں نہیں محسوس کی۔ اس خوشبو میں ایک علیحدہ اور انوکھی کیفیت تھی۔ یہ کیفیت اگر میں چاہوں بھی تو بیان نہیں کر سکتا ۔۔۔"

....

اور پھر ایک رات آئی ۔۔۔
سیاہ آسمان اور چمکیلے ستاروں والی ایک عام رات ۔۔۔
تم بالی کے ساتھ ایک کمرے میں تھے۔ دالان میں باہر بالی کی ماں سوت کات رہی تھی اور اس کے قریب ہی بالی کی چھوٹی بہن مدھم روشنی میں اسکول کا سبق یاد کر رہی تھی۔ دیئے کی لو کانپ رہی تھی۔ سوت کی تکلیاں مدھم غنود کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔ اچانک بالی کی چھوٹی بہن نے پوچھا ۔۔
"ماں"
"کیا ہے؟"
"آپی کی شادی ڈاکٹر بابو سے ہوگئی ہے؟"
"ہاں بیٹا"
اور اس کمسن بچی نے منہ پھلا کر کہا تھا۔
"پھر ڈھولک کیوں نہیں بجائی ماں۔ ہمیں مہندی کیوں نہیں لگائی تو نے۔ تم جھوٹ کہتی ہو ماں"۔
"آپی کی شادی نہیں ہوئی ۔۔۔" دیئے کی لو کانپ اٹھی تھی اور بوڑھی ماں نے منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ وہ بچی کو آنسو نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا تھا
"سبق یاد کرو اچھی"
اور وہ کمسن اچھی اپنا سبق یاد کرنے لگی تھی
سہ تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
اور تم بیگی کے دریا میں چل پڑی کے ساتھ گہرے پانیوں میں اتر چکے تھے

....

ڈائنیو پر موسیقی شروع ہو گئی ہے ......
یہ کونسے سُر ہیں ڈاکٹر؟ ۔۔۔
تم نے تو مغربی موسیقی کا مطالعہ کیا ہے ۔۔ یہ سُر ۔۔ جیسے شام کے بعد گمنام جزیروں کے زرد ریت ساحلوں

پر سمندر کی لہروں کا والہانہ رقص ـــــ

ڈاکٹر میرے ساتھ رہو۔ میں تمہیں تمہاری نیک دلی کے تیسرے قطب مینار کی طرف لئے جا رہا ہوں

....

یہ مینار بہت دھندلا اور ویران ہے۔ یہاں سوائے نوراں کے اور کوئی نہیں ہے

نوراں ـــــ وہ گندے کپڑوں والی نوجوان لڑکی جو اپنے بوڑھے کوچوان باپ کو ہسپتال لائی تھی۔ اس کا باپ دردِ گردہ میں مبتلا تھا۔ وہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ نوراں کے پاس صرف پچیس روپے تھے۔ لیکن تم نے نوراں کے باپ کے لئے ایک کمرہ وقف کر دیا تھا اور اسے بھی وہیں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔

اس ہمدردی کو دیکھ کر نوراں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ چار یا پانچ مہینوں کے مسلسل علاج کے بعد اس کا بوڑھا باپ بھلا چنگا ہو گیا تھا مگر نوراں بیمار ہو گئی تھی۔

اس کے پیٹ میں ہوا بھر گئی تھی۔ اس کا باپ پریشان تھا۔ تم نے اسے دلاسا دیا اور نوراں کا علاج شروع کر دیا۔ نوراں درست ہو گئی۔ مگر جب وہ ہسپتال سے رخصت ہونے لگی تھی تو یاد ہے اس نے آہستہ سے تمہیں کیا کہا تھا۔

"ڈاکٹر جی مجھے میرے بچے کا غم کھا جائے گا"

اور نوراں کو اس کے بچے کا غم کھا گیا اور بوڑھے کوچوان کو نوراں کا غم کھا گیا اور تم ......

"یہ بکواس ہے"

"یہ تم کیا کہہ گئے ڈاکٹر؟ ـــــ یہ بکواس ہی تو ہے۔ یہ فردوسی کا شاہنامہ نہیں ہے۔ یہ کسی کالیداس کی شکنتلا نہیں ہے۔ یہ بیمار جیون ہے۔ یہ غم نصیب بالی ہے اور یہ مردہ نوراں ہے ـــــ یہ ویران خانقاہیں ہیں ـــ یہاں رات کو الو بولتے ہیں اور دن کو کتنے خائف اڑاتے ہیں۔ یہ مہیب کھنڈرات ہیں۔ جیون سے لیکر نوراں اور نوراں سے تمہاری بیوی تک ـــ سب بکواس ہے...... اس دریا کی تہ میں بہت سی جل پریاں ہیں... یہ تمہارا دریا ہے جہاں پہنچ کر تم اپنی ہر نیکی کو غرقِ آب کر دیتے ہو۔ یہیں جیون ڈوبی اور پھر بالی اور پھر نوراں اور پھر.........

ڈائیس پر نغمہ شروع ہے۔

اس میں کس قدر سکون اور ٹھہراؤ ہے۔ نغمے کی بے زبان لہریں بڑے پیار سے کانوں، ہونٹوں اور آنکھوں کو چومتی محسوس ہوتی ہیں۔ ان میں ایک انوکھی کیفیت ہے ڈاکٹر ـــ اس خوشبو کی مانند جو بالی کے، ویپ والے ہونٹوں سے اٹھ رہی تھی اور جسے تم کوشش کے باوجود بیان نہیں کر سکے تھے ـــ

یہ سب بکواس ہے ڈاکٹر

یہ ہال کی چنبیلی سیج کی زرد چہروں والی دلہنیں۔ یہ جلے بجھے سگریٹ......

اور ایسی ہی بکواس جیون نے اس رات کی تھی جب وہ نشے میں چور تھی۔

"ڈاکٹر میں مریم ہوں، نا منگیل ہوں۔ میں نے آٹھ سال بیماروں کی خدمت کی ہے۔ جو نرس مجھے چاہتا ہے

—— میں شعلے کی طرح پاک ہوں —۔

میرے ڈاکٹر! —— میرے جوزف!! —— مائی سَن! مائی سَن!!

....

اور —— "ڈاکٹر جی مجھے بچے کا غم کھا جائے گا"

یہ نوراں کی بکواس تھی۔

....

اور تم بالی کے ساتھ اندر والے کمرے میں تھے۔ باہر دالان میں دئیے کی لَو کانپ رہی تھی۔ ایک طرف بالی کی بوڑھی ماں سوت کات رہی تھی۔ تکلیاں مدھم شور کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔ دوسری طرف اس کی کمسن بچی اسکول کا سبق یاد کر رہی تھی۔ اردو کی دوسری کتاب اس کے گھٹنوں پر رکھی تھی اور وہ ہولے ہولے سر ہلا ہلا کر پڑھ رہی تھی

ــہ تعریف اس خدا کی ....

پانچ دریاؤں کی مقدس سرزمین

سوہنی اور ہیر کی جولانگاہِ محبت میں جب —— چھٹا دریا بہا —— تو

علم اور ادب کے چشمے سوکھ گئے، عشق اور رومان کے نغمے خاموش ہو گئے

چھٹا دریا

جس میں پانی کی سیمگوں لہریں نہیں، بلکہ خون کی سرخ موجیں اچھلتی ہیں —— خون —— پنجاب کے بیٹوں کا خون۔ ہندو، مسلمانوں اور سکھوں کا ملا جلا خون ——

چھٹا دریا، بہتا رہا۔ سامراج کے گھر پر شادیانے بجتے رہے۔ فنکار طبقہ دم بخود کھڑا رہا۔ سماج کے ترقی پسند حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

فکر تونسوی چھٹے دریا کی احمریں لہروں میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔ اور پھر اس نے اس خونیں طوفان کے چھینٹوں کی داستان لکھی۔ روح فرسا اور ہولناک داستان۔ یہ داستان پنجاب کے اس عظیم اور تاریخی المیے کی صحت مند عکاسی ہے۔

یہ داستان —— آنے والی نسلوں کے لئے عبرت انگیز مواد ہے۔ اور سو صفحات کی یہ خونیں کہانی ایک طویل ڈائری کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔

اس ڈائری میں فکر کی وہ دس نظمیں بھی شامل ہیں جن میں فرقہ وارانہ فسادات کی خون آشامیوں کا پرتو ہے (زیرِ طبع)

مکتبہ اردو لاہور

احمد بشیر رومانی

جپسی

بڑے بڑے سرکاری دفتروں کے آس پاس، بڑے بڑے افسروں کے کمرے کے سامنے پڑے ہوئے بنچ پر چپراسی سے دبی آواز میں باتیں کرتے ہوئے، مزنگ کے کسی تھڑے پر ٹاٹ کے ٹکڑے پر اکڑوں بیٹھے ہوئے، سڑکوں کے کنارے چلتے ہوئے، بحالیات کے افسر کے دفتر کے سامنے سر کھجاتے، پیسہ اخبار سٹریٹ میں کسی قہوہ خانے کے دروازے سے جھانکتے ہوئے آپ نے اُسے کہیں نہ کہیں ضرور دیکھا ہوگا

اُس کے ہمراہ چار ایک ساتھی ہوتے ہیں۔ اُن کو مکان یا دکان دلانے، بندوق کا لائسنس دلوا دینے یا نوکری دلانے کے لئے وہ اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوتا ہے۔ ”کیسے نہیں دیگا وہ، بس جڑ سے جڑ ملا دونگا۔۔۔ اماں پہنچ تو لینے دو۔“ وہ بار بار اونچی آواز میں کہتا ہے جیسے اپنے آپ کو یقین دلا رہا ہو۔ اُس کے منہ سے نکلے ہوئے کلمات سُن کر ساتھی کے منہ پر مسکراہٹ کھیل جاتی ہے، پیشانی شکرگزاری کے جذبات سے پُرنم ہو جاتی ہے اور بظاہر اتفاقاً وہ دو قدم رک کر اپنے محسن کے پیچھے چلنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ چاروں طرف مستغنی نگاہ سے دیکھتا ہے، چھاتی اُبھر جاتی ہے، سر تن کر ذرا بلند ہو جاتا ہے اور وہ غیر ارادی طور پر پٹڑی سے اتر کر سڑک پر آ جاتا ہے اور ایک ساعت تک یہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا رہتا ہے۔۔۔ لیکن دفعتاً وہ رک جاتا ہے ”بہت بڑا آدمی ہے وہ۔ ہاں۔۔۔ اور بڑے آدمیوں کے ساتھ سوچ کے بات کرنا پڑتی ہے بھائی۔۔۔“ اُس کے شانے سمٹ جاتے ہیں، گردن جھک جاتی ہے اور وہ سڑک سے ہٹ کر پھر پٹڑی پر آ جاتا ہے۔ ”پر یاروں کی ذاتی غرض تو ہے ہی نہیں۔۔۔ ہاں جی؟“ وہ مسکرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ”وہ بھی ماننے تو۔۔۔ انکار نہیں کرے گا۔ کیسے کریگا انکار؟“ اُس کی رفتار پھر سے تیز ہو جاتی ہے اور وہ پھر پٹڑی سے اتر کر سڑک پر آ جاتا ہے۔۔۔ اور یہ قافلہ یونہی رواں دواں رہتا ہے۔

دوستوں اور واقف کاروں کے بگڑے کام بنانے میں اسے مسلسل مصروف اور پریشان دیکھ کر شک گذرتا ہے کہ وہ دوست نوازی کے پردے میں محض آوارگی کی لذت اخذ کر رہا ہے لیکن یقین جانیئے اس میں ہمدردی اور خلوص کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔

اگر اتفاق سے آپ اُسے تنہا چلتے ہوئے دیکھ پائیں تو ایک ہی نظر میں آپ اسے پہچان لیں گے اس کا انداز اس بات کا شاہد ہوگا کہ وہ کارواں سے کھو گیا ہو۔ ہے! اس کی سنجیدہ وضع، بیتابی، عجلت اور پروقار چال اس بات کو چھپا نہیں سکے گی کہ وہ تنہائی سے ڈر کر بھاگا جا رہا ہے کسی کارواں کی طرف بھاگا جا رہا ہے۔ البتہ بازار پیسہ اخبار یا مزنگ کی کسی چائے گاہ کے دروازے پر اس کی کیفیت قدرے مختلف ہوتی ہے۔ تنہا ہونے کے باوجود وہ یوں تول تول کر قدم رکھتا جاتا ہے جیسے اسے بھاگنے کی ضرورت ہی نہ ہو جیسے وہ تنہا ہی نہ ہو، جیسے وہاں کے جملہ لوگ اُس کے ساتھی ہوں۔۔۔ ”وہ جا رہا ہے ’وہ‘“ بھیڑ میں سے کوئی اپنے ساتھی سے کہتا ہے۔ ”بھئی وہی احسان دانش!“ احسان منہ پھیر کر نہیں دیکھتا۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کے قدم از خود چھوٹے ہو جاتے ہیں اور چال اور بھی متوازن۔

اگر آپ گھر بیٹھے رہنے کے عادی ہیں یا راہ چلتے اپنی دُھن میں مگن رہتے ہیں، آنے جانے کو طبعاً غور سے نہیں دیکھتے تو ممکن ہے آپ نے اس تصویر کو کبھی نہ دیکھا ہو۔ کوئی حرج نہیں۔ آپ ذرا ایجرٹن روڈ تک چلیے، نیلمی ہوٹل سے ذرا آگے نکل کر آپ کو ایک بورڈ دکھائی دیگا

جس پر جلی حروف میں "دانش ورں کمپنی" لکھا دیکھ کر آپ ٹھٹھک جائیں گے ـــــ دانش ور کون؟ عجیب مجموعۂ اضداد ہے۔ لیکن ذرا جھانک کے جھانک کر دیکھئے۔ سامنے ایک بہت بڑا اور بے ڈھنگا میز اور بھدی اور میلی کرسیاں بے سلیقہ دھری ہیں، فرنیچر جانتے ہو فرنیچر لکڑی کا ہے، لوہے کا نہیں، اور درمیانی کرسی پر بیٹھا ہوا آدمی کوئلے کا نہیں گوشت پوست کا بنا ہوا ہے۔ یہ احسان دانش ہے، وہی مشہور شاعر، چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگ نہ تو غزلوں کی اصلاح کے لئے آتے ہیں نہ کوئلے کی گاہکی کو، یہ سب احسان کے دوست ہیں جو اپنا اپنا ایک کام لے کر اس کو ملنے آتے ہیں۔

یہ صاحب پرمٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

وہ صاحب انار کلی میں دکان لینا چاہتے ہیں۔

ان کی بیوی بہت لڑاکا ہے اور یہ چاہتے ہیں کہ احسان خود جا کر بیگم کو سمجھائے۔

اُن کو نوکری چاہیئے۔

یہ نوگرفتار عشق ہیں اور اپنا دکھڑا رو کر تسلی حاصل کرنے کی غرض سے آتے ہیں۔ اور احسان جھٹ پٹ اپنی قلبی تسکین اور اپنا وقت ان سب میں بانٹتا رہتا ہے۔ زبانی مشورے دیتا ہے، عملی مدد کرتا ہے۔ یا وعدے کرتا ہے، جو اکثر ایفا نہیں ہوتے۔ سامنے تازہ نسخہ رکھی ہے، پیچھے کوئلے کے ڈھیر، کوئلے اور شاعر۔ زندگی خود مجموعۂ اضداد ہے۔

وہ دن بھر ادھر اُدھر چیونٹیوں کی طرح پھرتا رہتا ہے اور کسی نہ کسی کوشش میں مسلسل لگا رہتا ہے، نتیجے سے بے نیاز ہو کر کیونکہ نتیجہ سے کوئی دلچسپی نہیں، اسے صرف جدوجہد سے دلچسپی ہے۔ نتائج تو جدوجہد کے تسلسل کو توڑنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اسی لئے اکثر بار آپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ التزاماً نتائج پیدا کرنے سے کترا رہا ہے۔ اسے دوستوں کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی بڑا آدمی مل جائے تو اسے کسی کام کے لئے نہ کہے تو وہ لاشعوری طور پر اُس سے چڑ جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے جیسے اُسے دھوکا دیا گیا ہو۔ اس لئے جو لوگ اسے جانتے ہیں وہ اسے مایوس نہیں کرتے بلکہ ممنون کرتے رہتے ہیں۔

اس خواہش کی تسکین میں وہ نت نئے دوست بناتا اور اُن کے آگے دوستی کے خلاف وعظ جھاڑتا رہتا ہے۔ رات کو قسم کھا لیتا ہے کہ صبح سے کسی کا کام نہیں کرے گا۔ صبح اُٹھتے ہی اس خیال سے گھر سے باہر نکل جاتا ہے کہ کوئی دوست اسے آ کر پکڑ نہ لے لیکن بازار میں پہنچ کر وہ قطعی طور پر بھول جاتا ہے کہ اُس کا مقصد اپنے آپ کو چھپانا ہے نشر کرنا نہیں، پان والے کی دکان پر کھڑا گپیں ہانکنے لگ جاتا ہے یا چائے والے سے مزاج پرسی کرنے لگتا ہے۔ رستہ چلتے کو السلام علیکم کہتا ہے اور اس وقت تک بھٹکتا پھرتا ہے جب وقت تک اُس کا کوئی دوست آ کر اُسے پکڑ نہ لے ـــــ "ارے! پھنس گئے نا" وہ مسکرا کر آپ سے کہتا ہے۔ "آپ ہیں محمود صاحب فرمائیے کیا حال ہے وہ دکان کا کیا ہوا۔" اور پھر چُپ چاپ اس کے ساتھ چل دیتا ہے۔ "نوکری تو مل ہی جائے گی اُستاد" ـــــ ابتدا میں تو آپ سمجھیں گے کہ واقعی احسان دوستوں کے کاموں میں مدد کرنے سے گریز کرتا ہے اور واقعی ہر روز سچے دل سے کوشش کرتا ہے کہ کسی دوست کے ہتھے نہ چڑھ جائے لیکن چند ہی دنوں کے بعد اسے دوستوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار آپ کی ہنسی نکل جائے گی۔ اس سمے احسان کو دیکھ کر آپ کے دل میں اس معصوم کتے کی یاد تازہ ہو جائے گی جو لوگوں کے مظالم کا ستایا ہوا ہوتا ہے اور گوشۂ عافیت ڈھونڈتے ہوئے سڑک کے درمیان دُم پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے اور وہاں سے اٹھنے کا نام نہیں لیتا، جب تک کوئی موٹر یا تانگہ اسے ٹانگ کر کچل نہیں دیتا، وہ چاؤں چاؤں کرتا ہوا اُٹھ بیٹھتا ہے اور گوشۂ عافیت تلاش کرتا ہوا پھر سڑک کے درمیان دُم پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے۔

احسان کو گھر پر ملنا آسان کام نہیں، کیونکہ وہ گھر پر رہتا ہی نہیں، اگر جانے تو آپ کو دیکھ کر باہر آ جاتے گا لیکن آپ ہر طرح

اس کے گھر کے اندر جانے کا اتفاق ہو بھی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا گھر کبوتر خانہ، کتب خانہ، پنساری کی دکان اور مسجد کا دلچسپ امتزاج ہے۔ اس کے گھر میں زیادہ تر تخت پوش، کتابیں، کبوتر کی بیٹیں، ٹین کے ڈبے، پرانے قلمدان اور جانمازیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہیں کہیں ایک آدھ برتن یا ایک آدھ لحاف بھی ملتا ہے جن کی موجودگی سے شک پڑتا ہے کہ یہ گھر ہے۔ دیواروں پر سفیدی نام کو نہیں، لکڑی ریت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ گھر گویا کالی مٹی کے بنے ہیں، تمام چیزوں پر سیاہی ملی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ سامنے ان چیزوں پر احسان کا عکس پڑتا ہے یا احسان کا ان چیزوں پر، لیکن اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ احسان نے گھر کا کل سامان کسی خاص کلر سکیم کے مطابق جمع کر رکھا ہے۔ کمرے میں چار ایک تصویریں ٹنگی ہیں، یہ غالب ہیں، وہ آزاد، دو ایک جگہ احسان کی اپنی سادہ رنگین تصویریں ہیں، جن پر مختلف اشعار لکھے ہیں۔ یہ تصویریں کسی جاذبیت نظر سے نہیں، بلکہ ویسے ہی ٹنگی ہیں، چیزیں کچھ اس سلیقے سے پڑی ہیں گویا ابھی کسی کے حکم کی منتظر ہیں، ہر چیز عام سی، بے فائدہ سی، بے مصرف سی دکھائی دیتی ہے۔ تخت پوش کے پاس ہی چھوٹی سی میز کے اوپر ایک خوبصورت چوکھٹے میں جلی عبارت میں نوٹ لکھا ہے

نوٹ

میرا کوئی عزیز یا دوست اپنے آپ کو مندرجہ ذیل اصولوں سے مستثنیٰ نہ سمجھے:۔

۱۔ میں تفریحی گفتگو کو تضیع اوقات سمجھتا ہوں، اس لئے کوئی صاحب تفریحی گفتگو سے اپنا وقت ضائع نہ کریں۔

۲۔ کوئی صاحب دس منٹ سے زیادہ نہ بیٹھیں، طویل گفتگو کے لئے پہلے سے وقت لیا جائے۔

۳۔ کوئی صاحب میری کسی کتاب کو الٹ پلٹ نہ کریں۔

۴۔ کوئی صاحب مجھ سے میری کوئی کتاب مفت طلب نہ کریں۔

۵۔ مشاعرے میں شرکت کی دعوت دینے والے حضرات سے ۲۰۰ روپیہ نقد اور آنے جانے کا سیکنڈ کلاس کا کرایہ پیشگی لیا جائیگا۔

احسان دانش

سمجھ میں نہیں آتا کہ احسن نے یہ نوٹ دوستوں کے لئے لگا رکھا ہے یا اپنی ہدایت کی خاطر، کیونکہ

۱۔ آج تک میں نے اس چوکھٹے کے سامنے کوئی غیر تفریحی بات نہیں ہوتی۔

۲۔ کبھی کسی نے ملاقات کے لئے وقت مقرر نہیں کیا، اور کیا بھی ہو تو وہ کبھی وقت پر آیا نہیں۔

۳۔ وہاں جو آتا ہے من مانی کرتا ہے، گپیں مارتا ہے، شور مچاتا ہے، سگریٹ پیتا ہے اور کتابیں پھاڑتا ہے۔

۴۔ اس کا کوئی دوست اس کی کتابیں طلب نہیں کرتا، بلکہ خود میز سے اٹھا لیتا ہے۔

۵۔ احسان مشاعرے کے لئے سفر ہمیشہ تھرڈ کلاس میں کرتا ہے، عام طور پر کرایہ گرہ سے دیتا ہے، پاس نہ ہو تو کسی سے مانگ لیتا ہے۔

ورچوکٹھا مہاسبھا سیزن وشیوان ہر آنے جانے والے کا منہ تکتا ہے کیونکہ اس کی کبھی کسی نے پروا نہیں کی، نہ دوستوں نے، نہ خود احسان نے۔ اگر دوست پروا کریں تو احسان ــــــ چڑ جاتا ہے۔

اگر آپ پہلی بار اس سے ملنے آئے ہیں تو یہ سنگین عبارت دیکھ کر آپ ڈر جائیں گے، ہر بات میں احتیاط برتیں گے، بیٹھیں گے تو دیکھ کر بولیں گے تو سوچ کر، کھانسیں گے نہیں، تھوکیں گے نہیں، بار بار گھڑی دیکھیں گے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد آپ دیکھیں گے آپ کا احسان خود بے تحاشہ تھوک رہا ہے، بے تحاشہ کھانس رہا ہے، بے تحاشہ بول رہا ہے، جب تک بیٹھا ہوا ہے، بے تحاشہ پاؤں پسارے ہے، بے تحاشہ ہنس رہا ہے، قہقہے لگا رہا ہے، جیسے اسے اپنے بنائے ہوئے اصولوں کا کوئی خیال نہیں، دس منٹ گزر گئے، بیس منٹ، گھنٹہ ہو گیا۔ آپ گھبرا کر کہتے ہیں۔ "اچھا اجازت" — "ارے" — وہ چونک کر کہتا ہے۔ "اجی نہیں، بیٹھئے بیٹھئے — دیکھو بھئی ذیشان چائے بنی کہ نہیں ابھی" — آپ پھر بیٹھ جاتے ہیں، چائے چلتی ہے، سگرٹ چلتے ہیں، باتیں چلتی ہیں، دنیا بھر کی باتیں — عقل کی، سیاست کی، ادب کی، بے ادبی کی، حسن کی، عشق کی، میری، آپ کی — گھڑی اوندھی رکھ دی جاتی ہے، ریڈیو روک دیا جاتا ہے.. دروازہ غریب جو کھلا — لیکن تھپیڑے اس جھوٹے مظلوم چوکے کو —

احسان ناش پر بیٹھا آرام نہیں کرتا ہے اور باتوں کے دوران میں آپ کے ہاتھوں اور بازوؤں کو جذبات کے زیر و بم کے مطابق چھوتا، پکڑتا، دباتا اور چھوڑتا رہتا ہے، اس کی یہ حرکات اختیاری نہیں، اسے ان کے سرزد ہونے تک کا شعور نہیں، اسے کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ وہ پیلی پیلی آنکھوں کو جلد جلد گھما رہا ہے اب وہ نعروں سے اشارے کر رہا ہے اب وہ اپنے ہاتھوں کی حرکت اور اپنی آواز کے زیر و بم سے بات میں ڈرامائیت گھول رہا ہے آپ کو شدت کے ساتھ متوجہ کر رہا ہے، آپ کو شدت کے ساتھ متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ گفتگو میں تکلف یا بے تکلفی کا اظہار نہیں کرتا، بے تکان اور اکثر اوقات بے سوچے سمجھے بغیر کسی خاص موضوع کے بولتا ہے، بات کو چمکانے کے لئے پنجاب اسٹائل کی گالیوں کا استعمال بھی کرتا ہے جنہیں سن کر آپ کبھی ہنس دیتے ہیں اور کبھی سنجیدہ ہو جاتے ہیں اگر آپ اس سے زیادہ ہنس دیتے ہیں تو وہ سنجیدہ ہو جاتا ہے لیکن اگر آپ اس سے زیادہ سنجیدہ ہو جاتے ہیں تو وہ ہنس دیتا ہے، ہنستا چلا جاتا ہے۔

خدا جانے اس کا طبعی پیشہ کیا ہے، یہ خود اس کو آج تک معلوم نہیں ہو سکا، مثلاً جب اسے سبز چمن شرقی کی گدائی کا کام ملا تھا تو وہ بہت خوش تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے ایک قصائی کا پرسنل اسسٹنٹ ہونا منظور کر لیا اور گدائی کا کام چھوڑ کر بیوپار کے لئے دورے کرنے شروع کر دئے، گاؤں گاؤں پھر کر وہ اپنے آقا کی آسامیوں سے سود وصول کرتا اور اس کا حساب کتاب رکھتا، دو وقت روٹی پکاتا۔ جیسے کیسے اپنے آقا کو نہلاتا دھلاتا، اس کے سوکھے ہوئے کرنگ جسم پر تیل کی مالش اس خلوص اور انہماک سے کرتا جیسے مشقت میں اسے بے حد لطف آ رہا ہو۔ قصائی کے ساتھ کام کرنے میں وہ ویسے ہی خوش تھا جیسے گدائی میں، لیکن جلد ہی اس نے قصائی کی پرسنل اسسٹنٹی چھوڑ کر کوئٹے کی میونسپلٹی میں چپراس حاصل کر لی۔ احسان اور اس کے والد کی دانست میں یہ زندگی کا سب سے بڑا چانس تھا، ایک ایسا چانس جس کے ساتھ اس کا اور اس کے خاندان کا مستقبل وابستہ تھا، اس لئے یہ جگہ حاصل کرنے کے لئے انہوں نے بھاگ دوڑ کر کے چار سفارشیں بھی کسی نہ کسی کی حاصل کیں، اور جب احسان کو آٹھ روپے ماہوار پر چپراسی رکھ لیا گیا تو وہ کئی دن تک ترچھی ٹوپی پہنے چپراس لگائے بازاروں اور گلیوں میں اکڑ اکڑ کر چلتا رہا۔ اس پر دور نزدیک سے مبارک سلامت کے پیغام آئے، یار لوگوں نے ضیافتیں بھی اڑائیں۔ اب وہ دو وقت روٹی کھاتا تھا، اگرچہ سالن کی بجائے چٹنی کے ساتھ، لیکن نمکین پانی میں بھگو کر کھانے سے تو بہر حال بہتر تھا، پھر یہ نوکری سرکاری تھی سرکاری، اور آپ جانتے ہیں ہمارے لئے سرکاری نوکری سے بہتر پوزیشن اور کیا ہو سکتی ہے۔

پہلے پہل نو آموزی کی حالت میں تو احسان ایمانداری سے کام کرتا رہا، سارا دن سرکاری کام کے علاوہ دو وقت سیکرٹری صاحب بہادر کی روٹی پکاتا، دوپہر کو ان کی بیگم کے بڑے پنکھا کھینچتا، اور باقی وقت چوکی پر گذارتا، لیکن جلد ہی وہ تمام ہتھکنڈے سیکھ گیا جو

سرکاری نوکری کو بحال رکھنے کے لئے نہیں ضروری ہوتے ہیں، اب وہ تھوڑی سی رشوت لے کر چھوڑ گئی۔ مسلسل گھاٹا کر لگتا اس پر لوگ اس کی تعریفیں کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے میونسپلٹی ہال کی چوکیداری بھی مل گئی۔ پھر اس پر یہ انکشاف ہوا کہ تمام رات بتیاں جلانے رکھنا فضول اور بے فائدہ ہے کیونکہ چوکیداری تو اس کے ذمہ ہے۔ اس کے ایک دوست اصغر جنگ نے اس کو مشورہ دیا کہ تیل کو فضول برباد کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ اسے بیچ دیا جائے۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ تیل خوب بکتا ہے اور چند دن یار دوست موج اڑاتے رہے شدہ شدہ یہ بات سیکرٹری تک پہنچ گئی۔ اس نے سزا کے طور پر احسان کی کانجی ہاؤس میں تبدیلی کر دی۔ اسے اس بات کا قطعی خیال نہ تھا کہ وہاں تیل کی بجائے چارہ بیچا جا سکتا ہے۔ کانجی ہاؤس میں شہر بھر کے آوارہ جانور پکڑ کر رکھے جاتے تھے۔ کسی جانور کو پکڑ کر باندھ دینا یا بندھے ہوئے جانور کو وصول کئے بغیر چھوڑ دینا احسان کے ہاتھ میں تھا۔ اس نوکری میں احسان کے دوست بہت خوش تھے۔ کیونکہ وہ جب کسی سے انتقام لینا چاہتے اس کا جانور کانجی ہاؤس میں پکڑوا دیتے۔ دوپہر کے وقت انہی باتوں کے بیچ بیٹھ کر شام ہوتا۔ انہی دنوں کاندھلہ میں ایک بد مزاج مجسٹریٹ آ گئے۔ ان کی بیگم نے ایک بکرا بڑی محبت سے پال رکھا تھا۔ ایک رات مشاعرے کے دوران بکرے کی بات چھڑ گئی۔ احسان کی پارٹی میں قدم خیر نامی ایک شخص تھا جو ایک ڈاکوؤں کی پارٹی کے لئے چوپاؤں کا انتخاب کرتا تھا۔ قدم خیر نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ شام کو بکرا حاضر تھا۔ یار لوگ دو دن تک ضیافتیں اڑاتے رہے۔ شہر بھر میں بکرے کے متعلق تحقیقات ہوتی رہی۔ لیکن احسان اور اس کے احباب کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ شہر کی باتیں سنتے۔ یہ بات تو دب گئی۔ لیکن جلد ہی ایک اور واقعہ ہوا۔ کاندھلے کے قریب ہی ایک مشہور میلہ لگا۔ کیونکہ اپنے تمام دوستوں میں احسان ہی برسرِ روزگار آدمی تھا۔ اس پر عاید کر دیا گیا کہ وہ دوستوں کو میلہ دکھائے۔ دوستوں کو میلہ دکھانا آسان کام تو ہے نہیں مجبوراً احسان نے ایک درج شدہ بھینس چھتر روپے میں بیچ ڈالی۔ بات افسروں تک پہنچ گئی۔ لیکن احسان کے دوست بہت ہوشیار تھے وہ ایک مریل ٹٹو اٹھارہ روپے میں لے آئے اور کھونٹے پر باندھ دیا۔ افسروں نے تفتیش پوری کی اور چپکے بیٹھے۔

یہ وقت احسان نے گھوڑوں گدھوں کے پاس بیٹھ کر کتابیں پڑھ کر گزارا۔ رات کو اصغر جنگ کی بیٹھک میں جہاں امیروں کے چوری کے جانور حلال کئے جاتے اور پلیٹیں سامنے رکھ کر قیمہ روٹی کھاتے اور دنیا بھر کے امیروں کے خلاف منہ بھرے ہوتے تھے۔ انہیں باتوں کی وجہ سے امرا کے خلاف احسان کے دل میں زبردست بغض پیدا ہو گیا جس کا اظہار بعد میں اس کی شاعری میں ہوا۔ اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ احسان کے لئے سیکرٹری کی گالیاں اور جھڑکیاں کھانا ناممکن ہو گیا۔ کیونکہ وہ سیکرٹری کو بھی امرا سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے چپکے سے نوکری چھوڑ دی اور دھکے کھانے شروع کر دئے۔

چپڑاسی، مالی گری، مزدوری، معماری، زین سازی، رنگ سازی، احسان نے مختصر سی مدت میں کئی ایک کام کئے۔ لیکن کہیں بھی اسے اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اگر وہ شمّی کے عشق سے بھاگنے کے لئے ایک نائی کے ساتھ لاہور نہ آ جاتا تو شاید آج بھی کاندھلے اور اس کے گرد و نواح میں آوارہ گردی کرتا یا شاید مستقل طور پر چپڑاسی بن جاتا یا ممکن ہے ڈاکوؤں کا سردار بن جاتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پیر بن کر مریدوں کا ایک گروہ اپنے گرد اکٹھا کر لیتا۔ اس میں ڈاکو کی ہیبت بھی موجود ہے اور پیری بھی۔ اور چپڑاسی پن تو اس کی گھٹی میں پڑا ہے۔ یہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ وہ شمّی کے عشق میں گرفتار ہو کر لاہور چلا آیا اور شاعر بن گیا

شمّی ایک ساوندی تھی اور شمّی کی محبت کا جذبہ اس کے دل میں چوری چوری نہ جانے کب سے جمع ہو رہا تھا۔ جب وہ سکول جایا کرتا تھا تو ایک ننھی منی گڑیا سی لڑکی اس کو دیکھا کرتی۔ جب دوست احسان کی بدصورتی کا مذاق اڑاتے تو وہ اس کی حمایت کرتی۔ دونوں کی عمر اس قدر چھوٹی تھی کہ ان دونوں کی باہمی ہمدردی کو مشکوک نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک دن اس پیارد

سی گڑیا نے احسان کو شوق بھرے لہجے میں بتایا، "ہم بمبئی جارہے ہیں" ـــ اس کے بعد وہ بمبئی چلی گئی، آٹھ دس سال گذر گئے احسان کے دل میں اس کی یاد میٹھی میٹھی چٹکیاں لیتی رہی، اکثر بیٹھے بٹھائے وہ گڑیا اس کی نظروں کے سامنے پھر جاتی تھی، اکثر راستہ چلتے ہوئے وہ تجسس بھرے انداز میں سوچتا ـــ جانے وہ کہاں ہے! کیسی ہے! پھر ایک دن اس نے دیکھا، کہ چھکڑوں سے سامان اتر رہا ہے، مگا اسے خیال آیا کہ وہ سامان اس پیاری سی گڑیا سے متعلق ہے، نہ جانے کیوں، پھر ادھر جانے کی اسے ہمت نہ ہوئی، شوق رہ رہ کر گدگداتا تھا لیکن چلتے چلتے پاؤں رک جاتے تھے اور وہ گھبرا کر پنواڑی کی دکان پر رک کر پان کھانے لگتا، پان خرید کر یا سگرٹ لے کر پنواڑی سے چار ادھر ادھر کی باتیں کر کے لوٹ آتا، بہرحال کوشش کے باوجود احسان اس مقام تک نہ پہنچ سکا، پھر ایک دن ایک آدمی نے آکر بے تکلف اس کے شانے جھنجھوڑ کر کہا ـــ "چلو جی، بلاتی ہیں وہ ـــ"

جب اس نے دہلیز میں قدم رکھا، تو اس کا دل دھڑک رہا تھا، قدم کانپ رہے تھے۔ شمی ایک عورت تھی ـــ جوانی سے بھرپور عورت! اسے دیکھ کر احسان بہت متاثر ہوا۔ اور وہ دبی دبی آگ اعلانیہ بھڑکنے لگی، اب احسان اس کے گھر میں ہر روز آنے جانے لگا، وہ ایک دوسرے سے پہروں ادھر ادھر کی بیکار باتیں سنتے، جیسے وہ دونوں کسی اہم بات کو زبان پر لانے سے گریز کر رہے ہوں شمی معطر کپڑے پہنے سرمایہ اور سرمایہ داری کے خلاف نفرت کا اظہار کرتی رہی، احسان حیرت اور خوشی سے اس کا منہ تکتا رہا۔ سے پوری پوری دیوی سمجھتا رہا۔ شاید پرستش بھی کرتا ہو، ادھر عشق اور سرمایہ داری کی نفرت کے پردے میں فطرت ایک شاعر کی تخلیق کرتی رہی ـ جیسی شاعرا!!

اور شہر بھر میں چہ مے گوئیاں ہوتی رہیں۔ لوگوں کے مسلسل طعنوں کی وجہ سے احسان نڈر ہو گیا۔ احسان نے اپنے والد سے شمی سے شادی کرنے کی اجازت مانگی، لیکن انہوں نے شادی کی اجازت دینے کی بجائے احسان کو شمی کے گھر جانے سے بھی روک لیا، نہ جانے احسان کے اشرمے آمادہ ہونے کے لئے یا کسی کی ہو جانے کے شوق سے شمی نے ایک اور آدمی سے نکاح کر لیا، احسان کو بیحد صدمہ ہوا اور وہ بھاگ کر لاہور آ گیا، اور قاصد کبوتر پالنے لگا، جو وہ آج تک پالتا ہے۔ اس کے ذہن میں قاصد کے سوا کوئی کبوتر نہیں۔ گرچہ اس نے آج تک کسی کو کوئی پیغام نہیں بھیجا۔ بڑی بڑی لال آنکھوں والے قاصد اسے بہت پسند ہیں دوست یار اس کو دور نزدیک سے تحفے کے طور پر قاصد بھیجتے ہیں وہ خود اُڑنے والی مارکٹ سے گذرتا ہے تو کبوتروں کی ٹوکریوں اور پنجروں کو ایک نظر ضرور دیکھتا ہے کیسے ہی ضروری کام پہ جا رہا ہو ضرور ایک چکر لگائے گا۔ کبوتر وہ کبھی نہ دا رگند جائیگا۔ قاصد نظر آ جائے تو دو تین وقت کی روٹی کے پیسے خرچ دیگا ـ شمی قاصد ـ شاعر

کاندھے کا ایک نائی سے یہ کہہ کر لاہور لایا تھا۔ کہ آ تجھے کرنال شاپ میں نوکر کرادوں، احسان کے لئے کرنال چھاپ کی نوکری میں چنداں کشش نہ تھی، وہ تو شمی سے دور بھاگ رہا تھا۔ اپنے آپ سے دور رہنا چاہتا تھا لاہور آکر وہ نائی احسان سے دو وقت روٹی پکوا تا پانی بھرواتا اور دکان سے بال جھڑواتا۔ دو ماہ کے بعد احسان اس کام سے کٹ گیا، اور سنٹرل بینک پہ اینٹ گارا ڈھونے پر مزدور ہو گیا۔ دن بھر سخت محنت کرتا اور رات کو سرسوں کے دیئے کی مدھم لو میں فارسی کے دیوان پڑھتا۔ سنٹرل بینک کے بعد اس یونیورسٹی کی زیر تعمیر بلڈنگ پہ گارے کی تگاریاں بھرتا رہا جس کا وہ آج منتظم ہے، اس کے بعد اس نے شملہ پہاڑی پہ چوکیداری کا کام ذمے لیا۔ یہاں اسے پڑھنے کو زیادہ وقت مل جاتا تھا، وہ صبح سویرے اٹھتا نماز ادا کرتا اور حافظ کی غزلیں الاپتا۔ بہت رات گئے تک یہی مشغلہ رہتا۔ اس کی آواز بڑی میٹھی تھی، بیلدار اس سے بہت خوش تھا، کیونکہ احسان اسے رشوت کے طور پہ میلاد شریف سنایا کرتا تھا۔ اس بات پہ ایک اور آدمی نے اسے بارہ کھلا دیا، احسان کی جان تو بچ گئی لیکن اس نے استعفیٰ دے کر اس آدمی کے لئے اپنی آسامی خالی کر دی، اور خود ریلوے میں چپڑاسی ہو گیا، یہاں چھ سال کاٹے۔ لمبا عرصہ وہ کسی ایک جگہ پہ نہیں رہا تھا، یہ اس کی زندگی کا ایک المیہ تھا، اس دوران

میں وہ ادبی حلقوں میں تھوڑا بہت متعارف ہوگیا، اس کا کلام چھپتا بھی تھا اور لوگ اسے گھروں پر بلاتے بھی تھے، اس پہ لاہور کے ایک اخبار والے نے اسے تار اور ۴۰ روپے ماہوار پر ادارت کا قلمدان سنبھالنے کی دعوت دی، ۴۰ روپے احسان کے لئے بہت بڑی بات تھی ـــــ احسان نے کام سنبھال لیا، لیکن آپ جانتے ہیں روزانہ اخبار کی ایڈیٹری دردِ سری سے کم نہیں ہوتی، اور احسان کو دردِ سری راس نہیں، اس کی فطرت میں چیسی پن جڑ پکڑ چکا تھا۔ خانہ بدوشی اس کے ذہن میں گھر کر چکی تھی، ایڈیٹری چھوڑنے کے لئے احسان کے پاس بہانوں کی کمی نہ تھی، اس کے علاوہ احسان کو کرسی پر بیٹھنا راس نہیں، اس لئے احسان نے ایڈیٹری چھوڑ کر ایک مشہور ڈاکٹر کے ہاں بیس روپیہ ماہوار پر ملازمت کر لی، کام یہ تھا کہ احسان اس کے مضامین اور منظومات ٹھیک کر دے یا خود لکھ کر دے، اس ڈاکٹر کی ایک اچھی خاصی لائبریری بھی تھی اور احسان کو پڑھنے کا شوق تھا۔ کام بہت زیادہ تھا، احسان بہت محنت کیا کرتا، ڈاکٹر اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، ایک دن دونوں نے پروگرام بنایا کہ کچلے کا ست ایک ایک قطرہ روز کھایا جائے تاکہ تکان محسوس نہ ہو۔ دونوں چھپ کر کوٹھی کے اندرونی کمرے میں گھس جاتے، لسی منگوائی جاتی اور ڈاکٹر جلدی جلدی جیب سے ایک زرد بوتل میں سے ایک ایک قطرہ گلاسوں میں ٹپکاتا، دونوں غٹا غٹ پی کر منہ پونچھتے اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے اپنے اپنے کام میں لگ جاتا، یہ تجربہ اس قدر اچھا ثابت ہوا کہ ایک دن دونوں نے چار چار قطرے پی لئے، احسان اس دن پی کر اتفاق سے باہر نکل آیا اور اس کے بعد ایک بیرے کے کوارٹر میں جو اس کا دوست تھا دو روز تک لکڑی کے تختے کی طرح پڑا رہا۔ جب ہوش میں آیا تو وہاں سے اس قدر سر پٹ بھاگا کہ شاید ڈاکٹر مر چکا ہوگا اور پولیس اس کو ڈھونڈ رہی ہوگی۔ ادھر ڈاکٹر خود اس خیال سے چھپا ہوا تھا کہ احسان کا خون اس کی گردن پر ہے، اس کے بعد وہ جلنے اس واقعے کی وجہ سے یا یونہی چونکہ اس نوکری کا وقت ختم ہو چکا تھا احسان نے ڈاکٹر کو چھوڑ کر سرج لین ٹیلرز انارکلی کے ہاں گاہکوں کا ماپ لینے کی ملازمت کر لی۔ لیکن یہ کام بھی کچھ راس نہ آیا، ہر گھڑی کو نٹر پر آ کر یہ بولنا پڑتا۔ کمر ـــــ چھاتی ـــــ بازو ـــــ۔ اور پھر جائز نا جائز جگہ فیتہ چلانا پڑتا۔

کمر، چھاتی، بازو کو چھوڑ کر گیلانی پریس میں پروف پڑھنے کی نوکری تو بدرجہا بہتر تھی، جہاں بعد میں وہ ان کے سرکاری بک ڈپو کا مینیجر ہو گیا۔ یہاں اس کو کتابوں کے بزنس کا شوق پیدا ہوا۔ بزنس کے لئے سرمائے کا ہونا لازمی ہے، سرمایہ تو احسان کے پاس تھا نہیں ہاں اپنی ایک کتاب چھپ چکی تھی، اسی کو لے کے وہ بیٹھ گیا اور مکتبہ دانش کی ابتدا کی۔

آج وہ کڑھے بیچتا ہے ـــــ اور ایک ماہوار رسالہ نکالنے کی فکر میں ہے کل وہ رسالہ نکال رہا ہوگا، اور کوئلے کا ڈپو لینے کے لئے پریشان ہوگا، اسے آج تک صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا اصلی پیشہ کیا ہے آپ اس سے پوچھیں تو وہ سوچ میں پڑ جائے گا میرا پیشہ کیا ہے؟ کیا میرا پیشہ؟ آپ ہی بول اٹھے گا جیسے آپ سے پوچھ رہا ہو، اس کے بارے میں صرف اسی قدر کہا جا سکتا ہے کہ مستقل طور پر پیشے بدلتے رہنا اس کا اصلی پیشہ ہے، اسی لئے اس نے زندگی میں کچھ نہیں کمایا، اتنا بھی نہیں کہ وہ آرام سے روٹی کھا سکے۔ بلکہ شاید آرام سے روٹی ملنے لگے تو اس کی زندگی کی بہت سی خوشیاں کم ہو جائیں، اگر آپ اس کے لئے ایک عالیشان کوٹھی اور پر تکلف کھانوں کا انتظام کر دیں تو اس کی زندگی حرام ہو جائے اور حرام نہ ہونے کی صرف یہی صورت ہے کہ کوٹھی کے بیرے، خانساماں وغیرہ ڈرائنگ روم میں رہیں گے اور وہ خود آوٹ ہاؤس کوارٹروں میں زمین پر سوئے گا کبھی کبھی ڈرائنگ روم میں آئے گا۔ اور بیروں اور نوکروں کے ساتھ گھل مل کر گپ شپ اڑائے گا، گپیں مارے گا سرمایہ داری سے اسے نفرت ہے لیکن سرمایہ دار پیدا کرنے کی خواہش سے عشق۔ صرف خواہش

کوری خواہش اگر واقعی وہ سرمایہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کی زندگی عذاب بن جائے، روپیہ جوڑنے کی اس میں اہلیت نہیں۔ پورے اطمینان سے وہ صرف زمین پر ہی سو سکتا ہے، ایک پھٹا ہوا بوریا کے کرفٹ پاتھ پر اس طمانیت سے سو جاتا ہے جیسے اٹیں ہو اگر اس کے پاس کہیں سے بہت سا روپیہ آجائے تو بھی وہ اسی چھ روپے مہینے کے شکستہ مکان میں رہیگا جس میں وہ گذشتہ پندرہ سال سے رہ رہا ہے اس مکان میں نل بجلی یا غسل خانہ نہیں ہے۔ مٹی کا تیل لینے کے لئے وہ وقت نہیں نکالتا، اور چونکہ گھر میں اندھیرا ہوتا ہے اس لئے وہ موڑ کے کسی دکاندار کے پاس کسی چائے کی دکان پر یا میانی صاحب کے قبرستان میں بہت رات گئے تک چاندنی میں بیٹھا رہتا ہے دوست یار تفریح اوقات کے لئے اس کے اردگرد ہوتے ہیں جن میں وہ ہاتھ چلا چلا کر آنکھیں گھما گھما کر چٹکلے لطیفے کہتا رہتا ہے۔

باقاعدہ زندگی اور گھریلو پن سے اسے سخت نفرت ہے، اس کی بیوی بالکل ان پڑھ ہے لیکن بیوی سے بے تعلقی کی یہ حد ہے کہ اسے اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں، جب وہ میکے چلی جاتی ہے تو اس کی تعریفیں کرتا ہے جب وہ واپس آتی ہے تو اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ گھر میں بیوی موجود ہے وہ فطری طور پر حسن پرست ہے اور ہر وقت اس کے پاس شگفتہ قسم کے لوگ موجود رہتے ہیں عمر بھر وہ ان کے لئے کچھ نہ کچھ کہنے یا کچھ نہ کچھ کرنے کے خیال میں رہا ہے، اس کے اپنے قول کے مطابق بیشتر دوست اس کی توقعات سے کم نکلے لیکن وہ ہر قدم پر ان سے دھوکا کھانے کے لئے نہ جانے تیار ہے یا متمنی ہے، دوستی کے بارے میں اس کے نظریات بہت منجمد قسم کے ہیں، مثلاً وہ کبھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ دنیا میں کوئی مخلص آدمی بھی ہے اس کا خیال ہے وہ خود دغاباز ہے شاید اس لئے کہ وہ طبعاً متلون مزاج ہے اس کے بارے میں قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کے ساتھ اس کی دوستی ہے یا محض شناسائی۔ کیونکہ سب سے اس کے تعلقات ہمیشہ ایک سے رہیں گے، بہت گہرے اور پرانے دوستوں میں وہ کسی قسم کا تکلف روا نہیں رکھتا لیکن اس بے تکلفی کے باوجود ان کے ساتھ بھی بعض اخلاقی قدروں کو مستقل اصول سمجھ کر پیش کرتا ہے، آپ اس کو گندی گالی دے دیں تو برا نہیں مانتا لیکن از راہ مذاق بھی معمولی قسم کی بے حجابی سے بگڑ جاتا ہے۔ ممکن ہے لڑتا ہو۔

اس کے ملنے والے سبھی طبقوں کے لوگ ہیں مگر اس کے زیادہ تر بہی دوست عام طور پر وہ لوگ ہیں جو یا تو اس کے محتاج ہیں یا ہم تماہ، اور دوسروں کے ساتھ برابری کے تعلقات قائم نہیں رکھ سکتا، ہر بات میں اپنے دوستوں کے ساتھ خفیف سا برتری کا احساس رکھنے کا محتاج ہے پڑھے لکھے دوستوں سے خاص طور پر یہ احساس قائم رکھتا ہے پڑھے لکھے آدمیوں کے ساتھ اسے یوں بھی تعصب ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ شخص مخلص ہو ہی نہیں سکتے، ان پڑھ اور مزدور قسم کے دوستوں کو بہت پسند کرتا ہے، اس وقت لاہور میں اس کے بہت دوست ہوں گے مگر وہ الہ دتہ سبزی فروش، اسمٰعیل قصائی اور محمد نانبائی پر بہت ناز کرتا ہے وہ کہتا ہے اس کے دوستوں میں صرف یہ تینوں قابل اعتماد ہیں، ساتھ ہی اس کا ایمان ہے کہ وہ ہر کسی پر اعتماد کرنے کے لئے تیار ہے۔

وہ بنیادی طور پر اخلاقی آدمی ہے پانچ وقت نماز نہایت باقاعدگی سے پڑھتا ہے، نہ پڑھے تو بہت بے چین رہتا ہے وہ اتنی چھوٹی عمر سے نماز پڑھتا رہا ہے کہ اب نماز اس کی عادت ہو گئی ہے۔ کچھ بھی ہو نماز پڑھے بغیر وہ نہیں رہ سکتا، وہ کہتا ہے کہ نماز پڑھنے میں اسے اپنے عجز و انکسار کا شدید احساس ہوتا ہے جب وہ رکوع میں جھکتا ہے تو اسے تمام کائنات جھکی نظر آتی ہے، درختوں آدمیوں اور جنگلوں کو عبادت کرتے دیکھتا ہے، اس کے قول کے مطابق سجدے میں گر کر اسے ان تمام جانوروں کا خیال آتا ہے جو رینگتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو ان سے ہمنوا پاتا ہے زندگی کو اخلاقی نکتہ نگاہ سے دیکھنے کا دعوے دار ہے اور مذہب کو ہی صراط مستقیم مانتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے ایک دوست کی بیوی نے جب اس سے اظہار محبت کیا تو اسے قطعاً حیرانی نہ ہوئی۔

وہ ایک خود دار آدمی ہے اگرچہ اک عمر کی محتاجی اور مفلسی نے اسے تھوڑا بہت خوشامد پسند اور شیخی باز بنا دیا ہے' جھوٹ سے اسے سخت نفرت ہے اور جھوٹ بولے بھی تو بہت جلد اسے بھول جاتا ہے' قرض لینے کو بہت معیوب سمجھتا ہے ہاں دوستوں سے پیسے دو پیسے کم کم مانگ لیتا ہے کہ اتنی رقم بخش دو' نہ بھی بخشیں تو سمجھ لیتا ہے کہ بخشوا لی' اس کے باوجود اسے فکر دامنگیر رہتا ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے وہ قرض ادا کر دیا جائے' چوری سے اسے نفرت ہے لیکن ڈاکہ مارنے کو بڑی مردانگی سمجھتا ہے اسے افسوس ہے کہ یہ فخر اسے آج تک حاصل نہیں ہوا' اس نے کالج کی یونیورسٹی کی ڈگری کے زمانے میں ایک گروہ مرتب بھی کیا تھا جس کے پروگرام میں سرمایہ داروں کے سرمائے کے علاوہ ان کے بچے اٹھا لے جانے کا بھی پروگرام تھا تاکہ ان کو، تنخواہ دار دولت کے یتیم خانوں میں پرورش کیا جائے' اس مقصد کے لئے اس نے دست بدست لڑائی کے تمام فن سیکھے' چلتی گاڑی سے اترنا سیکھا، بنوٹ بازی میں بہت مہارت پیدا کی، لیکن وہ اتفاق سے شاعر ہو گیا جس کا اسے بہت افسوس ہے اسے شاعری سے نفرت ہے اور بزنس کو بہت پسند کرتا ہے' لیکن بزنس کی اس میں قطعاً اہلیت نہیں' نہ ہی اس کے پیدا ہونے کا کوئی امکان ہے اور شاعری سے اس کا بچنا ناممکن ہے وہ ایک نالائق اور ناکام بزنس مین ہے اور ایک اچھا شاعر وہ غالب کو غالب تسلیم کرنے کو تیار نہیں مگر اس نے دیوان غالب کی شرح لکھی ہے جس پر وہ ناز کرتا ہے۔ ترقی پسندانہ نظریئے ادب برائے زندگی کا بہت زور سے حامی ہے مگر ترقی پسندوں کو نیم مغربی ٹٹ پونجئے سمجھتا ہے کمیونزم کو موجودہ دور میں افضل ترین نظام مانتا ہے مگر کمیونسٹوں کا متعصبانہ دشمن ہے ان کو ہیچ اور ذلیل سمجھنے کی کوشش کرتا ہے پاکستان کا حامی ہے لیگ سے مطمئن نہیں اور قائد اعظم کو بہت بڑا لیڈر مانتا ہے۔

اس کا تعلیمی پس منظر عربی فارسی اور اردو کے توسط سے دنیا کی دوسری زبانوں کے لٹریچر کا کچھ حصہ ہے لیکن وہ دنیا کے ہر مسئلے پر رائے رکھتا ہے بلکہ ایسے مسئلوں پر نہایت شدت کے ساتھ بحث کرنے کا عادی ہے جن کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا۔ سرمایہ داری کا دشمن ہے مگر سرمایہ داروں سے بے حد مرعوب ہے نوکر شاہی حکومت کے خلاف ہے لیکن آئی سی ایس افسروں کی شناسائی پر ناز کرتا ہے اپنے سے گھٹیا آدمیوں میں بہت اعتماد کے ساتھ برتتا ہے مگر اونچے طبقے کے لوگوں کو بہت احتیاط سے ملتا ہے ظاہر داری سے اسے نفرت ہے لیکن اکثر ظاہر داری رکھ رکھاؤ کے لئے پارٹی دینے کا پروگرام بنانے کا شوقین ہے یہ اور بات ہے کہ یہ پارٹی آج تک پروگرام تک ہی محدود رہی ہے۔

اس نے اپنی عمر میں بہت دکھ محتاجی دیکھی ہے شاید اسی لئے اس کے دل میں لوگوں کی سرپرستی اور حاجتمندوں کو مدد دینے کی ایک شدید خواہش پیدا ہو چکی ہے یا ممکن ہے یہ خواہش اس کے فطری احساس کمتری کا ردعمل ہو۔

اس کی زندگی میں عجیب لوگ آئے ہیں اور عجیب واقعات رونما ہوئے ہیں' وہ قاضی محمد ذکی کا ذکر بہت شوق سے کرتا ہے ان سے اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی ایک گوشہ نشین رئیس اور جید عالم تھے' دن بھر محلے کے لڑکوں کو پڑھاتے اور رات کو عجیب حرکتیں کرتے مثلاً کئی دفعہ احسان نے ان کو چاندنی راتوں میں مٹی کے تیل کے کنستر کے پاس پمپ سے بوتل بھرتے اور پھر گرا دیتے اور یونہی رات گنوا دیتے دیکھا ہے احسان اکثر حیرانی اور احترام بھرے لہجے میں ہنس ہنس کر اس واقعہ کا ذکر کیا کرتا ہے اس کے ایک اور درویش دوست قاضی خورشید ہیں جو لوگوں کے گھروں میں گھس کے ہلا کر کہہ دیتے ہیں کہ اگلے بدھ وار کو لڑکی کو تیار رکھنا' فلاں کے گھر سے برات آئے گی اور پھر چلے جاتے ہیں۔ لوگ ان کی بات کا اس قدر احترام کرتے ہیں کہ فوراً حکم کے مطابق شادی رچا دیتے ہیں' احسان کا ایک امیر دوست ایک دفعہ رات کو اس کے گھر آیا اور کہنے لگا کہ سونے کو جگہ دو' احسان نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ میرے نوکر مجھے بہت ستاتے ہیں' یہ اور اسی قسم کے ہزاروں چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں جنہیں سن سن کر حیرانی ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات تو اس کی باتوں پر یقین نہیں آتا' اس کی اپنی زندگی بھی ایسے عجیب و غریب واقعات سے بھری پڑی ہے جب وہ شاہو کی گڑھی میں چھ آنے ماہوار پہ ایک غسل خانے میں رہتا تھا اس کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ اس غسل خانے میں ایک کھڑکی بھی تھی' جگہ اس قدر تنگ تھی کہ بستر کے سوا وہاں پہ جوتا بھی نہیں رکھ سکتا تھا احسان

دن کو گھاس کھودا کرتا اور رات کو چراغ کی مدھم لو میں پڑھا کرتا۔ نماز کا وہ پابند تھا ہی، چنانچہ اس کے ساتھی مزدور اس کی عزت کرتے تھے۔ اسی لیے ہیڈ مستری اسے عام طور پر نیم کام پر لگاتا تھا۔

ایک روز جب احسان غسل خانے میں بیٹھا چراغ کی ٹمٹماتی روشنی میں پڑھ رہا تھا، اس کا ایک معمار دوست اس سے ملنے کے لیے آیا۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا تھا۔ معمار دوست نے دور سے احسان کو بیٹھے دیکھا اور جذبۂ احترام سے مغلوب ہو کر آنکھیں جھکائے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اس اثنا میں احسان کو پیشاب کی حاجت ہوئی۔ دروازے سے نکلنے کی بجائے وہ کھڑکی سے پھلانگ کر باہر نکل آیا۔ معمار دوست جب دروازے پر پہنچا اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا کہ کمرے میں کوئی بھی نہیں تو وہ حیران کھڑا کا کھڑا رہ گیا، پھر وہ احسان کی تلاش میں وہیں کھڑا ادھر ادھر دیکھنے لگا، اس اثنا میں احسان فارغ ہو کر پھلانگ کر پھر وہیں آ بیٹھا اور یوں مطالعہ میں مصروف ہو گیا، جیسے اس نے ایک زمانے سے حرکت تک نہ کی ہو، اب جو مزدور دوست نے اندر جھانکا تو احسان جوں کا توں بیٹھا تھا۔ معمار دوست کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ آخر وہ ہمت کر کے آگے بڑھا، اور جرأت کر کے احسان سے پوچھا۔ کہیں باہر گئے تھے کیا؟ احسان کھڑکی سے پھلانگ کر باہر جانا خود بھول چکا تھا۔ بولا۔ نہیں تو۔ معمار دوست احسان کی روحانیت کا قائل ہو گیا۔ اب شک کی گنجائش نہ تھی۔

ادھر احسان غسل خانے میں مطالعہ میں مصروف رہا، ادھر معماروں میں اس کی روحانی طاقتوں کے چرچے ہونے لگے۔ "ابھی بیٹھا بیٹھا غائب ہو جاتا ہے" — "سچ —؟" "اپنی آنکھ سے دیکھا ہے میں نے"۔ لوگ بیعت کرنے اس کے گھر آنے لگے، پہلے پہلے تو وہ بہت پریشان ہوا، لیکن لوگوں کا یقین اور عقیدت دیکھ کر اسے بھی شک گزرنے لگا۔ کہ ہو سکتا ہے وہ فی الواقع ولی ہو، اور اس نے شک ہی شک میں کئی لوگوں کو مرید کر بھی لیا۔

مزنگ کا ایک مستری جو سائیکلوں کی اچھی دکان چلا رہا تھا، اس کے پاس آیا، اور مرید ہونے کی درخواست کی، احسان نے ازراہِ مذاق اس سے کہا کہ بھائی اچھے خوشحال آدمی ہو، دکان چل رہی ہے۔ میری مریدی کے بعد جوتے گانٹھا کرو گے، لیکن وہ بضد ہوا، احسان نے بھی سوچا، کیا مضائقہ ہے، اس کو مرید کر لیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

دس سال کے بعد ایک شخص نے احسان کو پیچھے سے آواز دی — "شاہ صاحب، پیر بادشاہ۔ پیر بادشاہ!" "السلام علیکم۔ بھائی کہو کیا حال ہے کہاں ہوتے ہو، کہو کیا کرتے ہو؟" احسان نے اس پرانے مستری کو پہچان کر شوق سے پوچھا، اور مستری نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"جی الحمد للہ! جوتے گانٹھتا ہوں، پیر جی!"

خود احسان اس واقعے کی ستم ظریفی پر اتنا حیران نہیں، کیونکہ اس کے لاشعور میں روحانیت کے دعوے کی ایک لکیر سی موجود ہے، وہ مذاہب مابعدالطبیعات میں قدم رکھتا ہے، بات چھڑ جائے تو وہ جلدی جلدی بہت سی اصطلاحیں بول دیتا ہے۔

اس نے زندگی میں دو دفعہ شراب بھی پی۔ اس کا ایک نوجوان دوست شراب پینے کا عادی تھا۔ ایک دن ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی، کہ اس کے دوست نے احسان کو شراب پینے کی دعوت دی، احسان نے کہا میں شراب نہیں پیتا بھائی۔ لیکن نوجوان دوست نے بہت اصرار کیا۔ میری خاطر — دوست کی خاطر! اور احسان نے پیالے سے پیالہ ٹکرا دیا۔

چند دن گزر گئے، ایک دن پھر ابر اٹھا۔ پھوار پڑنے لگی۔ احسان نے اس دوست کو بلوایا اور کہا۔ کہ آج تو پلواؤ بھئی۔ باغ میں ایک فوارے کی منڈیر پر کاگ اڑا، ساغر بھرے گئے، احسان نے کہا کہ "اس دن تم نے دوستی کا واسطہ دیا تھا — میں نے پی تھی۔"

ہاں۔ دوست نے سر تسلیم خم کیا۔

تم نے طلب کیا' اور میں نے دیا۔"

"ٹھیک ہے"۔ دوست نے سر ہلایا۔

"تم نے دوستی کی خاطر مجھ سے قربانی طلب کی تھی۔ آج میں تم سے دوستی کی خاطر کچھ مانگوں تو ——"

"جان بھی حاضر ہے" نوجوان نے گلاس غٹاغٹ پیتے ہوئے جواب دیا۔"

"سچ؟"

"آزما دیکھو۔"

"آج سے شراب چھوڑ دو۔"

دوست بھونچکا رہ گیا' اور احسان کی طرف دیکھنے لگا۔

"میری خاطر" احسان نے سنجیدگی سے کہا۔

کچھ دیر تک دوست چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر دفعتاً اٹھ بیٹھا' اور ساغر کو زمین پر پٹخ دیا ———— اس شرط پر وہ آج بھی شراب پینے کو تیار ہے۔

ہندوستان کے پندرہ مشہور افسانہ نویس

آپ ان کے افسانے پڑھ چکے ہیں
آپ ان کی تحریروں کے مداح ہیں

اب

آپ ان سے ملئے
اُن سے قرب حاصل کیجئے
ان کی دلچسپ اور رنگین شخصیتوں سے لطف اندوز ہوجئے
ان کی خواہشیں، محبتیں، بغض، وہم، نفرتیں، کمزوریاں اور عجیب غریب عادتیں

خدّوخال

۱۵ مشہور افسانہ نویسوں کے کیریکٹر سکیچ
جس میں تصویر کے دوسرے رُخ کی رنگیں اور واضح جھلکیاں ہیں
مرتبہ:۔ فکر تونسوی۔ ممتاز مفتی

مکتبہ اردو لاہور

احتشام حسین

نقد و نظر

چپ

ممتاز مفتی کے افسانوں کا ایک نیا مجموعہ مکتبہ اردو لاہور نے شائع کیا ہے۔ ان کہی اور گہماگہمی کے بعد یہ مجموعہ کسی قدر وقفہ سے نکلا ہے اس درمیان میں ممتاز مفتی کے فن کے بعض پہلوؤں نے ترقی کی ہے لیکن اس مجموعے کے سب افسانے ایک ہی پایہ کے نہیں ہیں۔ اور جب کوئی مصنف کوئی بلند پایہ چیز لکھ کر اپنی جگہ بنا لیتا ہے تو اس کی ہر چیز اسی جگہ سے دیکھی جاتی ہے۔ ممتاز مفتی نے جب اپنا افسانہ "آپا" لکھا تو وہ اول درجہ کے افسانہ نگاروں میں آگئے اور وہی انکے ادبی قد کے ناپنے کا پیمانہ بن گیا۔ اسی لئے جب یہ کہا جاتا ہے کہ چپ میں تمام افسانے ایک ہی پایہ کے نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ دلچسپ نہیں ہیں، بلکہ اس سے یہ مراد ہوتا ہے کہ مفتی نے قدم زیادہ آگے نہیں بڑھائے۔

وہ اردو کے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو لاشعور اور جنسی الجھنوں سے پیدا ہونیوالے واقعات اور کیفیات کو اپنا موضوع بنا لیتے ہیں۔ ممتاز مفتی اور ایسے دوسرے لکھنے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کئی بار یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ زندگی کے موضوعات کو اس طرح محدود کر لینا۔ دوسرے مسائل سے منہ موڑ لینا یا ہر مسئلہ کو جنسی زندگی کا تابع بنا دینا ہر وقت شگفتگی تازگی یا تنوع نہیں پیدا کر سکتا۔ یقیناً انسانی نفس ایک بیحد پیچیدہ چیز ہے۔ اس کے محرکات اور افعال، اس کے گہرے رموز، اس کے ظاہر و باطن کا کھوج لگانا آسان نہیں ہے۔ اس کی ان جانی اور ان کہی معمولی اور غیر معمولی کیفیتوں میں بہت سے افسانے پوشیدہ ہوتے ہیں جن کا بیان ہمارے سامنے کتابِ حیات کے بہت سے ورق کھول سکتا ہے۔ لیکن زندگی اتنی ہی محدود نہیں ہے۔ لاشعور کے سلسلے میں ایک سب سے بڑا دھوکا یہ ہے کہ وہی اصل میں محرک حیات ہے اور شعور تو بس ایک معمولی سی چیز ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ عالم میں بڑے بڑے سیاسی اور معاشی انقلاب انسانوں کی شعوری کوششوں ہی کا نتیجہ ہیں گو تحلیل نفسی کے مفکرین نے ہر انقلاب کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر لاشعور یا انسان کی ان جبلی پوشیدہ طاقتوں کا نتیجہ قرار دینے کی کوشش کی ہے جن کا پتہ خود انقلاب لانے والوں کو نہیں ہوتا۔ ایسا مطالعہ لازمی طور پر ہمیں سماج اور جماعت سے دور کر دیتا ہے۔ یہی بات ممتاز مفتی کے افسانوں میں ملتی ہے۔ فرد بہ حیثیت فرد کے یقیناً مطالعہ کی چیز ہے اور کردار کی حیثیت سے عموماً فرد ہی افسانہ کا موضوع بنتا ہے۔ لیکن فرد اپنے حرکات و سکنات، اپنے افعال و اعمال میں اپنے نفس ہی کے سہارے آگے نہیں بڑھتا بلکہ وہ اجتماعی اور سماجی زندگی کی دوڑ میں بھی بندھا ہؤا ہوتا ہے۔ اور اس کی مادی، سماجی زندگی کے پیچ و خم اس کی انفرادیت کے پیچ و خم متعین کرتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے کردار اس طرح بالکل بے بس اور مجبور معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ انہیں جبلت کا غلام بنا دیا جاتا ہے اس لئے وہ نہ تو اس کی جرأت کرتے ہیں کہ اس سے باہر آئیں اور نہ اپنی حالت کا احساس کرنے کے بعد بھی اپنی ذہنی بیماری سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی مثال تقریباً ہر افسانے میں کسی نہ کسی کردار میں مل جاتی ہے۔

موضوع کے اس طرح محدود ہونے کے باوجود مفتی نے کردار نگاری کے اعلیٰ مرقعے پیش کئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عصمت چغتائی کی طرح انہیں بھی عورتوں کے ذہن کے بھید کھولنے اور انہیں دلکش انداز میں لکھنے کا بہت اچھا سلیقہ ہے

نیلی۔ باجی۔ جیب۔ گہرائیاں۔ لیڈی ڈاکٹر اس لحاظ سے بے حد کامیاب افسانے ہیں۔ باجی میں بالکل آپا کی شان ہے بلکہ یہ افسانہ اس سے زیادہ پیچیدہ راہوں سے گذر کر کامیاب المیہ بنتا ہے۔ ممتاز مفتی لاشعور اور جنس کے افسانہ نگار ہونے کے باوجود فحاشی کی طرف نہیں جاتے۔ اور نہ وہ اس اندھیری دنیا میں اپنا راستہ بھول لیتے ہیں۔ نہ ان کی تفصیلات تخیلی اور بے کیف ہوتی ہیں۔ اور نہ ان کے کردار صرف لذت اندوزی کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مشاہدہ اور تجربہ ایک خود سے عائد کی ہوئی پابندی میں قید ہے۔ ورنہ وہ اس سماجی پس منظر کو بھی پیش کر سکتے ہیں جس میں آپا اور باجی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہیں۔ جس میں نیلی کے ماں اور باپ ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ جس میں گہرائیاں کی شہزادی تسلیم کی جگہ لے لیتی ہے۔ ہلکے ہلکے اشارے اس سماجی حقیقت کو واضح نہیں کرتے جس سے کوئی المیہ ایک فرد ہی کا نہیں سماج کا المیہ بن جاتا ہے۔ بہرحال ممتاز مفتی اپنے فن پر قابو پاتے جا رہے ہیں۔ اگر وہ دوراہا۔ پریم نگر اور تین خدا کے سے افسانے نہ لکھیں تو ان کو نقصان کے بجائے فائدہ پہنچے گا۔ جیب میں پندرہ افسانے ہیں اور فکر تونسوی اور بشیر رومانی کے دو مضامین ہیں جن میں سے ایک میں مفتی کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اور ایک میں خود ان کا نفسیاتی تجزیہ۔ دونوں مضمون دلچسپ ہیں اور ممتاز مفتی کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

حماقتیں

کئی مجموعے شائع کرنے کے بعد شفیق الرحمٰن نے ایک اور مجموعہ اپنے افسانوں کا مرتب کر دیا۔ جس کا نام انہوں نے حماقتیں رکھا ہے۔ یہ مجموعہ مکتبہ جدید (انارکلی) لاہور نے شائع کیا ہے۔ شفیق الرحمٰن نے تھوڑے ہی دنوں میں جو مقبولیت حاصل کر لی ہے اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ پہلے ہی صفحہ پر انہوں نے لنکن کا یہ قول نقل کر دیا ہے "وہ جو اس قسم کی کتابیں پسند کرتے ہیں اس کتاب کو بالکل ویسی ہی پائیں گے جیسی کتابوں کو وہ پسند کرتے ہیں" بہرحال یہ حماقتیں شفیق الرحمٰن کی ہوں یا کسی اور کی محض حماقتیں نہیں ہیں۔ ان میں بہت سی عقل کی باتیں بھی ہیں۔ اور بعض اوقات تو اس سے زیادہ عقل کی ہیں جتنی انہیں ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی پہلے ہی افسانے "نیلی جھیل" میں چند سال کے بچے اور ان پڑھ نوکر ایسی باتیں کرتے ہیں کہ ان کی عمر اور ان کا مرتبہ ان کا ساتھ دیتے معلوم نہیں ہوتے۔ یہی نہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شفیق الرحمٰن نے انہیں حقیقی زندگی کی کتاب سے نہیں اپنے قلم سے تخلیق کیا ہے۔ لیکن اس کے برعکس دوسرا افسانہ "بے بی" ہمیں بالکل مبہوت بنا دیتا ہے۔ یہاں آورد ہے نہ تصنع۔ نہ زبردستی کردار تراشے گئے ہیں۔ اور نہ وہ کوئی ایسی حرکت کرتے ہیں جو افسانہ کی روح سے الگ ہو۔ اس افسانہ کی لطافت اور واقعیت اس کی رنگینی اور دلکشی صرف فنکار کی چابکدستی اور فنی شعور کا پتہ نہیں دیتی۔ بلکہ اس کی نگاہ انسانی روح کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جہاں غم خوشی سے ہمکنار ہے۔ ہر افسانے کا الگ الگ تعارف کرانا تو بیکار ہوگا۔ کیونکہ ان میں سے اکثر افسانے رسائل میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن پھر بھی بعض باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

شفیق الرحمٰن درحقیقت ایک مزاح نگار نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کی مزاح نگاری زندگی کی توانائی اور شگفتگی سے پیدا ہوتی ہے

(ادارہ)

اسلئے مخصوص طور پر وہ ایسے موضوعات تلاش کرتے ہیں جن سے زندگی کے وہ پہلو روشن ہوں جن میں گہرائی اور سنجیدگی کے بجائے لطافت اور سادگی ہے کیونکہ زندگی کے یہ رخ ایسے ہیں جن کو انسان اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی خوشی کے لمحے اور سبق دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا افسانہ "تعویذ" بظاہر ایک وقتی دل لگی کی چیز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انسانی کردار کس طرح مختلف قسم کے نفسیاتی حالات میں اپنی شکل بدل سکتا ہے، اس افسانے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اور دوستوں کا معمولی سا مذاق انسانی فطرت کے ایک گہرے اور پوشیدہ رخ کی نقاب کشائی کر دیتا ہے۔ "تانیے ناٹ آؤٹ" ایک دلچسپ افسانہ ہے اور شروع سے آخر تک دلکش۔ لیکن اس کے برعکس "حماقتیں" رطب و یابس سے بھرا ہوا ہے۔ جس میں مصنوعی مواقع پیدا کر کے کرداروں کی زبان سے بے تکلفی کے موقع پر بھی سوچے ہوئے جملے کہلائے گئے ہیں۔ "قصہ پروفیسر علی بابا کا" قدیم اردو نثر کی ایک کامیاب پیروڈی ہے۔

مختصر یہ کہ شفیق الرحمن کے افسانوں میں زندگی رقصاں و جولاں ہے۔ جہاں کوئی اعلیٰ موضوع نہیں ہے وہاں تحریر کی دلکشی ہے۔ جہاں خیال کی بلندی نہیں ہے وہاں ندرت ہے۔ مگر ہر طرح پڑھنے والا ان کے فن میں ایک کشش محسوس کرتا ہے۔

سب رنگ } سو صفحات کی اس مختصر سی کتاب کے مصنف اختر الایمان ہیں، ناشر کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئے اور قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔ جو کتابت و طباعت کی نفاست کے باوجود کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔ کتاب منظوم ڈرامہ کا سا انداز لئے ہوئے ہے۔ اور شروع سے لے کر آخر تک صحت مند طنز کے زہر نما امرت میں ڈوبی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ نظم سمبالک ہے۔ اور اس میں ہندوستان (معہ پاکستان) کو ایک جنگل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جس میں بسنے والے مختلف جانور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان کے مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چند اہم کردار سانپ، خچر، کتے اور بیل ہیں، جو بالترتیب رہنمایانِ سیاسی، والیانِ ریاست، خطاب یافتگان، اور محنت کش جمہور کے نمائندہ ہیں۔ ڈرامہ میں ظالم و جابر انگریز کو آدم (بدیسی) کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے قوت حیات دمنو کی وساطت سے محنت کش جمہور پر نہایت کامیابی کے ساتھ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انکی ذلت اور زبوں حالی کا اصلی سبب انگریز نہیں بلکہ اس ملک کے سیاسی رہنما، والیانِ ریاست اور خطاب یافتہ لوگ ہیں۔ اور آج جبکہ انگریز اس سرزمین کو خیرباد کہہ چکے ہیں اور جمہور نے اپنی ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تکالیف کی بدولت مصنف کے اس دعوے کو پایۂ ثبوت تک پہنچتے ہوئے بھی دیکھ لیا ہے وہ اپنے ان دشمنانِ ازلی کا سر کچل کر ہی دم لیں گے ۔۔۔ کیا وہ وقت کے ہونٹوں سے جھڑتا ہوا یہ گیت نہیں سن رہے ۔۔۔

تاریکی میں چلنے والو امیدوں کے دیپ جلاؤ ۔۔۔ ہولے ہولے چلتے جاؤ منزل آنے ہی والی ہے
دیکھو ایک کرن لہرائی اس بدلی کے پیچھے دیکھو ۔۔۔ یہ بدلی بھی دھیرے دھیرے اب چھٹ جانے ہی والی ہے!

کئی مقامات پر شاعر کے ہاتھوں سے فصاحت و بلاغت کا دامن کچھ اس طرح چھوٹ چھوٹ گیا ہے کہ اسکے باعث نظم نثر کے بہت قریب جا پڑی ہے۔ بعض مقامات پر زبان کی غلطیاں بھی قاری کو کھٹکتی ہیں۔ اور ان کے لئے ہم کوئی جواز بے طرح کرنے سے معذور ہیں۔

اختتامیہ

ممتاز مفتی
انور سدید
عبدالمتین عارف
غلام باری

ممتاز مفتی

گھور اندھیرا

امرسنگھ نے آنکھیں کھول دیں۔ چاروں طرف گاڑھا اندھیرا چھا رہا تھا۔ اندھیرے کے تہ در تہ انباروں تلے اُسے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ اپنے جسم کو اٹھا نہیں سکتا۔ جیسے اُسے اپنے جسم پر قدرت نہ رہی ہو۔ اُس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔ نہ دیکھنے کے باوجود وہ محسوس کرنے لگا کہ بوجھل اندھیرے کے بادل اُس کے اردگرد جمع ہو رہے تھے۔ اندھیرے کے بڑے بڑے بھیانک ٹکڑے چمگادڑوں کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے نیچے اُتر رہے تھے۔ اور گدھوں کی طرح اُس کے اردگرد اکٹھے ہوتے جا رہے تھے۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

تاریک اندھیرے کا ایک چپل اُس کی طرف بڑھا۔ پیٹ کے دائیں پہلو میں ایک ٹیس لگی۔ درد سے وہ بلبلا اُٹھا۔ اور گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

ہائیں۔ وہ حیران رہ گیا۔ بوجھ کے اس بے نام سے احساس کے باوجود وہ یوں اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ جیسے اُسے سپرنگ لگے ہوں۔ اُس نے اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ اِس پھیلے ہوئے اندھیرے میں وہ خود بھی سیاہ بادل کے ٹکڑے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ سیال متحرک ٹکڑا۔ یہ بات اُس کے لئے حیران کن تھی۔ اُس کا نچلا دھڑ یوں لہرا رہا تھا جیسے الگنی پر لٹکا ہوا کپڑا ہلکی ہوا میں پھڑپھڑاتا ہے۔ امرسنگھ نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اندھیرا دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ اِس دھندلکے میں سیاہ فرش کی ایک لکیر دور تک جا رہی تھی جس پر یہاں وہاں سیاہ ستون سے کھڑے تھے جن کے سرے پر زرد سے گولے ٹنگے ہوئے تھے۔ جن سے زرد زرد سا دھواں نکل رہا تھا۔ ستونوں کے پیچھے زرد زرد سے پردے لٹک رہے تھے۔

اُسے محسوس ہوا کہ وہ جگہ مانوس سی تھی۔ لیکن اُسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور وہ اس جگہ کیوں پڑا ہے۔ دفعتاً اس کی توجہ اپنی طرف مبذول ہو گئی۔ لیکن میں؟ میں کون ہوں میں؟ وہ سوچنے لگا۔ اُسے خیال نہیں پڑتا تھا کہ وہ کون ہے۔ عجیب بات تھی کہ اسے اپنی ذات کے متعلق بھی کچھ معلوم نہ تھا۔

پُش پُش۔ دور موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی

بش۔ وہ پھر اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے محسوس کیا جیسے وہ آواز مانوس سی تھی۔ پُش۔ پُش۔ وہ دہرانے لگا۔ دفعتاً اُس کے ذہن میں حرکت ہوئی۔ ریڈیو۔ ہاں۔ ہاں وہ خوشی سے چلایا۔ وہ بش کا سیٹ ٹھیک کر رہا تھا اور اُس روز جلد ہی گھر سے آ گیا تھا۔ ٹفن کیریر میں اُس کا کھانا تھا۔ ہائیں وہ دایاں ہاتھ دیکھ کر بولا روٹی کا ڈبہ کہاں گیا۔ وہ لپک کر اُٹھ بیٹھا اور آپ ہی آپ بغیر کوشش کئے یوں تیرنے لگا جیسے وہ اندھیرے کے سمندر میں ایک ناؤ ہو۔

دور تک ٹفن کیریر کا نشان نہ تھا۔

گھوں۔ گھوں۔ . . . . دور سے کوئی چیز چیختی ہوئی آ رہی تھی۔ سیاہ ڈراؤنی چیز۔ اود بلاڑی۔ اور سمجھے بغیر وہ ڈر کر درخت کے پیچھے چھپ گیا۔

موٹر میں بندوقیں تانے ہوئے سپاہی دیکھ کر اُسے یاد آیا کہ وہ فسادات کے دن تھے اور اُسے محتاط رہنا چاہیے۔ بس احساس پر چاروں طرف سے سیاہ سائے اس کی طرف لپکنے لگے۔ اُس نے بایاں پہلو ٹٹولا۔ کرپان؟ اس کی کرپان کہاں تھی۔ روٹی کا ڈبہ اور کرپان۔ اب وہ کرپان کو دیکھنے کے لیے آگے بڑھا۔

دفعتاً وہ رکا سامنے سُرخ توپ زمین میں گڑی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا۔ اوہ یہ تو پٹرول پمپ ہے وہ اُس کی طرف غور سے دیکھ کر گنگنایا۔ نہ جانے اُسے کیا ہوا تھا۔ کچھ یاد بھی نہ تھا۔ چیزیں نئی نئی دکھ رہی تھیں۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اُسے اُن چیزوں سے دور کا تعلق نہ ہو۔

اس پٹرول پمپ سے تو میں روز گزرا کرتا تھا۔ روز کھانے کا ڈبہ اور کرپان اُٹھائے۔ لیکن لیکن پھر کیا ہوا؟ کیا ہوا تھا؟ ہاں وہ سب دکانیں بند کر رہے تھے۔ بھاگ رہے تھے اور چھاپے خانے کا وہ مزدور کھڑا تھا۔ کھڑا گھور رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا۔ میں مزدور سے پوچھوں اس کی طبیعت!! لیکن اُس کے ماتھے پر تیوری کیوں تھی؟ دفعتاً وہ سب مجھے گھورنے لگے اور پھر ایک سیاہ ڈراؤنی شکل لپکی اور—— میرے پہلو میں بجلی سی چمکی۔ ہا اُس نے پہلو میں درد ناک ٹیس محسوس کی۔

پھر کیا ہوا۔ اُس نے بمشکل سوچنے کی کوشش کی۔ دھندلکا۔ دھندلکا۔ اندھیرا وہ سب دور بھاگ رہے تھے۔ جیسے میں بھوت بن گیا تھا۔ بھوت۔ اور میں اُنہیں پاس بلانا چاہتا تھا۔ مجھے اکیلے میں ڈر لگ رہا تھا اور چاروں طرف سے بوجھل اندھیرا میرے گرد جمع ہوتا جا رہا تھا۔

وہ چھاپے خانے کا مزدور مجھ سے دور کیوں بھاگ رہا تھا۔ حالانکہ اُس روز جب چھاپے خانے پر بم پڑا تھا تو میں نے مزدوروں سے کس قدر ہمدردی محسوس کی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ جا کر اُن سے خیریت پوچھوں۔ پھر۔ پھر۔ میں ڈر کیوں گیا تھا۔ کیوں؟ شاید وہ بھی مجھ سے ڈر گیا ہو۔ میری کرپان سے ڈر گیا ہو۔ لیکن وہ تو میرے مزدور بھائی تھے پھر ڈر کیسا کیوں اور کرپان۔ وہ تو میں نے اپنے بچاؤ کے لیے پکڑ رکھی تھی۔ کرتار سنگھ کی بات میرے جی لگی تھی جب میں نے پوچھا کہ تار تم کرپان کیوں نہیں رکھتے تو وہ بولا تھا مجھے شرم آتی ہے۔ نہتے لوگوں میں کرپان لے پھرتے شرم آتی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے مجھ پر ڈر حاوی ہے۔ اس کے بعد مجھے بھی شرم آنے لگی تھی لیکن میں کرپان اُٹھا لیا کرتا تھا محض عادت کے طور پر۔

نہیں نہیں وہ میری کرپان سے نہیں ڈرا تھا۔ پھر اُس نے وہ بجلی سی کیا گرائی تھی اور وہ ٹیسیں۔

ایک بار پھر امر سنگھ نے پہلو میں ٹیسیں محسوس کیں اور درد کی شدت سے وہ ایک تاریک ستون تلے گر کر ڈھیر ہو گیا۔ چاروں طرف سے بوجھل اندھیرے کے انبار تہ در تہ اُس کے ارد گرد اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ بڑی بڑی چنگاڑیں پھڑ پھڑاتی ہوئی اترنے لگیں۔ گدھ——

اس کا جسم منوں بوجھل ہو گیا اور اُس نے محسوس کیا کہ اُسے اپنے جسم پر قدرت ہی نہیں رہی۔

نہ جانے کب تک وہ یونہی پڑا رہا

گھنگھرو کی آواز سن کر وہ چونکا سامنے سے ایک تانگہ آ رہا تھا۔ تانگہ؟ اس وقت؟ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر نہ جانے کس خیال پر اُس نے جست بھری اور ہسپتال کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔

نہیں نہیں کوچوان نے لپکتا ہوا سایہ دیکھ کر چلانا شروع کر دیا۔ نہیں نہیں میں مسلمان نہیں ہوں۔ میں میں تو کوچوان ہوں۔ کوچوان!

کوچوان؟ امر سنگھ نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ پھر؟

پھر کوچوان بولا۔ پھر کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں بس تو کچھ بھی نہیں۔

کچھ بھی نہیں۔ اوہ۔ امر سنگھ کھو سا گیا۔ اور میں میں

تم۔ تم اُس نے اُس کے کیشوں کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر دفعتاً گھبرا کر چلانے لگا۔ نہیں نہیں میں کرشن نگر نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا اس دن بھی میں وہاں جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ کوچوان نے یوں بیان کرنا شروع کیا جیسے وہ دبی دبی ہچکیاں لے رہا ہو۔ تیار نہیں تھا حالانکہ وہ دس دس روپے دینے کو تیار رہتے۔ لیکن روپے کا کیا ہے جی چلتی پھرتی چھاؤں۔ میں وہاں کبھی نہ جاتا۔ مگر وہ بڑھیا اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے ماں یاد آگئی۔ ماں۔ امر سنگھ کے ہاتھ پہ نہ جانے کہاں سے پانی کے قطرے گرے۔ انہوں نے اُسے امرتسر کہی۔

پھر امر سنگھ نے اپنے گیلے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر؟ کوچوان چونکا۔ پھر کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ بڑی بڑی دکانیں۔ او نیچے محل پادشاہ۔ کچھ بھی نہیں۔

لیکن ماں۔ امر سنگھ گنگنایا۔

ماں۔ وہ بوڑھی۔ آنسوؤں والی بڑھیا۔ میں نے کہا میں لئے چلتا ہوں ماں۔ اور وہ مجھے دعائیں دینے لگی جس طرح میری ماں دعائیں دیا کرتی تھی۔

پھر امر سنگھ نے آہ بھری۔

پھر۔ پھر وہ بہت سے تھے۔ بہت سے۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ وہ بڑھیا انہیں کوس رہی تھی۔ پھر وہ ان کی منتیں کرنے لگی۔ اور آخر رونے لگی۔ لیکن اُن پر اثر نہ ہوا۔ ان پر اثر کیوں نہ ہوا۔ پھر مجھ پر اس کے آنسوؤں کا اثر کیوں ہوا تھا۔ کیوں؟ کیا وہ ان کی ماں نہ تھی۔ بولو۔ تم کرشن نگر کے ہو۔ بولو۔

میں۔ امر سنگھ چونکا۔ میں اُس کے گلے میں گویا آنسو ٹپک رہے تھے۔

انہوں نے گھسیٹ کر بڑھیا کو اتار لیا اور وہ میرے اردگرد جمع ہو گئے۔ کوچوان نے آہ بھری۔ گھوڑا رک گیا۔ اُس نے مظلوم نگاہوں سے کوچوان کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمبی چیخ ماری۔ مجھے مار دیتے تو کوئی حرج نہ تھا۔ کوچوان بڑبڑایا۔ لیکن موتی بے زبان موتی پہ ہاتھ اُٹھانا۔ اُس نے گھوڑے کی طرف پُرنم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ موتی تو مسلمان نہ تھا۔

موتی نے ایک اور چیخ ماری۔ لمبی ڈراؤنی چیخ اور پھر بدک کر چل پڑا۔

وہ سب کوچوان اپنی ہی دھن میں بولتا۔ وہ سب جیو ہتیہ کے نام پر کانوں پہ ہاتھ رکھا کرتے تھے۔ میں جانتا ہوں۔ عمر بھر کرشن نگر کے اڈے پر رہا ہوں۔ پھر انہوں نے موتی پر بھالے۔ کرپان۔ دفعتاً وہ چپ ہو گیا۔

چاروں طرف فضا سے سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ موتی کراہتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ امر سنگھ آہیں بھر رہا تھا۔ اور کوچوان دور افق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے افق میں کھو گیا ہو۔ دفعتاً اس نے اپنے ہی آپ گنگنانا شروع کر دیا۔ پھر۔ اندھیرا۔ چاروں طرف سے اندھیرا گھپ اندھیرا۔

ٹھہرو۔ سڑک پر کھڑا ہوا سپاہی چلایا۔ ٹھہرو۔

کوچوان نے چونک کر لگام ڈھونڈنی شروع کر دی۔ لیکن تانگا رکنے سے پہلے ہی سپاہی اوپر چڑھ آیا۔

تم کہاں جا رہے ہو۔ سپاہی نے تحکمانہ انداز سے پوچھا۔

میں کوچوان بولا۔ میں کہاں جا رہا ہوں۔ کیوں بابو جی۔ اُس نے امر سنگھ سے پوچھا۔

امر سنگھ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ کہ کیا جواب دے۔ میں میں یعنی ہم۔ وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سپاہی آپ ہی آپ گنگنانے لگا۔ لیکن مجھے ضرور وہاں پہنچنا چاہیے۔ ورنہ وہ سب بھوک سے مر جائیں گے بھوک کے مر جائیں گے۔ اوہ۔ اوہ۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے جانا ہے۔ مجھے انہیں بچانا ہے۔ مگر۔ مگر کہاں جانا ہے۔ کہاں جانا ہے مجھے سب تھانے جانا ہوگا۔ کوچوان بولا۔

نہیں نہیں وہ بولا وہاں سے تو میں آ رہا ہوں۔

ہاں ہاں امر سنگھ خواہ مخواہ بول پڑا۔

مجھے کہاں جانا ہے سنتری نے امر سنگھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ بولو۔ ورنہ وہ بھوک کے مر جائیں گے۔

کیا فرق پڑتا ہے کوچوان نے آہ بھری۔ کیا فرق پڑتا ہے۔

نہیں نہیں سنتری چلایا۔ کچھ نہیں۔ وہاں گیہوں نہیں ہے۔ لوگ بھوک کے مر رہے ہیں۔

میں تھانے میں رپورٹ کرنے آ رہا تھا۔ ادھر سے نہ جاؤ وہ بولے۔ وہ تمہیں مار دیں گے۔ بے وقوف مجھے رپورٹ کرنی تھی۔ ورنہ وہ سب بھوک کے مر جاتے۔

پھر امر سنگھ بولا۔

پھر۔ پھر چھتوں سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ اور پھر اندھیرا۔ گھپ اندھیرا۔ اور وہ ہنس رہے تھے۔ بے وقوف انہیں معلوم نہ تھا کہ مجھے ضروری طور پر جانا ہے۔ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ میں اُن کو سمجھوں گا۔ مل لیں۔ بغیر وارنٹ کے ہتھکڑی نہ لگائی تو میرا نام میرا نام —— لیکن میرا نام کیا ہے میرا نام۔ بتاؤ۔ بولو۔ کہاں جانا ہے تجھے نہیں بتاتے۔ اچھا میں تمہارا چالان کروں گا۔ یہ کہتے ہوئے وہ تانگے سے اُتر گیا۔ اور چلانے لگا۔ ٹھہرو۔ ٹھہرو۔

موتی نے ایک چیخ ماری اور بدک کر بھاگا۔

نہیں نہیں کوچوان چلایا۔ ہم کرشن نگر نہیں جائیں گے بیٹے۔ ہم تو شاہ عالمی جا رہے ہیں۔ شاہ عالمی۔

شاہ عالمی نہ جانا۔ شاہ عالمی نہ جانا کسی نے بڑھ کر گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔

شاہ عالمی۔ نوجوان پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ اف۔ آگ۔ آگ۔ نرک۔

آگ۔ امر سنگھ چلایا۔

بھگوان! نوجوان غصے سے بولا نہیں نہیں۔ بھگوان تو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب تو یہاں شیطان بستے ہیں شیطان بھگوان کی دنیا میں اینٹوں سے شعلے نہیں نکلتے۔

ہاں امر سنگھ گنگنایا۔ یہ شیطان کی دنیا ہے۔ بھاگ چلو۔ بھاگ چلو۔

بھاگ!! نوجوان قہقہہ مار کر ہنس پڑا حتٰے کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ رام لال بھاگا تھا۔ وہ بھاگ کر کھڑکی سے اترنے لگا۔ اُف گولیوں کی بوچھاڑ۔ ٹھاخ ٹھاخ اور ننھا مادھو۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ آتش بازی چل رہی ہے۔ اور پھر وہ خود انار کی طرح چلنے لگا۔ دھڑ ادھڑ بھگوان۔

پھر کوچوان نے کہا۔

پھر وہ چونکا۔ پھر دیواریں ہل گئیں۔ آسمان گر گیا۔ زمین۔ زمین۔ اندھیرا۔ گھپ اندھیرا۔ ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ دفعتاً وہ چلایا دنیا مجھے دینے کو بچانا ہے۔ دنیا دنیا۔ وہ چلاتا ہوا چلا گیا۔ دور سے اُس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دنیا۔ دنیا۔

کوچوان ہاتھ میں باگ پکڑے بالکل چپ چاپ بیٹھا تھا۔ امر سنگھ ہونٹوں میں کچھ گنگنا رہا تھا۔ موتی منہ اٹھائے افق کی طرف گھور رہا تھا۔ وہ سب یوں بیٹھے تھے جیسے کپڑے پر تصویر کھینچی ہو۔

دینو!۔۔۔۔کسی نے دینو کو پکارا۔ ایک بڑھیا نہ جانے کہاں سے آگئی۔ کہاں ہے میرا دینو۔ وہ تانگے کے پاس آکر رک گئی۔ اور پھر امر سنگھ سے مخاطب ہو کر بولی تمہیں نے دینو کو مارا ہے۔ تم اس کے قاتل ہو تم۔ مارو۔ مجھے بھی مارو۔ وہ تن کر کھڑی ہوگئی۔

نہیں نہیں امر سنگھ گنگنانے لگا۔

پکڑ لو۔ وہ کوچوان کی طرف لپکی۔ پکڑ لو۔ یہ قاتل ہے۔

کوچواں چپ چاپ بیٹھا اس کا منہ تکتا رہا۔

کوئی نہیں سنتا کوئی نہیں وہ چلانے لگی ماُنہوں نے بھی کچھ نہ سنا تھا۔۔۔۔۔ان کی لمبی لمبی داڑھیاں تھیں۔ خاکی وردیاں۔ انہوں نے پولیس کے بھیس میں ہمیں گھیر لیا۔ اور وہ سب اللہ دتا۔ غفورا۔ رحیم۔ سبھی گئے۔ کہ ان کے پاس شکایت کریں۔ میرے اللہ اور اور وہ سب یوں بھون دئے گئے جیسے مکی کے دانے۔ پھر وہ سب ہمارے پاس آگئے۔ گھیر لیا۔

اور دینا۔ مجھے بھی مارو وہ پھر چلائی۔ دینے کے بغیر جی کر میں کیا کروں گی۔ مجھے بھی مارو۔ دفعتاً اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ہائے وہ چلائی۔ گرم سیخ۔ اف۔ وہ بیٹھ گئی۔ میرا سر۔ میرا سر۔

موتی نے مڑ کر کوچوان کی طرف دیکھا۔ اُس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ کوچوان نے اوپر کی طرف دیکھ کر لمبی آہ بھری۔ امر سنگھ مدھم آواز میں کراہنے لگا۔ فضا میں اس کی کراہ گونجی۔ گرد و پیش آہوں اور کراہوں کی آواز وں سے گونجنے لگے۔

دینا۔ دینا۔ دور بہت دور سے آواز آئی۔

دینا بڑھیا اُٹھ بیٹھی۔ کہاں ہے میرا دینا کس نے پکارا میرے دینے کو۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

دینا۔ بہت دور کوئی پکارنے لگا۔

آئی بڑھیا چلائی۔ میں آرہی ہوں آرہی ہوں۔ اور وہ دیوانہ وار اندھیرے میں کود کر نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

دفعتاً موتی نے چیخ ماری اور اُٹھ بھاگا۔

اور گردا اڑتا ہوا۔ بل کھاتا ہوا بوجھل اندھیرا کراہ رہا تھا۔ ستونوں کے اوپر ٹنگی ہوئی بتیاں دم توڑ رہی تھیں۔ نیچے سیاہ سڑک سسکیاں بھر رہی تھی۔

اسے رکھ لو بڈھا گڑگڑا رہا تھا۔ اسے رکھ لو بھگوان۔ لیکن مجھے چھوڑ دو۔ میری جان بخش دو۔ میں تو بوڑھا ہوں۔ مجھے مار کر کیا لوگے۔ اس کی حسین بیٹی حیرانی سے بوڑھے باپ کی باتیں سن رہی تھی۔

نہیں نہیں یہ میرا بچہ نہیں بڑھیا چلائی۔ نہیں بہن میں سچ کہتی ہوں۔ یہ بچہ میرا نہیں۔ میں میں اسے کہاں تک اُٹھائے پھروں میں تو اس کی دیکھ بھال کرتے ہار گئی۔

بچہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ماں!!

سردار جی یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔ نہیں نہیں، میرا نام تو کوشلیا ہے۔ یہ دیکھ لو۔ یہ کلائی پر ہندی میں نام۔ کوشلیا۔

ہا ہا ہا ہا ہا ——— مرد ہنسا۔ پھر کیا ہوا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نہیں نہیں۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔

میں سکھ نہیں وہ ہنسا مسلمان ہوں۔ یہ کیش تو دھوکا ہیں۔

میں انہیں بتاؤں گی۔ مجھے اپنوں نے لوٹ۔ اُس کی آواز مدھم ہو گئی۔ دب گئی۔ جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

تانگہ رُک گیا۔

سامنے میلے اندھیرا میں ایک بڑا بہت بڑا پنجرہ رکھا ہوا تھا جس میں سالے منحرک تھے۔ پاس ہی چند قُلی بیٹھے تھے۔ دفعتاً ایک ریڑی والا آنکلا۔ اور بے تکلف قلیوں کی طرف بڑھا۔ ہائیں۔ امر سنگھ نے کلیجہ تھام لیا۔ وہ سب کچلے جائیں گے۔ لیکن ریڑی گزر گئی اور وہ قلی جوں کے توں بیٹھے تھے۔ امر سنگھ حیران رہ گیا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ کتے بے تکلف دیوار میں سے پھاند کر ادھر سے ادھر نکل آتے۔ کوے اڑتے اڑتے موتی کے پیٹ میں سے نکل جاتے جیسے وہاں کوئی کھڑکی کھلی ہو۔ عجیب بات تھی وہ سوچنے لگا۔

سوچتا سوچتا وہ قلیوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔

اُسے دیکھ کر بڈھا قلی چلایا۔ نہیں بھئی تم جانو تمہارا کام۔ ہم سامان نہیں اٹھائیں گے۔

وہ بھی میری منتیں کرتی تھی۔ منتیں اور مجھے اس پر رحم آگیا۔ اور وہ صندوق کتنا بھاری تھا وہ صندوق۔ وہ میرے کندھے سے پھسل گیا۔ دفعتاً ——— نہ جانے ہوا کیا۔ بادل کڑکا اور بجلی اور پھر۔ قلی کا چہرہ بھیانک ہو گیا اور پھر ——— قلی کا جسم ٹکڑے ہو کر اڑ گیا۔ جیسے قلی کی جگہ وہ کوئی ہوائی تھی۔ انسانی شکل کی ہوائی۔ اور چاروں طرف سے مدھم آوازیں آنے لگیں نہیں نہیں تم جانو تمہارا کام۔ تم جانو تمہارا کام

کو۔۔۔۔۔ کو کو۔ گاڑی کے وسل کی آواز سنائی دی۔

میں جاؤں گا میں جاؤں گا۔ امر سنگھ چلایا۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ وہ ہوا میں تیرنے لگا اور آہنی پل کے درمیان سے گزرتا ہوا گاڑی کے پاس جا پہنچا۔ امرتسر امرتسر وہ خوشی سے چلایا۔

امرتسر ایک بھاری اور بھیانک آواز آئی۔ امرتسر۔

امر سنگھ نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ گاڑی کے پائیدان کے پاس ٹرنکتا ہوا سر دانت نکال رہا تھا

امر سنگھ گھبرا گیا۔

یہ گاڑی امرتسر سے آئی ہے۔ کھڑکی سے ایک عورت نے سر نکال کر کہا۔ جس کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں۔ جن سے بچہ کھیل رہا تھا۔

امرتسر!!

امر سنگھ بھاگ کر ساتھ والے ڈبے میں گھس گیا۔

ڈبے کی دیواریں سرخ چھینٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ نیچے لہو کی چھپڑوں میں گوشت کی گٹھڑیاں رکھی تھیں ——— امر سنگھ

سہم کر ایک طرف ہو گیا۔

سیٹ پر پڑے کٹے ہوئے سرنے آنکھیں کھول دیں۔ امر سنگھ کو کھڑے دیکھ اس کی آنکھیں اور بھی ابل آئیں۔ نہیں نہیں میں مسلمان نہیں ہوں میں مسلمان نہیں ہوں۔ رسول اللہ کی قسم سیٹ پر لڑھکتا ہوا وہ نیچے گرا۔ اور پائدان سے پلیٹ فارم پر جا پڑا۔

الحمدللہ۔ بائیں طرف کے ڈھیر سے بزرگانہ آواز آئی۔ الحمدللہ۔ اشہد ان لا ـــــ - -

دفعتاً ایک شور بلند ہوا۔ گوشت کی گٹھڑیاں حرکت کرنے لگیں۔ اعضاء میں جنبش ہوئی

میری ٹانگ۔ میری ٹانگ!!

خدا کے لئے مجھے مار دو مجھے مار دو!!

پاکستان!!

پاکستان باہر پلیٹ فارم سے آواز گونجی۔ امر سنگھ سہم کر باہر کی طرف بھاگا۔

پلیٹ فارم انسانی اعضاء رینگ رہے تھے۔ کٹے ہوئے سر بڑے گیندوں کی طرح لڑھک رہے تھے۔

پاکستان کٹا ہوا سر گردن کے بل کھڑا ہو کر چلایا۔ ہا ہا ہا ہا۔ یہ بھیانک قہقہہ چاروں طرف گونجنے لگا کٹے ہوئے سر کی آنکھوں سے موتی ڈھلک آئے۔

کٹے ہوئے بازوؤں والا بڈھا مسکرا دیا۔ پاکستان۔ اس کی مسکراہٹ حسرت آلود تھی

الحمدللہ قریب ہی کوئی زیرِ لب بولا۔ الحمدللہ ہم پہنچ گئے۔

پہنچ گئے؟ جوان عورت ہنسی۔ پہنچ گئے۔

شکر ہے بڑھیا بولی جو کہنیوں کے بل رینگ رہی تھی اور پھر تھک کر منہ کے بل گر پڑی۔

امر سنگھ نے منہ موڑ لیا۔ مارے اس کے ساتھ کوچوان کھڑا تھا۔ کوچوان وہ بولا۔ لیکن کوچوان بڑھیا کی طرف غور سے تک رہا تھا۔

کوچوان بڑھیا کی طرف بڑھا۔ اور اُسے سہارا دیتے ہوئے بولا۔ اُٹھو۔ اٹھو۔

اسے اُٹھاؤ اس نے ساتھ والی جوان عورت کی طرف اشارہ کیا جس کا نچلا دھڑ لٹک رہا تھا۔ کوچوان نے محسوس کیا کہ وہ اکیلا اُسے اُٹھانے کے لئے کافی نہیں۔ تمہارے ساتھی اُس نے عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔

ساتھی جوان عورت نے نفرت سے کہا۔ ساتھی وہیں تھے۔ وہیں۔

وہیں کوچوان نے حیرانی سے دھرایا۔

وہ سامنے کھڑے تھے میرے سامنے اس کی آواز میں نفرت کی شدت تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں پھٹ نہ گئیں۔ ایمان! جرأت!! جھوٹ سب جھوٹ۔ اپنی جان بچانے کے سب جھوٹے اور لالچ وہ قہقہہ مار کر ہنسی اور پھر دھڑام سے منہ کے بل گر پڑی۔

پانی پانی وہ اپنا آپ گھسیٹتے ہوئے بولی۔

امر سنگھ نے چاروں طرف دیکھا۔ سامنے ڈبے پر پانی والا لکھا دیکھ کر وہ لپک کر ڈبے میں داخل ہو گیا۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔

نہیں نہیں کونے میں دبکا ہوا بچہ چلّایا۔ مجھے پیاس نہیں۔ میں نے تو پانی نہیں مانگا۔ وہ رونے لگا۔ مجھے نہ مارو۔ مجھے نہ مارو میں پانی نہیں مانگوں گا۔

پانی نہیں مانگوں گا۔ امر سنگھ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

نہیں نہیں۔ وہ چلایا۔ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ مکڑی سی زبان باہر نکل آئی۔ پا۔ پا۔ پا۔ اُس کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔

پا۔ پا۔ پا۔ پا۔ پ۔ پا سیٹوں تلے سے آوازیں آنے لگیں۔ امر سنگھ نے جھک کر سیٹوں تلے نگاہ دوڑائی۔ پا۔ پا۔ پا بیسیوں سوکھے ہوئے ہونٹ حرکت کر رہے تھے۔ پھر مکڑی سی زبانیں لٹک آئیں۔ پا پا۔

نہیں۔ نہیں میں مسلمان نہیں ہوں۔ پلیٹ فارم پر کوئی چیخنے لگا۔

ساتھی۔ ہا ہا ہا۔ عورت نے قہقہہ لگایا۔

الحمد للہ۔ ہم پہنچ گئے۔

اَشہَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ ———۔

امر سنگھ نے ایک جست بھری۔ در فضا میں تیرنے لگا۔ وہ بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دور دور جہاں شاہ عالمی نہ ہو امرتسر نہ ہو۔ کچھ بھی نہ ہو۔ دور۔ دُور جہاں وہ آوازیں نہ پہنچ سکیں۔ وہ آوازیں مدھم پڑتی گئیں۔ مدھم پڑتی گئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا کسی نامعلوم اثر سے بھیگی ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ دور افق کے قریب بجلی چمکی۔ اور پھر گہرا اندھیرا چھا جاتا۔ نیچے زمین گویا سنسان پڑی تھی۔ کبھی کبھی مدھم سی آوازیں سنائی دیتیں۔ جو کبھی تیز ہو جاتیں۔ پھر ایک چیخ پھر خاموشی چھا جاتی اور خاموشی کے پس منظر پر کراہیں اور سسکیاں۔ اور پھر دبی چیخ۔ اور پھر آوازیں سرگوشیاں۔

دنیا۔ دنیا۔

آگ۔ آگ

میں مسلمان ہوں۔ دھرم کی قسم میں مسلمان ہوں

پاکستان!! ہا ہا ہا ہا

راولپنڈی!! امرتسر!! شاہ عالمی!!!

مجھے پیاس نہیں لگی۔ نہیں نہیں۔ بیسیوں سوکھے ہوئے ہونٹوں سے مکڑی سی زبانیں لٹک پڑیں۔ پا پا۔ پا پا۔

بھاگتے بھاگتے وہ تھک چکا تھا۔ لیکن وہ آوازیں ختم نہ ہوتی تھیں۔ جیسے اتفاقاً اُس کا پیچھا کر رہی ہوں۔ بار کر امر سنگھ نے آنکھیں بند کر لیں اور دھڑام سے نیچے آ گرا۔

چاروں طرف کھیت لہرا رہے تھے۔ جن میں مویشی کھڑے چر رہے تھے۔ جن کے پاس ہی بیسیوں مویشی زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ ان کے پیٹ پھولے ہوئے تھے۔ جیسے کھا کھا کر گر پڑے ہوں۔ دھر دھندلکے میں گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔ بائیں طرف ایک ٹوٹا ہوا اسٹیشن تھا جس میں دیا ٹمٹما رہا تھا۔ دور کہیں کتے رو رہے تھے۔ ادھر سڑک کے کنارے گدھ اور چیلیں پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ اتنے گدھ!! اتنے گدھ اس نے عمر بھر ایک جگہ نہ دیکھے تھے۔ سڑک پر ٹوٹے ہوئے ٹرک کھڑے تھے۔

وہ پھسل کر سڑک کی طرف چل دیا اور گدھوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ لیکن گدھے جوں کے توں بیٹھے رہے۔ کبھی کبھار کوئی سرکتا تو محسوس ہوتا کہ اس میں جنبش کی ہمت نہیں۔ وہ پھڑ پھڑاتا مگر اس کا جسم حرکت نہ کرتا۔ ان کے پاؤں میں گلابی گھنگھریاں سی پڑی تھیں۔ ان کی چونچیں رنگی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف عجیب سی بوجھل ہوئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی طبیعت متلانے لگی۔ اور وہ شیڈ کی طرف چل دیا۔

اس نے شیڈ کا دروازہ کھولا تاک پر دیا ٹمٹما رہا تھا۔ دیئے کی مدھم روشنی چاروں طرف پڑ رہی تھی۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ایسی ویرانی جو ہنگامے کے عقب میں آتی ہے اور ہیبت ناک خاموشی کو جنم دیتی ہے۔ ایسی خاموشی جس میں سے چیخوں اور سسکیوں کی بو آتی ہے۔

امر سنگھ گھبرا کر باہر نکل رہا تھا کہ دروازے کی اوٹ سے بچہ نکل آیا۔ وہ چھوڑ رہی ہے۔ بچے نے تتلا کر کہا۔ چھوڑ رہی ہے۔ جاگی نہیں۔ جاگتی نہیں۔

سو رہی ہے۔ امر سنگھ نے حیرانی سے دہرا دیا۔

ہاں۔ وہ بولی۔ وہ۔ اس نے فرش کے درمیان انگلی سے اشارہ کیا۔

فرش پہ وہ پڑی تھی۔ بازو اور ٹانگیں پھیلائے۔ بیکن کیرسے! امر سنگھ نے آنکھیں ملیں۔ سفید جسم۔ سنہرے بال۔ سرخ رنگ جیسے ہولی کھیل کر سو گئی ہو۔ اس کی نیل سوجی ہوئی چھاتیاں لٹک رہی تھیں۔

چھوڑ رہی ہے بچی چلائی۔ دیکھا۔ پھر وہ بھاگی بھاگی اس کی طرف گئی۔ امی امی۔ دیکھا چھوڑ رہی ہے۔ وہ بولی۔ بیمار ہے امی۔ ہاں۔ بیمار! امر سنگھ نے آہ بھری۔

ہاں وہ بولی۔ ڈاکو آئے تھے۔ انہوں نے امی کو ڈاکوؤں سے بچا لیا۔ ہاں وہ بڑے اچھے تھے۔ وہ کہتے تھے امی اچھی ہو جائے گی۔ پھر انہوں نے امی کو مالش کی۔

مالش! اس نے ایک بار پھر غور سے عورت کی طرف دیکھا۔

وہ سب امی کے پنڈے پر مالش کرتے رہے' وہ بولی۔ وہ کہتے تھے امی اچھی ہو کر سو گئی ہے۔ وہ بہت اچھے تھے۔

امر سنگھ نے محسوس کیا گویا عورت کے ہونٹوں پر تبسم آ رہا تھا۔ طنز بھرا تبسم۔ "وہ دائی کو لینے گئے ہیں"۔ بچی نے کہا۔

اوہ! امر سنگھ کا سر چکرانے لگا۔ اس اجالے سے تو باہر اندھیرا ہی اچھا تھا۔ اور اس معصوم بچی کی بھولی بھالی باتوں سے تو سڑک کے گدھوں کی خاموش حقیقت بیانی کہیں قابل برداشت تھی۔ امر سنگھ گھبرا کر باہر نکل آیا۔

امی امی۔ اندر سے بچی کی آواز آ رہی تھی۔ لیکن وہ دور بھاگا جا رہا تھا۔ دور۔ دور۔

ہائیں، وہ حیران رہ گیا۔ سامنے سڑک پر موتی دوڑا جا رہا تھا۔ تانگے میں کوچوان سر تھامے بیٹھا ہوا تھا۔

موتی! موتی! وہ چلایا۔ اور پھر تانگے کے پیچھے بھاگا۔ اور لپک کر سیٹ پر جا بیٹھا۔ کوچوان اپنی ہی دھن میں بیٹھا رہا۔ اسے امر سنگھ کی آمد کا احساس بھی نہ ہوا۔ البتہ موتی مسرت سے ہنہنایا۔ اور پھر نہ جانے کیوں سڑک کو چھوڑ کر کھیتوں میں ہو لیا۔

کھیت ویران پڑے تھے۔ یہاں وہاں مویشی پکی ہوئی گیہوں کے خوشوں پر منہ مار رہے تھے۔ اس کے باوجود گویا وہ کھانے سے گریز کر رہے تھے، جیسے کھا کھا کر اکتا گئے ہوں۔ میدانوں میں کتنے موتی کو دیکھ کر بھونکنے کی کوشش کرتے لیکن

ان کی آواز گلے میں پھنس کر رہ جاتی اور جسم میں حرکت نہ ہوتی۔ مرغیاں زمین پر بکھی ہوئی آہنوں کو پاؤں سے رول رہی تھیں بستیوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔

دفعتاً موتی رک گیا۔ اس کے رکنے سے امر سنگھ تانگے کے نیچے پھسل گیا۔

کوچوان نے چونک کر سر اٹھا۔ نہیں نہیں بیٹے ہم کرشن نگر نہیں جائیں گے، نہیں جائیں گے۔ لیکن موتی کھڑا رہا۔ دو ایک ساعت کے بعد کوچوان پھر سر کو ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔

امر سنگھ تیر تا ہوا گاؤں میں جا پہنچا۔

حویلی کے عندر دروازے پر دراز قد آدمی کھڑا تھا۔ اس نے مونچھوں اور داڑھی کے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر اپنا منہ نکالا۔ اور امر سنگھ سے کہنے لگا۔ تمہیں شک ہے کیا، شک ہے تو آ کر دیکھ لو۔ آؤ، اس نے حویلی کی طرف اشارہ کیا۔ میرے گھر میں کوئی مسلمان نہیں، میں نے کسی مسلمان کو پناہ نہیں دی۔ سنا تم نے۔ جاؤ۔ دوڑ جاؤ یہاں سے۔ بدمعاش کمینے دراز قد آدمی دوڑ کر حویلی میں گھس گیا اور چھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔

آہ آہ! اندر سے آواز آئی۔ میرا سر میرا سر۔ مجھے پکڑو۔ نہیں نہیں، میرے گھر میں کوئی مسلمان نہیں۔ ا

کوئی محیلمان نہیں بچے کی آواز آئی۔ وہ تو لجید کے ابا ہیں۔ محیلمان تو نہیں۔ وہ بڑے اچھے ہیں۔ لجید میری چھیلی کے ابا۔

پھر بچے کی ایک لمبی چیخ سنائی دی اور پھر مکان پر سناٹا چھا گیا۔

دفعتاً امر سنگھ کو خیال سا آیا اور وہ تانگے کی طرف بھاگا۔

اس نے کوچوان کو جھنجھوڑا۔ بھاگ جاؤ۔ وہ بولا۔ تم کرشن نگر آ گئے ہو۔

موتی نے چیخ ماری اور تڑپ کر ساز توڑ کر بھاگ نکلا۔

موتی، موتی، کوچوان چلایا۔ مگر موتی جا چکا تھا۔ کوچوان نے قمیض کے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔

میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ امر سنگھ چلایا۔ چلے جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔

کہاں، کوچوان نے ٹوٹے ہوئے تانگے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

پاکستان۔

پاکستان! ہا ہا ہا ہا۔ فضا سے قہقہے کی آواز سنائی دی۔

کوچوان نے ٹوٹے ہوئے تانگے کی طرف دیکھا۔ موتی، وہ زیر لب گنگنایا، میرا ساتھی۔

ساتھی! اندھیرے سے آواز آئی۔ اور سوجے ہوئے جسم والی عورت رینگتی ہوئی سامنے آ گئی۔ ساتھی، وہ ہنسی۔ جھوٹ جھوٹ!! اور منہ کے بل گر پڑی۔ بازو اکڑ گئے گردن مڑ گئی۔

رجیہ، رجیہ! حویلی سے معصوم بچہ نکل آیا۔ تمہارے ابا یہاں ہیں یہاں ـــــ دفعتاً اس کی نگاہ امر سنگھ پر پڑی۔ نہیں نہیں وہ محیلمان نہیں وہ تو رجیہ کے ابا ہیں۔

چپ، رضیہ بولی۔ چپ۔ امی جھور ہی ہے، جھور ہی ہے۔ وہ بڑے اچھے ہا ہنوں نے امی کو ماس کی اور امی اچھی ہو کر سو گئی۔

کوچوان، کوچوان! امر سنگھ نے اسے گھسیٹا۔ آؤ۔ آؤ۔ بھاگ چلیں۔ اور وہ دونوں بھاگنے لگے۔

لیکن کہاں، کہاں، کوچوان نے بھاگتے ہوئے امر سنگھ کی طرف دیکھا۔

کہاں؟ امر سنگھ نے دہرایا اور دفعتاً رک گیا۔

اس کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ راستہ روکے کھڑی تھی وہ۔

مجھے مار دو وہ چلائی۔ مار دو مجھے۔ اس نے امر سنگھ سے کہا۔ میں مسلمان ہوں، مجھے مار دو۔

اس کا حسن اور جوانی دیکھ کر وہ دونوں ٹھٹک گئے۔

تم پاکستان کیوں نہیں چلی جاتی۔ امر سنگھ چلایا۔

نہیں نہیں، وہ بولی۔ میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔ مجھے قتل کردو لیکن میں پاکستان نہ جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی نہیں اپنے گرو کی قسم۔ مجھے قتل کردو۔ ماردو۔ میرا جینا بیکار ہے۔ بیکار۔

وہ کہاں ہیں؟ وہ دونوں؟ وہ بکنے لگی۔ میں انہیں یہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ یہاں۔ اس کھیت میں۔ وہ دونوں کرپانوں سے لڑ رہے تھے۔ میرے لئے۔ آپس میں لڑ رہے تھے۔ بھائی بھائی، لڑ رہے تھے۔ میرے لئے۔ وہ خاموش ہو گئی اور ایک نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

وہ کون؟ امر سنگھ نے پوچھا

وہی جو ہمارے گھر آئے تھے، جوان عورت نے ملامت سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے اس کے نہ جاننے پر شکایت کر رہی ہو۔ انہوں نے میرے پانچوں بھائی شہید کر دیئے۔ اور پھر اماں کی طرف بڑھے۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا۔ میں نے دوپٹہ اتار پھینکا۔ اور اماں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ مجھے مارو۔ مجھے، میں مسلمان ہوں۔ میں کافروں کے منہ پر تھوکتی ہوں۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ رک گئے۔ اس نے اپنے بھائی سے کہا، یہ سب مال تمہارا ہے۔ سب۔ اور یہ، اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ یہ میرا حصہ ہے۔ یہ کہہ کر وہ مجھے گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اور مجھے اس کھیت تک لے آیا۔ یہاں۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو چھوٹا پیچھے آرہا تھا۔ ٹھیرو، سجن سنگھ، وہ بولا۔

اسے مجھے دے دو۔

بیوقوف بڑا چلایا۔

جوڑ میرا ہے وہ بولا۔

لیکن وہ مال، بڑے نے کہا۔

تھو۔ چھوٹے نے تھوک دیا۔ میں اس پر تھوکتا ہوں۔

بڑے نے گھونسہ مارا۔ چھوٹے نے کرپان نکال لیا۔ اور وہ دونوں کرپانوں سے لڑنے لگے۔ اور میں یہاں بیٹھی دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی اور وہ لڑتے رہے۔ میری خاطر۔

پھر، امر سنگھ بولا۔

پھر۔ سڑک پر موٹر رکی اور میں اٹھ بھاگی۔ اور وہ لڑتے رہے۔ میرے لئے لڑتے رہے۔ انہوں نے میرے بہن بھائی قتل کر دیئے گھر تباہ کر دیا۔ لیکن انہوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔ اور وہ، اف وہ پاکستان کا فوجی۔ اس نے کہا تھا آؤ میں تمہیں کیمپ میں پہنچادوں۔ اور۔ اور

میں پاکستان میں پہنچ کر لٹ گئی۔ پاکستان پہنچ کر لٹ گئی۔ نہیں نہیں، میں پاکستان نہ جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی۔

مار دو، مجھے مار دو۔

کھیت میں دو کٹی ہوئی سریاں لڑھکنے لگیں۔

وہ میری ہے۔ چھوٹا سر بڑے سے ٹکرایا۔

میری، بڑا چلایا۔ اور وہ ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔

بھاگو، بھاگو! امر سنگھ چلایا۔

کہاں؟ کوچوان نے اپنے اردگرد حسرت بھری نگاہ سے دیکھا۔

نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔ حسین عورت چلائی۔ پاکستان میں جا کر لٹنے سے یہاں مر جانا بہتر ہے۔

نہیں نہیں! جھوٹ ہے، جھوٹ ہے۔ یہاں نہ ٹھیرو۔ یہاں نہ رکو۔ نہ جانے ٹھیار عورت کہاں سے آکر شور مچانے لگی۔ یہ دیکھو، میری کلائی پر۔ ہندی، شکنتلا، میرا نام۔ یہ دیکھو۔ اُسے امر سنگھ کی طرف کلائی بڑھا دی۔ اس نے اس کی بھی پروا نہ کی۔ وہ مجھے جانتا تھا۔ وہ میرا پڑوسی تھا۔ لیکن وہ کہنے لگا میں مسلمان ہوں۔ کیشوں کے باوجود۔ ہا ہا ہا مسلمان!! ہا ہا ہا۔ وہ ہنسی۔ زہرخند ہنسی۔ —— سب جھوٹ۔ کوئی مسلمان نہیں۔ کوئی ہندو نہیں۔ سکھ نہیں۔ یہاں درندے بستے ہیں۔ درندے۔

پاگل نہ ہو امر سنگھ چلایا۔ بھاگ چلو، بھاگ چلو۔

کہاں؟ کوچوان نے سر اٹھایا۔

جہاں انسان بستے ہوں۔ وہ بولا۔

انسان، دوسری عورت ہنسی۔ انسان کہاں ہیں؟ کہاں۔ کہیں بھی نہیں۔

اوہ۔ کوچوان نے پھر سر تھام لیا۔

میں بھاگوں گی نہیں۔ ٹھیار عورت چلائی۔ نہیں! مجھے جنم دینا ہے۔ انسان کو جنم دینا ہے۔ میں جنم دوں گی۔ اس نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

جنم دینا ہے۔ دوسری عورت نے حیرانی سے دیکھا۔

ہاں! میں نے، تم نے، ہم نے، انسان۔

خدا کرے۔ کوچوان بولا۔

خدا! دوسری عورت کھلکھلا کر ہنسی۔ کاش کہ وہ کچھ کر سکتا۔ کاش۔

میں کروں گی۔ میں، ٹھیار چلائی۔ انسان، انسان۔

کس نے پکارا، کون ہے اس گھور اندھیرے میں؟ لنگوٹی والا لاٹھی پکڑے نہ جانے کہاں سے آگیا۔ کون؟

انسان! انسان۔ وہ دونوں چلانے لگیں۔

انسان! لنگوٹی والے نے آہ بھری۔

تم کون ہو؟ ٹھیار چلائی۔

میں کوئی بھی نہیں، کچھ بھی نہیں۔

کوئی بھی نہیں؟ کوچوان نے حیرانی سے دیکھا۔

شانتی شانتی۔ بڈھے نے مدھم آواز میں کہا۔

شانتی؟ عورت نے اس کی طرف دیکھا۔ نہیں نہیں شانتی نہیں۔ انسان۔ وہ چلائی۔ میں جنم دے رہی ہوں۔

تم! دھن ہو۔ بڈھا بولا۔ اور اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے پرنام کیا۔

میں تمہاری رکشا کرونگا۔ امر سنگھ بولا۔

ٹمیارا اور دوسری عورت، دونوں کھیت میں گھس گئیں۔

انسان، انسان۔ دور سے آوازیں بلند ہوئیں۔

انسان، انسان۔ گدھ چیخے۔

انسان! لاکھوں بھونرے بھنبھنانے لگے۔ اور وہ آواز تیز ہوتی گئی تیز ہوتی گئی۔

سان۔ سان۔ سان۔ سان۔

آہا! کوچوان چلایا۔ وہ۔

امر سنگھ نے اوپر دیکھا۔ اس کے سر پر بلوری آسمان چمک رہا تھا جس میں سے دو پہلی کرنیں پھوٹنے لگیں تھیں۔

●

کرنیں

شفیق الرحمٰن کے اُن افسانوں کا مجموعہ جن میں کرنوں کی سی تازگی اور چمک ہے جو ہر گام پر رُمان اور مزاج کا دلپذیر سنگم تیار کرتے ہیں اور جو ہر فقرے سے اپنے لکھنے والے کی محبوب اور حسین شخصیت کی غمازی کرتے ہیں۔ نیا ایڈیشن

قیمت ۲ رُوپے

مکتبہ اردو لاہور

انور

ظلمت

گھٹاٹوپ اندھیرا!

کڑکڑاتا ہوا جاڑا!

پناہ گزینوں کا کیمپ، رحمت کے ان دو فرشتوں کے سائے میں آرام کر رہا ہے۔ انسانیت کا تھکا ہوا قافلہ منزل کی ریشمیں آغوش میں سویا پڑا ہے۔

تند برفانی ہواؤں کے راستے پر کھلے میدان میں پھٹے پرانے خیمے بے کسی کے عالم میں خاموش کھڑے ہیں۔ جنگل سے جمع کی ہوئی لکڑیاں حرارت غریزی کو قائم رکھنے کی ناکام کوشش کر کے سرد ہو گئی ہیں۔ بھوک سے بھنچے ہوئے جسم بے رحم موسم کے جنگل سے بچنے کے لئے خیرات کے بوسیدہ کمبلوں اور لحافوں میں چھپ کر لیٹ گئے ہیں۔

کلاک ٹاور نے دو بجائے۔

مسلم نیشنل گارڈ کے سپاہی نے ایک تلخ احساس کے ساتھ انگڑائی لی۔ اس کی آنکھوں میں رات کی ڈیوٹی کی تھکاوٹ نہیں۔ سنجیدہ ذمہ داری کا احساس ہے۔ وہ میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا اپنے اداس لمحوں کو تاریخ اسلام کے مطالعے میں ڈبونے کی کوشش کر رہا ہے۔ دبی ہوئی بے چینی اس کو پہلے سے بھی زیادہ بے چین کر دیتی ہے، اور وہ اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے۔ کمرے کی مدھم روشنی اور دفتر کی مغموم فضا سے گھبرا کر وہ دروازے کے پاس آکھڑا ہوتا ہے۔ ایک لمحہ تک تاریک فضا میں اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر وہ دیکھتا ہے کہ تند برفانی ہواؤں کے راستے پر کھلے میدان میں پھٹے پرانے خیمے بیکسی کے عالم میں خاموش کھڑے ہیں۔ اس کا درد عد سے سوا ہو جاتا ہے۔ وہ میز کے پاس پناہ گزینوں کے رجسٹر سے کھیلنے لگتا ہے۔ اس میں اس کو وہ تازہ نام نظر آتے ہیں جو اس نے آج شام کو داخل کئے تھے۔

درد سے لبریز آواز اس کے خیال کے پردوں سے ٹکراتی ہے۔

"یہ میری ماں ہے، یہ میری پانچ بہنیں ہیں۔ قیامت کی رات تھی، وہ آخری رات جو ہم نے اپنے محلے میں گذاری تھی۔ بہت سے کنبے جن کے مکان زیادہ خطرے کی جگہ پر تھے ہمارے ہاں جمع ہو گئے تھے۔ ساری رات جوان لڑکے جن میں میرا بھائی بھی تھا ہاتھوں میں لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لئے محلے میں پہرہ دیتے رہے تھے۔ جب ساتھ کے گوردوارے سے ست سری اکال کی آواز آتی تھی، ہمارے محلے والے اللہ اکبر کا نعرہ مارتے تھے۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے خوف کے مارے کلمہ پڑھنے لگتے تھے۔ اس وقت میری بھابی زہ کے درد میں مبتلا تھی۔ کوئی دو بجے کے قریب میرے بھائی کے پہلا لڑکا پیدا ہوا۔ فجر کی نماز کے وقت ہوا میں گولیاں سنسنانے لگیں۔ موذن اذان دیتا دیتا دھڑام سے مسجد کے فرش پر لہولہان ہو کر گرا۔ نمازی مسجد چھوڑ کر بھاگے۔ محلہ خالی ہونا شروع ہو گیا۔ لیکن ہم کیا کرتے۔ میری بھابی میں ہلنے کی بھی سکت نہ تھی۔ میرے ضعیف باپ اور بھائی نے ان لوگوں کی جنہوں نے ہمارے ہاں رات کاٹی تھی، ہزار منت کی کہ وہ بھابی کی کمزوری کا لحاظ رکھتے ہوئے کچھ دیر اور ہمارا ساتھ دیں، لیکن کسی نے ایک نہ سنی۔ نو بجے تک سارا محلہ قبرستان کی طرح سنسان ہو گیا۔ گولیاں بدستور سنسنا رہی تھیں۔ اور جب ساتھ کے گوردوارے سے ست سری اکال کی آواز آتی اور اس کے مقابلے میں اللہ اکبر کا نعرہ

بلند نہ ہوا تو میرے بھائی نے کیا سکھ آ گئے۔ میری ماں اور پانچوں بہنیں بھاگ کر کوٹھے پر چڑھ گئیں۔ میرے بھائی نے مکان کو اندر کی جانب سے تالے لگا دیئے۔ میں نے، گھٹنے کے بچے کو اٹھا لیا۔ اور ہم نے پچھواڑے کے خالی مکان میں اتر کر بھاگنے کا ارادہ کر لیا۔ ہمارے اور پچھواڑے کے مکان میں کافی اونچی دیوار کا پردہ تھا۔ اس پردے سے دوسری طرف اترتے وقت ہمیں ایک سکھ فوجی وردی میں رائفل کے ساتھ ایک چوبارے پر صاف نظر آ رہا تھا۔ میرے بھائی نے میرے باپ کو میری ماں کو، میری پانچوں بہنوں کو اور مجھے پکڑ پکڑ کر دوسری طرف اتار دیا۔ جب اس نے میری بھابی کو دوسری طرف اتارنے کے لئے اٹھایا تو تڑاخ سے ایک گولی اس کی کنپٹی میں لگی۔ وہ بھابی سمیت ہمارے کوٹھے پر گر پڑا۔ میں چیخنے لگی بھیا! بھیا! کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے پھر پکارا بھیا! بھابی! بھابی کی دبی ہوئی سسکیوں میں سے آواز آئی "بی بی تمہارے بھائی ختم ہو گئے ہیں۔ میرے گھٹنے میں سخت چوٹ آئی ہے۔ مجھ سے اب اٹھا نہیں جائے گا میرا خیال چھوڑ دو اپنی جان بچاؤ، میرے بیٹے کا خیال رکھنا۔ خدا حافظ! تیسرے محلے سے ست سری اکال کا نعرہ بلند ہوا۔ ہماری اس وقت کی حالت کا اندازہ لگانا مشکل ہے بھائی کو بے گور و کفن، بھابی کو زندہ درگور، برقعوں اور ریشمی کپڑوں کو کھونٹیوں پر اور تین بہنوں کے شادی کے جہیز اور زیور کو ٹرنکوں میں چھوڑ کر ہم بے پردہ، ننگے پاؤں، گلی میں پڑی ہوئی لاشوں میں سے ہوتے ہوئے کیمپ میں پہنچ گئے۔ بچہ دس دن کے بعد کیمپ میں بھوک اور پیاس سے مر گیا۔ اور وہیں والد بیٹے کے غم سے نڈھال ہو کر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ اور ہم ——"

رضیہ کی درد سے لبریز آواز اس کے خیال کے پردوں سے ٹکراتی ہے۔ شام کے وقت اس دلگداز داستان نے اس پر رقت طاری کر دی تھی۔ اور رضیہ، رضیہ کی ماں اور رضیہ کی پانچ بہنوں کے نام رجسٹر میں داخل کرتے وقت اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ اب رضیہ کا سات عورتوں پر مشتمل کنبہ کیا کریگا۔ اس کا کما کر کھلانے والا ایک ہی بھائی ان سے چھین لیا گیا۔ اور اپنے آپ کو تو ان حالات میں تصور کر کے وہ کانپ گیا تھا۔ وہ خود بھی ایک بڑے کنبے کے لئے روزی کا واحد ذریعہ تھا۔ اگر وہ مشرقی پنجاب کا رہنے والا ہوتا اور رضیہ کے بھائی کی طرح مارا جاتا تو اس کی ماں، اس کے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن، اس کی بیوی اور اس کے چار بچے کیا کرتے۔ ان خیالات نے اس کی رضیہ کے ساتھ ہمدردی کو زیادہ گہرا کر دیا تھا۔ اور اس نے شام کا وہ کھانا جو اس کے لئے گھر سے آیا تھا، رضیہ کے کنبے کے سامنے رکھ دیا تھا، اور خود بازار سے اور کھانا لینے چلا گیا تھا۔ واپس آ کر اس نے رضیہ کی ماں کو ماں کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور خاص سٹور میں سے ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے لحاف اور کمبل دے کر ایک اچھے سے خیمے میں آباد کر دیا تھا۔

مسلم نیشنل گارڈ کا ہمدرد سپاہی! مسلم قوم کا پُر خلوص محافظ!

شام کے اس واقعے کی یاد نے اس کو اور بھی زیادہ بےچین کر دیا ہے۔ اس نے پناہ گزینوں کا رجسٹر بند کر دیا اور اٹھ کر کمرے میں پھر ٹہلنے لگا۔ دروازے کے پاس جا کر اس نے اپنی کلائی پر گھڑی دیکھی۔ اور بیدلی سے دروازے کو کھول کر باہر کی طرف دیکھنے لگا:

گھٹا ٹوپ اندھیرا!

کڑکڑاتا ہوا جاڑا!

پناہ گزینوں کا کیمپ رحمت کے ان دو فرشتوں کے سائے میں آرام کر رہا ہے۔ تند برفانی ہواؤں میں پھٹے پرانے خیموں کی دھجیاں پھڑپھڑا رہی ہیں۔ پھڑپھڑاتی ہوئی دھجیوں کے شور میں سے ایک بچے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

ماں!

بچے کی ماں خیمے میں نہیں ہے۔ وہ اپنے نانا کے ساتھ لیٹا ہوا ہے۔

"ہاں!"

"مجھ سے لپٹ جاؤ بیٹے۔ پھر تمہیں سردی نہیں لگے گی۔"

"ہاں، ہاں!"

بچے کی پکار نے بوڑھے کو زیادہ متفکر کر دیا۔ اس کی بیٹی ابھی تک کیوں نہیں آئی؟ سردی کے علاوہ اس فکر نے بھی ابھی تک اسے سونے نہیں دیا۔ وہ اٹھا۔ ضعیف، کمزور بوڑھا سردی کی شدت سے کانپتا ہوا۔ اس نے بوسیدہ کمبل کو دو تہیں بنا کر بچے پر دے دیا ٹٹولتا ٹٹولتا باہر نکلا اور دفتر کی طرف چل دیا۔

مسلم نیشنل گارڈ کا سپاہی دروازے پر کھڑا تھا۔

"بیٹا! میری بیٹی ابھی تک کیوں نہیں آئی؟"

"بڈھے، تو پھر آ گیا ہے مجھے پریشان کرنے کے لئے۔ میں حیران ہوں کہ تو اتنا سیانا ہو کر یہ نہیں سوچ سکتا کہ تیرے اس سوال کا جواب اب تیسری دفعہ بھی میں وہی دونگا جو میں نے پہلی دفعہ دیا تھا۔ اب میں تجھے کتنی دفعہ بتاؤنگا کہ تیری لڑکی اس شہر کے سب سے بڑے رئیس کے گھر میں اس کی لڑکی کو پڑھانے کیلئے بھیجی گئی ہے۔ اس شہر کے سب سے بڑے رئیس کے گھر میں جو اس کیمپ کے پناہ گزینوں کا سارا خرچ اٹھا رہا ہے۔ جس نے تمہیں یہ خیمے دئے ہیں، جو تمہیں ہر روز کھانا بھیجا کرتا ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ اگر تیری لڑکی اس کی صاحبزادی کو تسلی بخش پڑھائیگی تو وہ اس کو اپنے قائم کئے ہوئے لڑکیوں کے سکول کا پرنسپل بناویگا۔ بس کہ پھر بتاؤں؟"

"یہ تو ٹھیک ہے بیٹا، پر میں کہتا ہوں کہ اتنی رات جا چکی ہے۔ اب تک تو اسے آ جانا چاہئے تھا۔"

"اب مجھے یہ کیا معلوم ہے کہ وہ ابھی تک یہاں کیوں نہیں آئی۔ یہاں سے تو وہ کار میں لے گئے تھے۔ اور مجھے بتایا گیا تھا کہ کار میں ہی چھوڑ جائیں گے۔ ممکن ہے لڑکی نے پڑھنے کے بعد چاہا ہو کہ اس کی استانی رات کو اس کے پاس ہی ٹھہر جائے۔ پر میں پوچھتا ہوں کہ تم کیوں خواہ مخواہ فکر میں مرے جا رہے ہو۔ تمہاری لڑکی کو کوئی کھا تو نہیں جائے گا۔"

"اس کا بچہ جو اس کے لئے بلک رہا ہے، بیٹا!"

"تو بچے کو سمجھاؤ نا۔"

"بچہ سمجھ سکتا تو بچہ کیوں ہوتا۔ سردی سونے بھی نہیں دیتی۔ ایک کمبل اور دے دو تو شاید سو جائے۔"

"میرے پاس کمبل ہوتے تو پہلے ہی نہ دیدیتا۔ ایک، ایک کمبل سب کے حصے میں آیا ہے تمہیں بھی مل گیا ہے ایک۔ لیکن تم یہ تو دیکھتے نہیں کہ تمہاری لڑکی اتنے بڑے رئیس کے ہاں استانی مقرر ہوئی ہے۔ اچھے اچھے کپڑے، بھاری بھاری لحاف لے کر آئے گی۔ اور جلدی ہی تمہیں مکان بھی مل جائے گا۔ بڑے بڑے فائدوں پر تو تمہاری نظر نہیں جاتی۔ چھوٹی چھوٹی شکایتیں لئے دوڑتے پھرتے ہو سچ پوچھو تو ان پناہ گزینوں نے ہمارا ناک میں دم کر دیا ہے۔ دوزخ بنا دیا ہے انہوں نے پاکستان کو۔"

دروازہ بند ہو گیا۔

لیکن دروازہ بند کیوں ہو گیا ہے۔ رات کے اس مشکوک وقت میں تو دفتر کا یہ دروازہ آہستہ سے کھلا کرتا ہے۔ اور نیشنل گارڈ کا یہ ہمدرد سپاہی خیموں میں گشت کرنے کیلئے باہر نکلا کرتا ہے۔ مصیبت زدہ پناہ گزین آرام سے سوئے پڑے ہیں یا نہیں۔ اور جب رشیدہ کے خیمے کے پاس پہنچ کر اسے یقین ہو جاتا تھا کہ تمام پناہ گزین غفلت کی نیند سوئے پڑے ہیں تو وہ بغیر کسی آہٹ کے رشیدہ کے خیمے میں داخل ہو جاتا تھا۔ لیکن آج دروازہ بند کیوں ہو گیا ہے۔ رشیدہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ عرصے سے خیمے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ آج ایک

لمحے کے لئے بھی نہ سو سکی تھی۔ آج اسکو اس کا شدت سے انتظار تھا۔ آج وہ اس کو بتانا چاہتی تھی کہ اگر وہ بہت جلد اس کیساتھ شادی نہ کریگا تو وہ تباہ ہو جائے گی۔ وہ لڑکھڑا گئی۔ اس نے زور سے خیمے کے پردے کو پکڑ لیا۔

شاید رشیدہ بیوقوف ہے نادان ہے۔ وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی کہ نیشنل گارڈ کے سپاہی نے دروازہ اسی لئے کھولا تھا۔ وہ اسکی طرف آرہا تھا۔ وہ کمبخت بوڑھا راستہ روک کے کھڑا ہو گیا۔ وہ آئے گا، ضرور آئیگا۔ نیشنل گارڈ کا ہمدرد سپاہی۔ جس نے پہلے دن اسکی دردبھری داستان سن کے اس کے ساتھ آنسو بہائے تھے۔ جو یہ جانتا تھا کہ اب رشیدہ کا اسکے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے ماں باپ، بھائی بھابی اور بھائی کے دو بچوں کیساتھ سکھوں کی کرپانوں سے بچ کے آئی تھی۔ انکے آنے کے تھوڑی دیر بعد کیمپ میں ہیضہ پھوٹ نکلا تھا۔ دو دنوں کے اندر اندر اس کا باپ، اس کی ماں، بھائی اور بھابی اس سے جدا ہو گئے تھے۔ وہ اپنے دو معصوم بھتیجوں کیساتھ اس دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ مصیبت کے اس وقت میں نیشنل گارڈ کے اس سپاہی نے ہی تو اسکی دلجوئی کی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ہر وقت بہنے والے آنسو پونچھے تھے۔ اس سے بوسیدہ کمبل واپس لیکر ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے شاندار لحاف دئے تھے۔ وہ آئیگا، ضرور آئیگا۔ نیشنل گارڈ کا ہمدرد سپاہی وہ جانتا ہے کہ رشیدہ کا اس کے سوا اس دنیا میں اب کوئی نہیں۔ اس کا دل ٹھہر گیا۔ اس نے دفتر سے نظریں ہٹا کر خیمے کے اندر کی طرف دیکھا۔ اندھیرے میں لپٹے ہوئے اس کے دونوں معصوم بھتیجے سوئے پڑے تھے۔ اس نے سوچا انکا بھی اس دنیا میں اب کوئی نہیں۔ لیکن کیوں نہیں۔ وہ خود جو ہے۔ وہ خود انکا باپ ہے۔ وہی انکی ماں ہے۔ ماں۔ ماں۔ ماں۔۔ او خدا وہ تو ماں ہے۔ وہ تو صحیح معنوں میں ماں بننے والی ہے۔ وہ آج کیوں نہیں آیا۔ آج اس کو اس کا شدت سے انتظار ہے۔ وہ آج اسکو بتانا چاہتی ہے کہ اگر وہ بہت جلد اس کے ساتھ شادی نہ کریگا تو وہ تباہ ہو جائیگی۔ اسکی نظریں دفتر کے دروازے پر منجمد ہو گئیں۔ دفتر کا دروازہ دور مدھم بلب خیموں کی تاریک دنیا میں مشعلِ راہ کی طرح چمک رہا تھا۔

اور اس مشعلِ راہ کی روشنی میں بیٹھا بوڑھا اسکو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ وہ ٹوٹا ٹوٹا اپنے خیمے کی طرف جا رہا ہے۔ پاکستان کی سرزمین اس کمزور بوڑھے کے بوجھ کو اپنے سینے پر محسوس کر رہی ہوگی۔ ان کے منحوس قدموں نے اس مقدس سرزمین کو دوزخ بنا دیا ہے۔ ان شوریدہ سر ناگہزیوں نے یہاں کے امن پسند باشندوں کے آرام میں خلل ڈال دیا ہے۔ یہ ان سے ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی جائدادوں میں سے حصہ لینے کیلئے پاکستان میں گھس آئے ہیں۔ اسے اپنی جنت یاد آگئی۔ وہ ہندوؤں کے محلے میں ایک ہندو دوست سے ملنے گیا تھا۔ وہاں کہیں کہیں مسلمانوں کے بھی گھر تھے۔ یکایک سڑک سے چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ دوسری منزل سے دوستوں کیساتھ نیچے دیکھنے لگا۔ بیس کے قریب سکھوں نے ایک مسلمان فیملی کو تانگے سے اتار لیا تھا اور انکو ایک قطار میں کھڑا کر لیا تھا۔ دو عورتیں تھیں، ایک بچہ اور دو مرد۔ ہر ایک کے پیچھے دو دو سکھ ننگی کرپانیں لئے کھڑے تھے۔ انکو بتا دیا گیا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد جو کچھ انکے ساتھ ہونیوالا ہے۔ اسکو دیکھ کر اگر کسی نے کوئی جنبش کی تو اسکے پیچھے والے سکھ اسکی گردن اڑا دینگے۔ جتھے کے سردار نے کہا۔ دونوں عورتوں میں سے اگر کوئی کنواری ہو اور سکھنی بننا چاہے تو وہ باہر آجائے۔ کوئی جنبش نہ ہوئی۔ ایک سکھ نے کرپان کی نوک سے ایک عورت کا برقعہ اتار دیا۔ اف کتنی نازک، کتنی نوجوان، کتنی حسین عورت تھی۔ ایک سکھ نے زبردستی اس کو ننگا کر دیا۔ اردگرد کے مکانوں سے دیکھنے والی ہندو عورتیں چیخیں مار کر اندر بھاگ گئیں۔ مسلمان مردوں میں سے ایک نے جو کڑیل جوان تھا چلا کر کہا میری گردن اڑا دو۔ میری گردن اڑا دو۔ لیکن اس کے پیچھے کھڑے ہوئے دونوں سکھوں نے اسکی گردن اڑانے کی بجائے اسکو لاتھوں سے باندھ لیا۔ ننگی عورت کا خوبصورت جسم دھوپ میں سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ ایک سکھ نے اسکو بازو اٹھانے کیلئے کہا۔ اس طرح اس کا ابھرا ہوا سینہ اور بھی آگے کو ابھر گیا۔ دوسرے سکھ نے کرپان کے ایک وار سے اسکی دونوں چھاتیاں کاٹ ڈالیں۔ وہ سڑک پر گر کر چیخنے لگی۔ خدا کیلئے

میرا گلا کاٹ دو۔ خدا کیلئے مجھے مار ڈالو۔ اور پھر بیہوش ہو گئی۔ ایک سکھ نے اسکو چت کر دیا اور اسکے نازک جسم کے نازک ترین مرکزی حصے میں سے کرپان گذار کر سڑک پر گاڑ دی اور بولا "پاکستان کا جھنڈا پاکستان میں۔ ایک اور سکھ نے بچے کے پیٹ میں کرپان گاڑ کر اسکو ہوا میں بلند کر دیا اور تڑپتے ہوئے بچے کو دیکھ کر چلایا۔ "دیکھو دیکھو! پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا ہے"۔ گرانڈیل نوجوان کو سڑک پر لٹا کر پہلے اسکے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹیں۔ پھر ہاتھ پھر کلائیاں پھر کہنیاں پھر بازو حتےٰ کہ وہ درد کی شدت سے مرگیا باقی ایک بوڑھا اور ایک بڑھیا رہ گئے۔ ان پر انہوں نے زیادہ وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ایک ایک وار میں گردنیں دھڑ سے جدا کر دیں۔ اس وقت شہر کے سب مسلمان گھرانوں پر یہی بیت رہی تھی۔ بوڑھے نے اپنے ہندو دوستوں کے مکان کی دوسری منزل سے یہ سب کچھ دیکھا کانپ گیا۔ اسکے ہندو دوستوں نے اسکو فساد کے دوران میں چھپائے رکھا اور پھر موقعہ پاکر کیمپ میں پہنچا آئے۔ کیمپ میں پہنچکر اسکو اپنی بیٹی اور اس کا نواسا ہی زندہ ملے۔ اس کا داماد کیمپ میں بیوی اور بچے کو چھوڑ کر بوڑھے کے کنبے کی مدد کیلئے گیا تھا۔ واپس نہیں آیا۔ اس وقت بوڑھے کو اپنی جنت یاد آرہی ہے۔ اپنی جنت کو چھوڑ دینے کا افسوس ہو رہا ہے۔ اور وہ ٹٹولتا ٹٹولتا اپنے خیمے کیطرف جا رہا ہے۔ وہ اسی طرح ٹٹولتا ٹٹولتا چلتا رہیگا چلتا رہیگا چلتا رہیگا۔ پھر اس کا خیمہ آجائیگا۔ اس خیمے میں نہ اسکی بیٹی ہوگی اور نہ اس کا نواسا۔ صرف سکون ہوگا۔ صرف سکون۔

لیکن سکون کہاں ہے نیشنل گارڈ کے سپاہی کا احساس دل تو پہلے سے بھی زیادہ بےچین ہو گیا ہے۔ اس نے تاریخ اسلام کی ضخیم جلد کو بند کر کے پرے پھینک دیا ہے۔ اور اپنا سر ہاتھوں میں تھامے کہنیاں میز پر ٹیکے ہوئے مایوسی کی تصویر بنا بیٹھا ہے۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس نے ایسا تو کبھی نہ کیا تھا۔ ایک ضعیف بوڑھے سے ایسا سلوک۔ اور اسکے نواسے کو تو اس نے مار ہی ڈالا ہے۔ اتنے کمبلوں کے ہوتے ہوئے اسکو ایک کمبل بھی نہ دے سکا۔ اور پچھلے چند دنوں میں کتنے انسان سردی نے ہلاک کر دیئے تھے۔ اس نے جلدی سے گھڑی دیکھی۔ ابھی ٹائم ہے۔ ابھی رات باقی ہے۔ ابھی بوڑھے کو اور بوڑھے کے نواسے کو بچایا جا سکتا ہے۔ وہ اٹھا۔ کمبلوں کے ڈھیر میں سے چار کمبل اٹھائے اور باہر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے طمانیت کے ایک خوشگوار احساس کے ساتھ دروازہ کھولا۔

دروازے پر رضیہ کھڑی تھی،

"او رضیہ ـــ رضیہ ـــ تم آگئیں آخر ـــ تمہارے انتظار میں تو آج مجھ پر قیامت گذر گئی ـــــ"

اس نے کمبلوں کو پھر کمبلوں کے ڈھیر میں پھینک دیا۔ اور رضیہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر پاگلوں کی طرح چومنے لگا۔ پھر اس نے اس کو کھینچ کر اپنے پہلو میں کر لیا اور اس کا ماتھا۔ اس کی ناک۔ اس کے گال اور اس کی ٹھوڑی کو چوم چوم لیا۔

"کبھی بیٹھ کر تاریخ اسلام پڑھنے لگتا تھا کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا تھا۔ کبھی پناہ گزینوں کے رجسٹر میں تمہارے نام کو دیکھنے لگتا تھا۔ کسی طرح بھی چین نہ آتا تھا۔ پھر ایک بڈھے کیساتھ جان کر خفا ہوا اور دانستہ زور زور سے بولا کہ اگر تم سو گئی ہو تو جاگ اٹھو۔ اور اب تھوڑی دیر ہوئی میں یہ سمجھ چکا تھا کہ تم اپنا وعدہ بھول گئی ہو تم نہیں آؤ گی ــــ"

"میں ڈرتی تھی۔ میں ڈرتی ہوں کہ شادی سے پہلے یہ ...."

دفتر کا مدھم بلب بجھ گیا۔

ضعیف بوڑھا خیمے کے سامنے ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر بری طرح گرا۔ مشعل راہ بجھ گئی۔

رشیدہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ امیدوں کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو گیا۔

گھٹا ٹوپ اندھیرا!

کڑکڑاتا ہوا جاڑا!

پناہ گزینوں کا کیمپ رحمت کے ان دو فرشتوں کے سائے میں آرام کر رہا ہے۔ زندگی کا تھکا ہوا قافلہ منزل کی ریشمیں آغوش میں سویا پڑا ہے۔

عبدالمتین عاشق

پنجاب

الم کے غاروں نے لاکھوں اژدر اُگل دئیے ہیں،
یہ لاکھوں اژدر مرے بدن کے ہر ایک حصّے کو ڈس رہے ہیں،
سلگتا لہو میرے ہر بُنِ مو سے رِس رہا ہے!

مرے سپوتوں نے اپنے چمکیلے خنجروں سے،
اُڑا کے رکھ دی ہیں میرے پیکر کی دھجیاں اِس طرح فضا میں،
کہ جیسے اُن کی رگوں میں میرا لہو نہیں ہے،
کہ جیسے ہر صبح و شام میں اُن کی پرورش کے لئے پریشاں نہیں رہا ہوں،
کہ جیسے میں اُن کا باپ کیا، خاندان کا اِک ملازمِ پیر بھی نہیں ہوں!

یہ میرا سر جو کبھی ہمالہ کی چوٹیوں سے بلند تر تھا،
یہ میرا سر جس کو کل تلک آسماں کی رفعت بھی جھک کے آداب کہہ رہی تھی،
مرے عزیزوں کی ہمہماتی رقابتوں سے،
حقیر سا سنگِ رہگذر بن کے کھا رہا ہے ہر ایک پاؤں سے لاکھ ٹھوکر،
—— مرے لہو کی پھوار سے میری عظمتوں کے چراغ گُل ہو کے رہ گئے ہیں!

—مگر مرے زندہ دل سپوتوں پہ طعن کے تیر مت چلاؤ،
انہیں خدارا ملامتِ بے محل کے دوزخ میں مت اُتارو،
غلط قیادت نے اُن کے اذہان قطعی مفلوج کر دیئے تھے،
غلط قیادت نے اُن کو دیوانگی کے صحراؤں کے بگولے بنا دیا تھا،
یہ بے گنہ ہیں، یہ بے خطا ہیں،
فرشتے بھی اِن سے کم ہی معصوم ہوں گے شاید!

زمانہ کروٹ بدل رہا ہے،
وہ دیکھتے ہو اِک احمریں سا غبار اُفق پر اُبھر رہا ہے،
غلط قیادت کا سحرِ تاریک ایک لمحے کا میہماں ہے،
ابھی اُٹھیں گے یہ میرے غیور بیٹے آنکھوں میں انتقام و غضب کے شعلوں کا رقص لیکر
اور اس خس و خارِ پیشوائی کو پھونک ڈالیں گے ایک پل میں،
—یہ کس طرح والدِ معظم کی حرمتِ چاک چاک کو کر سکیں گے ہوش آنے پر گوارا؟

یہ میرے غیرت پناہ بچے ابھی مری زیست کے چمن میں نئی بہاریں بکھیر دیں گے
مرے گلستاں کا غنچہ غنچہ کلی کلی مسکراہٹوں کی کفیل ہوگی،
مرے بدن کا ہر ایک گھاؤ عدم کی سرحد کو چوم لے گا،
اور اس فسردہ جبین پر بازیافتہ طلعتوں کا آنچل لہک اُٹھے گا!

غلام باری

انگلستان کی سودیشی تحریک

سترھویں صدی کے وسط میں انگلستان کے ملبوسات میں نمایاں تبدیلی ہونے لگی تھی نئے نئے فیشن نکلنے۔ بڑے طبقوں ——— اور کسی حد تک ادنیٰ ——— میں ہلکے پھلکے کپڑوں کی مانگ بڑھنے لگی۔ چونکہ انگلستان کے جولاہے اس بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے یہ جنس دوسرے ملکوں ہی سے آسکتی تھی۔ اس زمانہ میں انگلستان کا ہمسایہ ملک فرانس انگریزوں کی نئی مانگ کو پورا کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ انگلستان نہ صرف فرانس کے فیشن کا نقال تھا بلکہ فرانس کے ریشم اور اس کی شرابوں کا بہت بڑا خریدار بھی تھا۔ انگلستان میں فرانس کی ان اجناس کی بڑھتی ہوئی درآمد نے انگریز سوداگروں اور صناعوں میں بے کلی پیدا کر دی۔ مخالف پارٹی نے پارلیمنٹ میں شور مچایا چنانچہ ۱۶۷۸ء میں ایک ایکٹ کے ذریعہ فرانس کے ریشم اور اس کی شراب کا داخلہ بند کر دیا گیا لیکن اس پر بھی برطانوی اپنے ملکی اور پرانی وضع کے کپڑوں کی طرف مائل نہ ہو سکے۔ ایک کتابچہ نگار کے الفاظ میں "ایک اجنبی ملک کے کپڑے کو ممنوع قرار دیتے ہی دوسرے اجنبی ملک سے کپڑا آنے لگا۔ جب لوگوں نے ہندوستان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ دیکھتے دیکھتے ہمارے ہاں کے امیر غریب، سب ہندوستانی کپڑوں میں ملبوس نظر آنے لگے۔"

۱۶۸۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں نے لکھا تھا کہ بڑے بڑے گھرانوں کی خواتین چھینٹ کو بہت پسند کرتی ہیں۔ انگلستان کے شاہی خاندان کے افراد ہندوستانی کپڑوں کے بہت دلدادہ تھے۔ آہستہ آہستہ انگلستان کے تقریباً سبھی طبقوں میں ہندوستانی کپڑوں کی کھپت ہونے لگی کئی ایک لوگوں کو یہ بات ناگوار گزرتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کتابچوں میں نہ صرف فیشن کی مخالفت کی بلکہ ہندوستان کے "گھٹیا اور ناپائدار" کپڑوں کی بھی خوب مذمت کی۔ اس زمانے کے بہت سے کتابچوں میں ان عورتوں کا مذاق اڑایا گیا ہے جو اپنے لباس سے ہندوستان کی "رانیاں" معلوم ہوتی تھیں۔

ہندوستان کے سوتی کپڑے کا تنہا انگلستان ہی خریدار نہیں تھا بلکہ یورپ کے دوسرے ممالک بھی اس کے خریداروں میں سے تھے۔ ڈینیل ڈی فو کی ایک تحریر کے مطابق "ہندوستان کی چھینٹ خشکی کے راستے سے ترکی خشکی اور تری کی راہ سے ماسکو اور تاتار، اور طویل سمندری سفروں کے بعد یورپ اور امریکہ پہنچتی تھی۔"

جب سترھویں صدی میں برطانوی تجارت کا تعلق ہندوستان سے قائم ہوا۔ تو اس وقت سوتی کپڑے کی اجارہ داری ہندوستان کے ہاتھ میں تھی۔ یہ اجارہ داری جو ہزاروں برس سے قائم تھی انیسویں صدی کے اوائل تک قائم رہی۔ ہندوستان کی سیاسی محکومی اور انگلستان کے صنعتی انقلاب نے نہ صرف اس اجارہ داری کو ختم کیا بلکہ ہندوستان کو سوتی کپڑے کی درآمد کا محتاج بنا دیا۔

ہندوستان میں سوتی کپڑے کی صنعت بہت پرانی ہے۔ مصری، بابلی، ایرانی، یونانی، رومی، عرب اور دوسرے لوگ ہندوستان کے سوتی کپڑے سے واقف تھے۔ پہلی صدی عیسوی میں یونانی اور رومی تاجر ہندوستان کی ململ اور چھینٹ کو اپنے ہاں کے علاوہ دوسرے ملکوں تک بھی پہنچاتے تھے۔ روم اور رومی سلطنت کے دوسرے بڑے بڑے شہروں کی خواتین ہندوستان ہی کے سوتی کپڑے میں ملبوس دکھائی دیتی تھیں۔ از منۂ وسطیٰ میں عرب تاجر ان کپڑوں کو دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچاتے رہے۔ جاپان، چین اور ہند چینی کے لوگ صدیوں تک ہندوستان کے سوتی کپڑے استعمال کرتے رہے

مسولی پٹم اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ چھینٹ کے لئے دُنیا بھر میں مشہور تھا۔ بنگال کی ململ دُنیا کے ہر گوشے میں مقبول تھی۔ رومیوں کے عروج کے زمانے میں گنگا کی زرخیز وادی کی ململ رومی حلقوں میں "گنجی تیکا" کہلاتی تھی۔ ہر ملک کے سیّاحوں نے ہندوستانی کپڑے کی بہت تعریف کی ہے تیور نیر کے الفاظ میں بنگال کی ململ اتنی باریک ہوتی ہے کہ پہننے والے کا جسم ننگا معلوم ہوتا ہے "سوتی پارچہ بافی" کا مصنّف بینز اسی ململ کے بارے میں یہ لکھتا ہے کہ یہ کام یا تو پریوں کا معلوم ہوتا ہے اور یا کیڑوں کا۔ بنگال کی یہ پُرانی صنعت اگرچہ ختم ہو چکی ہے لیکن پھر بھی کبھی کبھار بہترین ململ کے نمونے دیکھنے میں آجاتے ہیں۔

۱۶۲۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں نے سوتی کپڑے کے پچاس ہزار ٹکڑے انگلستان بھیجے تھے۔ تیس برس بعد کپڑے کے ان ٹکڑوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۱۶۷۰ء کے بعد انگلستان میں ہندوستان کے سوتی کپڑے کی درآمد بہت بڑھ گئی۔ اسی زمانے میں انگلستان میں سُوتی کپڑے کا رواج عام ہو رہا تھا چونکہ فرانس کے کپڑے کی درآمد ممنوع تھی اس لئے انگلستان میں ہندوستانی کپڑے کی مانگ بڑھتی چلی گئی۔ ۱۶۹۷ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے اگرچہ فرانسیسی کپڑے کی درآمد پر سے پابندی اُٹھالی تھی پھر بھی ہندوستانی کپڑے کی درآمد میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ دو سال بعد جب فرانسیسی کپڑے پر پھر پابندی لگائی گئی تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر انگلستان کے طول و عرض میں ہندوستانی کپڑے کو پھیلا دیا "بیگم سے خادمہ تک سب کے سب ہندوستانی کپڑوں میں دکھائی دینے لگے"۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برطانیہ میں یہ احساس عام تھا کہ ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے میں برطانیہ کو نقصان ہے۔ اس ضمن میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی تھی کہ برطانیہ سے سونا ہندوستان کھنچ رہا ہے۔ چنانچہ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں انگلستان میں ہندوستانی کپڑے کے ضرر رساں ہونے سے متعلق بہت سے افسانے تراشے گئے تھے۔ اسی زمانے کے ایک کتابچہ میں یہ الفاظ دکھائی دیتے ہیں "اے انگلستان تمہیں اجنبی نگل رہے ہیں، غیر ملکی تمہیں کھا رہے ہیں تمہیں جن نوادر کا شوق ہے وہ تمہیں برباد کر دیں گے"۔ ان الفاظ کا عوام پر زود یا بدیر اثر کرنا یقینی تھا انگلستان میں سُوتی کپڑے کی درآمد نے وہاں کی اونی پارچہ بافی کی صنعت کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ انگلستان کے ہزاروں جولاہے ترک وطن پر مجبور ہو گئے یہ کوئی ایک بھوک اور افلاس کا شکار ہو گئے بیکاری بڑھ گئی۔ پارلیمنٹ کے اندر اور باہر دیسی کپڑے کی صنعت کے تحفظ کی بحث چل نکلی۔ ایک فریق ہندوستان کے سوتی کپڑے کی درآمد کے حق میں تھا۔ اور دوسرا فریق اس کی درآمد پر پابندی لگانے کا حامی تھا۔

۱۶۸۸ء کے انقلاب نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو شاہی سرپرستی سے محروم کر دیا تھا۔ کمپنی کی مخالفت میں وگ پارٹی سب سے آگے تھی ۱۷۰۰ء کے ایکٹ نے ہندوستان کی چھینٹ کی انگلستان میں درآمد ممنوع قرار دے دی۔ اور ململ پر پندرہ فی صدی محصول لگا دیا چونکہ ہر قسم کی ململ پر یکساں محصول تھا۔ اس لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے بنگال سے اعلیٰ درجے کی ململ درآمد کرنی شروع کی۔ انگلستان میں اعلیٰ درجے کی ململ کی مانگ بڑھنے لگی۔ ۱۷۲۰ء میں ایک قانون کے ذریعہ انگلستان میں سُوتی کپڑے کا استعمال بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ۱۷۲۰ء کے ایکٹ کی منظوری سے پہلے انگلستان کے جولاہوں کی طرف سے کئی بار احتجاج ہو چکا تھا کہ ہندوستانی کپڑے کی درآمد سے ان کی صنعت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

نئی پابندی کے باوجود فیشن ایبل حلقوں میں ہندوستانی کپڑے کے لئے تڑپ باقی تھی۔ سب سے پہلے وزیروں کی بیویوں نے قانون توڑا۔ ناجائز ذریعوں سے ہندوستانی کپڑا انگلستان میں فروخت ہوتا رہا۔ آخر کار حکومت نے ۱۷۷۴ء میں امتناع کے اس قانون کو منسوخ قرار دے دیا۔ اسی اثنا میں انگلستان میں چھینٹ بنانے کی بہت سی فیکٹریاں جاری ہو چکی تھیں ✦

ہم آزاد ہیں اسلئے ہمارا فن آزاد ہے

نقوش لاہور

ماہنامہ

جسے

ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی

مرتب کر رہے ہیں

آزاد فن کاروں کے زندہ و خلاق فن کا ترجمان ہے

نقوش زندگی کی ان شاہراہوں پر چلنے نکلا ہے جنہیں غیر ملکی استبداد نے ہم پر صدیوں سے بند کر رکھا تھا۔
نقوش خواجہ و مزدور کے ہولناک تفاوت کے رازوں کو فنی تقاضوں کا احترام کرتے ہوئے طشت از بام کرے گا۔
نقوش مذہب، حکومت اور سماج کے چہروں پر سے رسم و رواج کے پردے اٹھائے گا۔
نقوش ان شاعروں کی نمائندگی کرے گا جو آفاق میں پرواز کرتے ہوئے مادی گیتی کو فراموش نہیں کرتے۔
نقوش ان افسانہ نگاروں کے شاہکاروں سے مزین ہوگا جو ذاتی تجربہ کو کائناتی اہمیت بخش سکتے ہیں۔
نقوش ان نقادوں کے مقالات سے آراستہ ہوگا جو تقلید کی بجائے علمی تبحر اور خلوص کار کی کسوٹی سے کام لیتے ہیں۔
نقوش نام کی اہمیت کی بجائے کام کی افادیت کو معیار انتخاب ٹھیرائے گا۔
نقوش اردو ادب پر سے ہنگامی جذبات کی گھٹا کو ہٹا کر ایک دوامی آفتاب کو طلوع کرے گا۔
نقوش کے مندرجات کا محور وہ عوام ہونگے جن کے خون اور پسینہ سے تہذیب و تمدن کے نئے غازے تیار ہوتے ہیں
نقوش میں وہ فن پارے شائع ہوں گے جن کا ہمارے مستقبل کو آجتک انتظار رہا ہے۔
نقوش کی لکھائی چھپائی اور صوری آراستگی اردو صحافت میں ایک نیا معیار قائم کرے گی۔
نقوش اردو کے بہترین ماہناموں میں ایک گراں بہا اضافہ بن کر آسمان ادب پر جلوہ گر ہوا ہے۔

سالانہ چندہ دس روپے قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

اپنے شہر کے نیوز ایجنٹوں، بک سیلروں اور ریلوے بک سٹالوں سے حاصل کیجئے۔ یا براہ راست ہمیں لکھیے

ادارۂ فروغ اردو، ایبک روڈ لاہور

مجھے یہ معلوم کر کے انتہائی مسرت ہوئی ہے کہ چند ہی دنوں میں

الناشر لمیٹڈ

اُردو علم و ادب کو عروسِ ناشنیدہ سے ہمکنار کرنے اور فن کاروں کے خاکوں میں حریت کے رنگ بھرنے کے لئے آزاد پاکستان میں آفاقی پناہ، خلاق اور عظیم ادب کی جلوہ گاہ بن کر اُبھرنے والا ہے متعدد کامیاب تجربہ کار اور مخلص ناشرین انفرادی کاروبار کی پیچیدگیوں پر حدبندیوں کو خیرباد کہہ کر اجتماعی اقدام پر آمادہ ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنا مالی و کتابی سرمایہ الناشر لمیٹڈ کے لئے وقف کر کے پاکستان میں علم و ادب کی کماحقہٗ نمائندگی کی خاطر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

الناشر لمیٹڈ

میرے خیال میں پاکستان کی پہلی کمپنی ہے جو علم و ادب کے کارناموں پر سے محکومی کا غبار اڑانے نکلی ہے اور ایسے ادب کی بھرپور اشاعت پر کمربستہ ہے جو سماوی سے زیادہ ارضی ہوگا جس میں آسمان کی گردشوں کی بجائے زمین اور اُس کی رعنائیوں کی نقاشی ہوگی اور جس میں ایک آزاد قوم کا دل عروج کی بلندیوں کی طرف لپکتے ہوئے بھی کمال ہم آہنگی اور ہموار رفتار سے دھڑکے گا۔

الناشر لمیٹڈ

کے مدنظر علم و ادب کی صرف چند مقبول اصناف کی اشاعت نہیں بلکہ معلوم ہوا ہے کہ اس کمپنی کا پروگرام علم کے ہر شعبہ اور ادب کے ہر پہلو پر حاوی ہوگا اور مابہ الامتیاز خوبی یہ ہوگی۔ کہ معیار کی بلندی و شگفتگی نیز انتخاب کی سختی اور سلیقہ کو اولین اہمیت دی جائے گی۔ علاوہ ازیں۔

الناشر لمیٹڈ

نے ماہرین تعلیم اور علمائے دین کے مشوروں سے پاکستان کے مدارس کے لئے حکومت کے مجوزہ نصاب تعلیم کے مطابق ایسی درسی کتابیں پیش کرنے کا پروگرام بھی وضع کر لیا ہے جو ہماری نسلوں کے اخلاقی سدھار اور قومی خصوصیات کے نکھار کا فرض ادا کریں گی اور جن پر اپنی گراں بہا آزادی کو قیامت تک برقرار رکھنے، زندہ رہنے اور زندہ رہنے دینے کی روح رچی ہوئی ہوگی۔ اس لحاظ سے یہ کمپنی وہ فرض ادا کرنے نکلی ہے جس کے لئے قوموں، ملتوں، اور ملکوں کو قرنوں تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔

الناشر لمیٹڈ کے بارے میں جملہ تفصیلات جناب علاؤالدین صاحب خالد مالک حالی پبلشنگ ہاؤس کنیت روڈ لاہور سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

میری دعا ہے کہ خدا اس علمی و ادبی مہم کو عنقریب ایک قومی کارنامہ بنا دے۔

شوکت تھانوی

عوام میں سیاسی بیداری اور شعورِ ملی پیدا کرنے کی جدوجہد

وقت کا بہترین شاہکار

آزاد قوم کی تعمیر

اور پاکستان

از ڈاکٹر ناموس

حکومت کے کاروبار کی تشکیل میں جتنے افراد عملی طور پر حصہ لیتے ہیں انہیں لازمی طور پر تعلیمیافتہ سمجھدار اور عمومی کاروبار میں ماہر ہونے کی تربیت حاصل ہونی چاہیئے' کوئی جماعت اپنی آزاد حکومت قائم نہیں کر سکتی بلکہ کامیاب نہیں ہو سکتی جبتک اسکے افراد سیاسی پیچیدگیوں کو سلجھانے اور حالات کو پوری اہمیت دینے کی قابلیت نہ رکھتے ہوں یا انہوں نے عملی تجربے سے اپنے قومی فیصلوں اور حاصل شدہ نتائج کو صدق دل سے قبول کرنے کا سبق نہ سیکھا ہو۔

یہ اوصاف صرف قومی تربیت سے ہی حاصل کئے جا سکتے ہیں' جہاں یہ خصائل مفقود ہوں وہاں قومی حکومت کا قیام یا تو بد امنی پیدا کرے گا یا ایسے ناعاقبت اندیش اور کم فہم افراد برسرِ اقتدار آجائیں گے جو ووٹروں کی جہالت اور سیاسی ناواقفیت سے فائدہ اُٹھائیں گے۔

انہیں مقاصد کے پیشِ نظر یہ کتاب شائع کی گئی ہے۔ بڑا سائز ۴۰۵ صفحات متعدد نقشہ جات و اشکال کاغذ طباعت و کتابت عمدہ۔ جلد مضبوط اور جاذبِ نظر، تین رنگ کا گردپوش۔ قیمت پانچ روپے ۵ر

فرمائش جلد بھجوایئے۔ ورنہ قلتِ کاغذ و دقتِ طباعت کے اس دور میں دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا

ہماری دوسری کتابیں

صحیفہ ٹیپو سلطان دو حصص
محمود بنگلوری ہے/

تاریخ سلطنتِ خداداد
محمود بنگلوری ۶ ہے ۱۲ ر

تاریخ جنوبی ہند
محمود بنگلوری صر/

نگارستان:۔ دوسرا کلام
ظفر علی خاں للعہ/

چمنستان۔ تیسرا کلام
ظفر علی خاں ۵ صر/

جمال الدین افغانی
میرزا ادیب عہ/

شمع ناولٹ،
عابد علی عابد سعہ/

ممی خانہ
حجاب امتیاز علی عہ ۱۲ ر

شاخسار
عاشق بٹالوی عہ/

نظارے
کرشن چندر عاہ/

تاجرانِ کتب کو خاص رعایت
مفصل فہرست طلب کیجئے:۔

پبلشرز یونائیٹڈ (بک ڈپو) چوک انارکلی۔ لاہور

دِل

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

(ناول)

ایک عورت کے دل کی داستان

وہ عورت جو عشق کی آگ میں جلتی رہی لیکن جس کی زبان پر محبت کا لفظ کبھی نہیں آیا

ایک مرد کے دل کی داستان

وہ مرد جو عشق کی چنگاریوں سے تڑپتا رہا لیکن اظہارِ محبت کبھی نہ کرسکا۔

وہ عورت جو خوددار تھی ——— وہ مرد جو وفادار تھا۔

لیکن

صلہ کی تمنا اور ستائش کی پروا سے بے نیاز

یہ ناول رئیس احمد جعفری

کا

تازہ شاہکار ہے جو اپنی افسانوی معنوی اور ادبی خوبیوں کی وجہ سے اردو لٹریچر میں ہمیشہ زندہ رہیگا

ضخامت ۶۰۰ صفحات سے زیادہ قیمت مجلد چھ روپے

ملنے کا پتہ

کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

ہماری دوسری کتابیں

صبر و سلطانہ (دو حصے) عبادیہ

ہمارا قائد زیڈ اے سلہری

گورکی کے افسانے سعادت حسن منٹو

مقالات شیرانی حافظ محمود شیرانی

رحمۃ اللعالمین کامل ہر سہ جلد سلیمان منصورپوری

قرآنی اخلاق مجلد ناظم

کارل مارکس (زندگی اور تعلیمات) شیر جنگ

سکھ عہد اسلامی میں عباد اللہ

کمال اتاترک توفیق مصری

حسین ابن علی نکہت شاہجہانپوری

تذکرۂ حسینی صاحبزادہ قادری

شیشہ و سنگ (افسانے)

اتفاقات (افسانے)

آنسو (افسانے)

انجام حیات از آل قطبی

اردو زبان اور سندھ ناظم سیوہاروی

تاریخ انقلاب روس شیر جنگ

فہرست

مفت طلب فرمایئے